اِقبال کا ذہنی و فکری اِرتقا

[سرگذشتِ اقبال]

تالیف

پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار

مطبوعات بسلسلۂ گولڈن جوبلی

بزمِ اقبال

۲۔ کلب روڈ، لاہور

اِقبال کا ذہنی و فکری اِرتقا

[سرگذشتِ اقبال]

تالیف

پروفیسر ڈاکٹر غلام حُسین ذوالفقار

مطبوعات بسلسلۂ گولڈن جوبلی

بزمِ اقبال

۲۔ کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

ناشر : پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار
اعزازی سیکرٹری
بزم اقبال ۲ کلب روڈ، لاہور

کمپوزنگ : پرل کمپوزنگ سنٹر، پینوراما لاہور

مطبع : حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز لاہور

اشاعت اول : (مطبوعات بسلسلہ گولڈن جوبلی) اکتوبر ۱۹۹۸ء

صفحات : ۲۴۸

تعداد اشاعت : ایک ہزار

قیمت : ۱۵۰ روپے

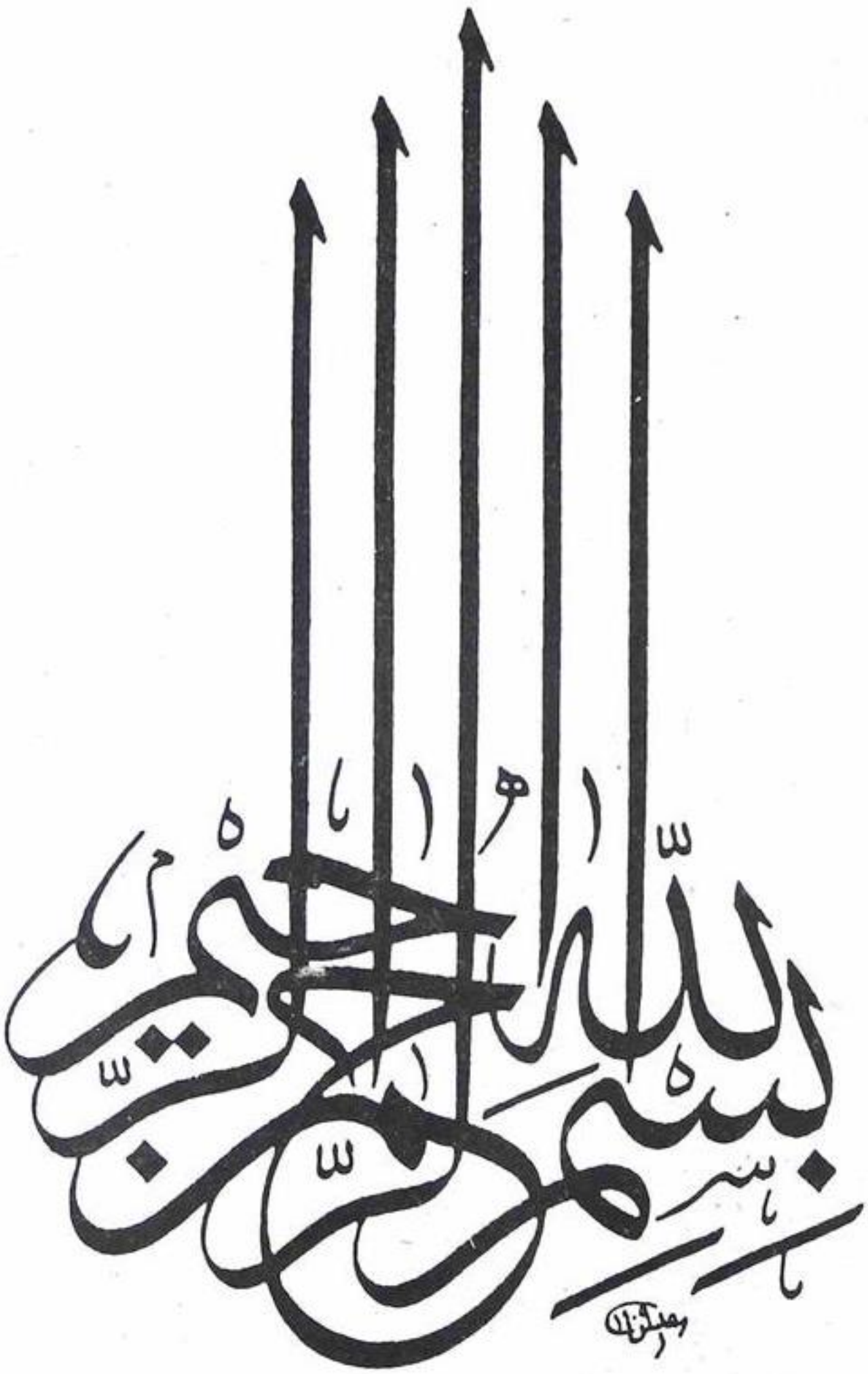

اپنی ملّت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

(اقبالؒ)

ڈاکٹر سر محمد اقبال پنجاب یونیورسٹی گولڈن جوبلی، خصوصی کانووکیشن کے موقع پر
۴ دسمبر ۱۹۳۳ء (پس منظر یونیورسٹی ہال)

مَیں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سُراغ
میری تمام سرگذشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

(اقبالؒ)

مندرجات

			صفحہ
۱-	پیش لفظ		۹، ۱۰
۲-	ابتدائی زندگی، سیالکوٹ میں	(۱۸۷۳ء - ۱۸۹۵ء)	۱۱- ۱۳
۳-	طالب علم، گورنمنٹ کالج لاہور	(۱۸۹۵ء - ۱۸۹۹ء)	۱۳- ۱۵
۴-	میکلوڈ عربک ریڈر، جامعہ پنجاب	(۱۸۹۹ء - ۱۹۰۳)	۱۵ - ۲۰
۵-	اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور	(۱۹۰۳ء- ۱۹۰۵ء)	۲۰- ۲۲
۶-	اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کا سفر و حضر	(۱۹۰۵ء - ۱۹۰۸ء)	۲۳- ۳۴
۷-	لاہور میں... اگست ۱۹۰۸ء تا دسمبر	۱۹۰۹ء	۳۴- ۴۳
۸-	〃	۱۹۱۰ء	۴۳ - ۵۴
۹-	〃	۱۹۱۱ء	۵۴- ۵۸
۱۰-	〃	۱۹۱۲ء	۵۸- ۶۴
۱۱-	〃	۱۹۱۳ء	۶۴ - ۶۴
۱۲-	〃	۱۹۱۴ء	۶۴ - ۶۸
۱۳-	〃	۱۹۱۵ء	۶۸ - ۷۲
۱۴-	〃	۱۹۱۶ء	۷۲ -۷۹
۱۵-	〃	۱۹۱۷ء	۷۹ - ۸۴
۱۶-	〃	۱۹۱۸ء	۸۴ - ۸۶
۱۷-	〃	۱۹۱۹ء	۸۷ - ۹۱
۱۸-	〃	۱۹۲۰ء	۹۱ - ۹۷
۱۹-	〃	۱۹۲۱ء	۹۷ - ۱۰۶
۲۰-	〃	۱۹۲۲ء	۱۰۶ - ۱۰۸

۲۱- لاہور میں	۱۹۲۳ء	۱۰۸ – ۱۱۶
۲۲- "	۱۹۲۴ء	۱۱۶ – ۱۱۸
۲۳- "	۱۹۲۵ء	۱۱۸ – ۱۲۱
۲۴- "	۱۹۲۶ء	۱۲۱ – ۱۲۵
۲۵- "	۱۹۲۷ء	۱۲۵ – ۱۳۱
۲۶- "	۱۹۲۸ء	۱۳۲ – ۱۳۴
۲۷- "	۱۹۲۹ء	۱۳۴ – ۱۳۷
۲۸- "	۱۹۳۰ء (خطبہ الہ آباد)	۱۳۷ – ۱۵۷
۲۹- "	۱۹۳۱ء	۱۵۷ – ۱۶۷
۳۰- "	۱۹۳۲ء (خطبہ لاہور)	۱۶۷ – ۱۸۰
۳۱- "	۱۹۳۳ء	۱۸۱ – ۱۹۰
۳۲- "	۱۹۳۴ء	۱۹۰ – ۱۹۶
۳۳- "	۱۹۳۵ء	۱۹۶ – ۲۰۴
۳۴- "	۱۹۳۶ء	۲۰۴ – ۲۱۲
۳۵- "	۱۹۳۷ء مکاتیب اقبال بنام قائداعظم	۲۱۲ – ۲۳۳
۳۶- "	۱۹۳۸ء	۲۳۳ – ۲۳۹

پیش لفظ

"اقبال کا ذہنی و فکری ارتقا" طبع ثانی ترمیم و اضافہ شدہ صورت میں قارئین کرام کی خدمت میں تیسری بین الاقوامی اقبال کانگرس کے موقع پر "بزم اقبال" کی طرف سے پیش کی جا رہی ہے۔

"اقبال کا ذہنی ارتقا" ۱۹۷۷ء - ۱۹۷۸ء میں پہلی بین الاقوامی اقبال کانگرس کے موقع پر مکتبہ خیابان ادب لاہور کی طرف سے ہدیہ قارئین کی گئی تھی۔ راقم کی اس پیش کش کو قارئین کرام نے پسند فرمایا تھا' اور یہ کتاب پاکستان کی بعض یونیورسٹیوں میں پوسٹ گریجوایٹ سطح پر شامل نصاب بھی رہی' اور اب ایک عرصے سے یہ کتاب نایاب تھی۔ اکثر احباب نے اس کی نایابی کا تذکرہ کیا۔ مجھے بھی اس کی طباعت ثانی کی فکر دامن گیر تھی' مگر نئی معلومات کی روشنی میں مَیں اس میں ترمیم و اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی اثناء میں ترکی کے زمانہ قیام میں وہاں کے بعض احباب کا تقاضا ہوا کہ مطالعہ اقبال کے اس اہم مآخذ کو مَیں اگر انگریزی کا جامہ پہنا دوں تو یہ اُن لوگوں کے لیے مفید ہو گا جو براہ راست اردو سے استفادہ نہیں کر سکتے' اور پھر اس کا ترکی اور عربی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو سکتا ہے۔ تجویز معقول تھی' اور مَیں نے اس پر صاد کرتے ہوئے گذشتہ چند برسوں میں طبع اول میں ترمیم و اضافہ کرتے ہوئے اس تالیف کو انگریزی زبان میں بعنوان:

Development of Iqbal's Mind And Thought

طباعت کے لیے تیار کر دیا (یہ کتاب بزم اقبال نے اپریل ۱۹۹۸ء میں شائع کر دی ہے۔) انگریزی تالیف کے پیش لفظ میں مَیں نے وعدہ کیا تھا کہ توفیق الٰہی سے اردو کا دوسرا اڈیشن بھی جلد ہی پیش کر دیا جائے گا جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مزید اضافوں کے ساتھ اب قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے' اور اس کے عنوان میں بھی تھوڑی سی تبدیلی کر دی گئی ہے اور اس کا ذیلی عنوان "سرگذشتِ اقبال" قرار

پایا ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ خود بھی اپنے ذہنی و فکری ارتقا کی سرگذشت قلم بند کرنے کی تمنّا رکھتے تھے، جس کی تفصیل راقم نے اس تالیف کی طباعت اوّل (اردو اور انگریزی دونوں کتابوں) کے دیباچے میں رقم کی ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ کی یہی خواہش ۱۹۷۷ء میں اس تالیف کی محرک اوّل بنی تھی۔ اقبال اپنی اس خواہش کو اپنی عدیم الفرصتی کے باعث پورا نہ کر سکے، تاہم وہ اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کے لیے اسے ضروری سمجھتے تھے۔ راقم نے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ فیصلہ تو قارئین ہی اس تالیف کے مطالعے کے بعد کر سکتے ہیں کہ اس میں مجھے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ مَیں صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ حضرت علّامہ کی ذہنی سرگذشت کو انہی کے الفاظ میں مرتب کرنے اور اس کو زیادہ تر اقبال کے نثری بیانات، مکتوبات اور خطبات کے حوالے سے بیانیہ انداز دینے کی حتی الامکان سعی کی گئی ہے اور اس مقصد کی خاطر جس قدر بنیادی مآخذ تک مجھے رسائی ہو سکی انہیں کھنگال ڈالا ہے۔ کتاب کے آخر میں کچھ مآخذ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ کتاب کے اندر حوالے دینے کی کم سے کم کوشش کی گئی ہے۔ کیونکہ کتاب کے بیانیہ اُسلوب کے لئے یہی صورت مناسب نظر آئی۔ امید ہے قارئین اس تالیف کو حیاتِ اقبال کے ایک مختصر لیکن مستند اور دلچسپ مآخذ کے طور پر قبول فرمائیں گے۔

(پروفیسر، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار)

لاہور

۲۷ اکتوبر ۱۹۹۸ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائی زندگی، سیالکوٹ میں

(۱۸۷۳ء -- ۱۸۹۵ء)

اقبال کی ابتدائی زندگی کے بارے میں مستند اور تفصیلی معلومات محدود ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تاریخ پیدائش بھی صحیح طور پر متعین نہیں کی جاسکی اور تاحال متنازع فیہ ہے۔ ان کی حیات کے دوران بعض مصنفین نے (جن میں ان کا قریبی دوست محمد دین فوق بھی شامل ہے) ان کی مختلف تاریخ ہائے پیدائش دی ہیں اور اقبال نے کسی پر اعتراض نہیں کیا۔ ان کی وفات کے بعد عبدالمجید سالک نے سیالکوٹ میونسپلٹی کے ریکارڈ کا جائزہ لے کر اقبال کی تاریخ ولادت ۲۲ فروری ۱۸۷۳ء دی ہے۔ (ذکر اقبال) چیک سکالر ژان ماریک اپنے آرٹیکل "محمد اقبال کی تاریخ پیدائش" (آرکائیوز اور یلٹلنی ۱۹۵۸ء میں) اقبال کی خود نوشت تحریروں کا جائزہ لے کر اس نتیجے پر پہنچے کہ ۹ نومبر ۱۸۷۷ء ان کی صحیح تاریخ پیدائش ہے۔ فقیر سید وحید الدین اور سید عبدالواحد نے ژان ماریک کی فراہم کردہ رہنمائی کی پیروی کی۔ خالد نظیر صوفی، اقبال کے ایک نزدیکی رشتے دار نے سیالکوٹ میونسپل کمیٹی کے رجسٹر پیدائش کے حوالے سے، اور کچھ خاندانی شہادتوں کی تائید سے اقبال کی تاریخ پیدائش ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء دی ہے۔ اس متنازع مسئلے پر اقبال کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر خاصی بحث ہوئی اور حکومت پاکستان نے اپنی سہولت اور مصلحت کے تحت ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کی تاریخ پیدائش کو قبول کر لیا اور

سرکاری طور پر اقبال کی اس تاریخ پیدائش کا اعلان کر دیا گیا (یہ امر قابل ذکر ہے کہ بزم اقبال نے اقبال کی تاریخ ولادت ۲۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے مطابق صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں کچھ مطبوعات بھی ۱۹۷۳ء میں شائع کر دی تھیں۔)

اقبال نے اپنی ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں کچھ اور معلومات بھی اپنے پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں دی ہیں اور یہ معلومات متذکرہ بالا مباحث میں از حد قابل غور ہیں۔ وہ اپنے خود نوشت بیان میں لکھتے ہیں:

(ترجمہ) "مَیں ۳ ذی قعد ۱۲۹۴ ہجری (۱۸۷۶ء) کو سیالکوٹ، پنجاب (انڈیا) میں پیدا ہوا۔ میری تعلیم عربی اور فارسی کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ چند سال بعد مَیں ایک مقامی اسکول میں داخل ہوا، اور اپنا یونیورسٹی کیریئر ۱۸۹۱ء میں پنجاب یونیورسٹی کے پہلے پبلک امتحان کو پاس کر کے شروع کیا۔ ۱۸۹۳ء میں مَیں نے میٹریکولیشن کا امتحان پاس کیا اور سکاچ مشن کالج سیالکوٹ میں داخلہ لیا، جہاں مَیں نے دو سال تعلیم حاصل کی اور ۱۸۹۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کا انٹرمیڈیٹ امتحان پاس کیا۔"

اقبال کی ابتدائی تعلیم قرآن مجید کے مطالعے سے شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ساتھ چند عربی اور فارسی کی کتب مکتب (مسجد سے ملحق مدرسے) میں پڑھیں۔ یہ مکتب مولوی غلام حسین (شوالا والی مسجد) اور مسجد حسام الدین (محلہ کشمیریاں، سیالکوٹ) میں قائم تھے۔ روایتی طور پر ابتدائی تعلیم کا آغاز "رسم بسم اللہ" سے ہوتا ہے اور یہ رسم بالعموم چار اور پانچ سال کی عمر کے دوران (چار سال، چار ماہ اور چار دن) منائی جاتی ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اقبال کتنا عرصہ مکتب میں تحصیل علم کرتے رہے۔ ان کے اپنے بیان کے مطابق اقبال چند سال بعد ایک مقامی اسکول (سکاچ مشن) میں داخل کیے گئے۔ یہ چند سال کم از کم تین برس ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک یا دو سال کو "چند سال" نہیں کہا جاتا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اقبال نے مقامی اسکول میں داخلہ آٹھ یا نو سال کی عمر میں لیا۔ یہ امر نظیر صوفی کے موقف کو قرین حقیقت ثابت کرتا ہے۔

۱۸۹۱ء میں اقبال نے پہلا پبلک امتحان (اپر مڈل) پاس کیا جو اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام ہوتا تھا۔ ۱۸۹۳ء میں اقبال نے گجرات سنٹر سے

میٹریکولیشن کا امتحان دیا اور انٹرینس کا یہ امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کرکے وہ سکاچ مشن انٹرمیڈیٹ کالج سیالکوٹ میں داخل ہوئے (سیالکوٹ میں انٹرمیڈیٹ کلاسوں کا آغاز ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا۔) اقبال نے ایف۔ اے کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے ۱۸۹۵ء میں پاس کیا۔ ان تمام امتحانات میں انہوں نے میرٹ کی بنا پر وظائف حاصل کیے۔

ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالج کی تعلیم کے دوران اقبال اپنے عربی و فارسی کے استاد مولوی سید میر حسن سے بہت فیض یاب ہوئے۔ اقبال نے وسطانی (مڈل) جماعتوں میں فارسی پڑھی اور میٹرک اور انٹرمیڈیٹ میں عربی ان کا انتخابی مضمون تھا۔ سید میر حسن متدیّن مسلمان، اور اپنے وقتوں میں عربی اور فارسی کے نامور استاد تھے۔ انہوں نے اپنے نوجوان شاگرد میں اسلامی ثقافت سے پُرخلوص وابستگی اور مسلم ادبیات کا والہانہ شوق پیدا کیا۔ اقبال نے اسکول کے عرصۂ تعلیم میں اردو میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ وہ سیالکوٹ کے مقامی مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگے۔ انہوں نے اپنی کچھ غزلیں بھی داغ دہلوی، اس عہد کے مشہور شاعر، کی خدمت میں ارسال کیں۔ اقبال کی کچھ غزلیں دہلی کے ادبی رسالے "گلدستۂ زبان" میں شائع ہوئیں۔ یہ ان کے عنفوان شباب کا بھی، اور آغاز شعر و سخن کا بھی زمانہ تھا۔

اقبال کی پہلی شادی ۱۸۹۳ء میں ہوئی جبکہ وہ بیس سال کے تھے۔ ان کی پہلی بیوی جو عمر میں ان سے بڑی تھی، گجرات کے ایک معزز خاندان سے تھیں۔ اس بیوی کے بطن سے اقبال کی ایک دختر (معراج بی بی) تھی جو ابتدائی عمر میں فوت ہوگئی، اور ایک فرزند آفتاب اقبال تھا (بار ایٹ لاء جو ۱۹۹۰ء میں فوت ہوا)۔

طالب علم، گورنمنٹ کالج لاہور

(۱۸۹۵ء -- ۱۸۹۹ء)

سیالکوٹ میں اعلیٰ ثانوی تعلیم کی تکمیل کرکے اقبال لاہور آگئے اور گریجوایشن کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ چند ہفتے تک وہ شیخ گلاب دین کے مکان اندرون بھاٹی دروازہ میں مقیم رہے اور بعد میں کواڈرینگل ہاسٹل گورنمنٹ کالج میں

منتقل ہوگئے۔ وہ اس ہاسٹل کے کیوبکل میں اپنے عرصہ طالب علمی کے اختتام تک مقیم رہے۔ بی۔ اے میں اقبال کے مضامین انگریزی، عربی اور فلسفہ تھے۔ ان ایام میں گورنمنٹ کالج کی عربی کی کلاسیں اورینٹل کالج میں پڑھائی جاتی تھیں اور یہ کالج بھی گورنمنٹ کالج کی عمارت میں اقامت گزیں تھا۔ مولوی محمد دین ایم۔ او۔ ایل عربی کلاسوں کے استاد تھے۔ اقبال نے یہ امتحان سیکنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ عربی میں وہ اول آئے۔ بی۔ اے کے بعد اقبال نے ایم۔ اے فلسفہ کی کلاس میں داخلہ لیا۔ اس وقت وہ پروفیسر تھامس آرنلڈ کے زیر اثر آئے جو ۱۱ فروری ۱۸۹۸ء کو گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور پروفیسر فلسفہ تشریف لائے۔ اقبال پروفیسر آرنلڈ سے ازحد متاثر ہوئے۔ اسی دوران اقبال نے لاء کورس کے لیکچروں کی بھی تکمیل کی۔ مارچ ۱۸۹۹ء میں ایم اے فلسفہ کا امتحان دیا اور وہ تیسرے درجے میں کامیاب ہوئے۔ وہ اس مضمون میں کامیاب ہونے والے واحد امیدوار تھے، لہٰذا وہ یونیورسٹی میں اول قرار دیے گئے۔

طالب علمی کے اس رسمی کیریئر کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اقبال نے اس عرصے کے دوران بعض نظمیں اور غزلیں تخلیق کیں۔ ۱۸۹۶ء میں انہوں نے انجمن کشمیری مسلمانان کے ایک جلسے میں اپنی نظم "فلاح قوم" پڑھی۔ اندرون بھاٹی دروازہ کے ایک مشاعرے میں اقبال نے ایک غزل پڑھی جس کے اس شعر پر اس دور کے مشہور شاعر مرزا ارشد گورگانی نے پُرزور داد دی:

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

کالج کے ایک ساتھی میر غلام بھیک نیرنگ، جو خود بھی شاعر تھے، ان ایام کی ادبی سرگرمیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہماری ان سہ سالہ صحبتوں میں اقبال اپنی ایک سکیم بار بار پیش کیا کرتے تھے۔ ملٹن کی مشہور نظم Paradise Lost اور Paradise Regained کا ذکر کرکے کہا کرتے تھے کہ واقعات کربلا کو ایسے رنگ میں نظم کروں گا کہ ملٹن کی Paradise Regained کا جواب ہو جائے۔ مگر اس تجویز کی تکمیل کبھی نہیں ہو سکی۔ مَیں اتنا اور کہہ دوں کہ اردو شاعری کی اصلاح و ترقی کا اور اس میں مغربی شاعری کا رنگ پیدا

کرنے کا ذکر بار بار آیا کرتا تھا۔"

۲۸ فروری ۱۸۹۹ء کو اقبال نے اپنے ہاسٹل کی اقامت گاہ سے احسن مارہروی کو ایک خط میں یہ لکھا:

"اگر آپ کے پاس استاذی حضرت مرزا داغ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا۔ مَیں نے تمام دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کیے ہیں... غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہو گا... حضرت امیر مینائی کے فوٹو کی بھی ضرورت ہے۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں شاعری کے لیے کتنا جوش و جذبہ تھا اور وہ دنیا بھر کے بڑے بڑے شعراء کی تصاویر جمع کر کے اپنے اس جذبے کی تسکین کر رہے تھے (کیا معلوم تھا کہ ایک دن اُن کا شمار بھی دنیا کے چند بڑے شعراء میں ہو گا!)

میکلوڈ عربک ریڈر، جامعہ پنجاب

(۱۸۹۹ء -- ۱۹۰۳ء)

ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد اقبال کا تقرر بحیثیت میکلوڈ عربک ریڈر پنجاب یونیورسٹی میں ۱۳ مئی ۱۸۹۹ء کو ہوگیا (سلیکشن کمیٹی نے ان کے انتخاب کی سفارش ۵ مئی ۱۸۹۹ء کو کی اور سنڈیکیٹ نے اس کی توثیق ۲۳ جون ۱۸۹۹ء کو کر دی) سلیکشن کمیٹی کا فیصلہ یہ تھا:

"مختلف امیدواروں کے دعاوی کے محتاط جائزے اور ریڈرز کے حقیقی کام کی نوعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے متفقہ طور پر سنڈیکیٹ سے سفارش کا فیصلہ کیا گیا کہ شیخ محمد اقبال بی۔ اے کو جنہوں نے اس سال ایم۔ اے فلسفہ کا امتحان پاس کیا ہے، اور جو بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ دونوں امتحانات میں عربی میں اول آئے، میکلوڈ پنجاب عربک ریڈر کی اسامی پر مقرر کیا جائے۔"

عملی زندگی کے آغاز میں ریسرچ فیلو یا سکالر کی حیثیت سے یہ ایک عارضی

منصب تھا جس کی میعاد دو سال تھی اور اس میں مزید دو سال کی توسیع کی گنجائش بھی تھی۔ اس منصبدار کے سہ گونہ فرائض یہ تھے:

۱۔ اورینٹل کالج میں تدریسی فرائض انجام دینا۔

۲۔ بعض علمی موضوعات پر کتب تالیف یا ترجمہ کرنا۔

۳۔ عربی مطبوعات کا اہتمام کرنا۔

میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے اقبال بی او ایل اور انٹرمیڈیٹ کلاسوں کو تاریخ، پولیٹیکل اکانومی، سائیکالوجی اور منطق استخراجی پڑھاتے تھے۔ اس عرصے میں ان کے تالیف و ترجمے کی کارکردگی یہ رہی:

۱۔ توحید مطلق کا نظریہ، از عبدالکرم الجیلی۔ یہ اقبال کا پہلا ریسرچ پیپر انگریزی میں تھا جو "انڈین اینٹی کویری" بمبئی میں ستمبر ۱۹۰۰ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں اقبال نے الجیلی کے "انسان کامل" کے نظریے پر بھی بحث کی ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کے ذہنی ارتقا میں اس مقالے کی خاص اہمیت ہے۔ بیس سال بعد اقبال ڈاکٹر نکلسن کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں: "..... نہ ہی وہ (تبصرہ نگار) صحیح طور پر میرے نظریۂ انسان کامل کو سمجھا ہے جسے اس نے جرمن مفکر نطشے سے خلط ملط کر دیا ہے۔ مَیں نے صوفیا کے نظریۂ انسان کامل کے بارے میں بیس سال سے زائد عرصہ پہلے لکھا تھا جس وقت میں نے نطشے کے بارے میں نہ کچھ پڑھا تھا، نہ سنا تھا۔ یہ مضمون اس وقت Indian Antiquary میں شائع ہوا تھا، اور بعد میں میری تالیف، طبع ۱۹۰۸ء Persian metaphysics کا حصہ بنا۔"

۲۔ Stubbs کی کتاب Early Plantagenets کا اردو ترجمہ مع حواشی۔

۳۔ واکر کی تصنیف Political Economy کا مع حواشی اردو ترجمہ۔

۴۔ Ladd کی تصنیف Priemer of Psychology کے اردو ترجمے پر نظرثانی۔

۵۔ علم الاقتصاد (Political Economy) پر ۱۹۰۳ء میں ایک اردو کتاب تالیف کی جو ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ اقبال کی پہلی تصنیف تھی۔ اس کتاب کا ایک باب "آبادی پر" ماہنامہ "مخزن" شمارہ اپریل ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ شیخ عبدالقادر نے

اداریئے میں یہ تبصرہ کیا:

"شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔اے نے حال ہی میں ایک کتاب پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کے ایما پر علم الاقتصاد پر لکھی ہے جس کا انگریزی نام "پولیٹیکل اکانومی" ہے اور جسے عملاً "علم سیاست مدن" کہتے ہیں۔ بلامبالغہ اس فن میں ایسی جامع اور عام فہم کتاب اردو زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ ہندوستان میں اس علم کا ابھی بہت کم چرچا ہے۔ حالانکہ اسے بغور پڑھنے کی ہندوستان کو نہایت ہی ضرورت ہے۔ جب یہ کتاب شائع ہوگی تو ہمیں کامل امید ہے کہ شیخ صاحب کی شہرت اور اس کی ذاتی خوبی مقبولیت کو اس کے استقبال کے لیے اُڑا کر لائے گی۔"

اس دوران جو دوسرے مضامین اردو نثر میں لکھے گئے اور "مخزن" میں شائع ہوئے، مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بچوں کی تعلیم و تربیت۔ "مخزن" جنوری ۱۹۰۲ء

۲۔ اردو زبان۔ ڈاکٹر وائٹ بریخٹ کے انگریزی مضمون کا ترجمہ (ستمبر ۱۹۰۲ء)

۳۔ اردو زبان پنجاب میں (اکتوبر ۱۹۰۲ء)

میکلوڈ عربک ریڈر کے اس علمی، تصنیفی اور تدریسی کام کے علاوہ شعر و سخن کا مشغلہ بھی جاری رہا، جس میں قومی، وطنی مسائل اور مناظر فطرت سے دلچسپی نمایاں ہے۔ اس دَور کی خاص خاص نظمیں یہ ہیں:

"نالۂ یتیم" (مسدس ۳۴ بند) انجمن حمایت اسلام کے ۱۵ ویں سالانہ اجلاس میں ۲۴ فروری ۱۹۰۰ء کو ڈپٹی مولوی نذیر احمد کی صدارت میں پیش کی گئی۔ "خدا حافظ" کے عنوان سے ۲۵ مئی ۱۹۰۰ء کو ایک نظم منشی محبوب عالم کے سفر یورپ کے الوداعی جلسے منعقدہ اسلامیہ کالج میں پڑھی گئی۔ "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" (ترکیب بند، ۱۵ بند) انجمن حمایت اسلام کے سولہویں اجلاس منعقدہ ۱۹۰۱ء میں پیش کی گئی۔ "اشکِ خون" کے عنوان سے نظم (ترکیب بند، دس بند) ملکہ وکٹوریہ کے انتقال (۲۲ جنوری ۱۹۰۱ء) پر لکھی گئی اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ہوا، اور شائع ہوا۔ اسی زمانے میں "ہمالہ" تخلیق ہوئی جو "مخزن" کے پہلے شمارے (اپریل ۱۹۰۱ء) میں شائع ہوئی اور برِصغیر کے ادبی حلقوں

میں اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا۔ "مخزن" میں شائع ہونے والی چند دیگر نظموں کی تفصیل یہ ہے:

"مرزا غالب" (ستمبر ۱۹۰۱ء) "ابر کوہسار" (نومبر ۱۹۰۱ء) "آفتاب" (۱۹۰۲ء) "خفتگان خاک سے استفسار" (فروری ۱۹۰۲ء) "شمع" (دسمبر ۱۹۰۲ء) "ایک آرزو" (دسمبر ۱۹۰۲ء) انجمن حمایت اسلام کے ۱۷ ویں سالانہ اجلاس فروری ۱۹۰۲ء میں اقبال نے تین نظمیں خیر مقدم، دین و دنیا، اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے، پیش کیں۔ انجمن حمایت اسلام کے ۱۸ ویں سالانہ اجلاس (منعقدہ یکم مارچ ۱۹۰۳ء) میں "فریادِ امت" (یا ابر گوہربار۔ ترکیب بند نظم) پڑھی۔

میکلوڈ عربک ریڈر شپ عارضی منصب تھا جس کا مالی فائدہ بھی کم تھا۔ قدرتی طور پر اقبال اس سے مطمئن نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے سابقہ لیکچروں کی بنیاد پر دسمبر ۱۹۰۰ء میں پی ای ایل کے امتحان میں شریک ہونا چاہا مگر ان کی درخواست آنریبل جسٹس پی۔ سی چیٹرجی نے مسترد کر دی۔ ۱۹۰۱ء میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے مقابلے کے امتحان میں وہ شرکت کرنا چاہتے تھے مگر انہیں طبّی لحاظ سے ناموزوں قرار دیا گیا۔ بہرکیف انہیں یہ موقع مل گیا کہ وہ یونیورسٹی سے رخصت بلا تنخواہ لے کر گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر کی خدمات انجام دے سکیں۔ آخر کار مئی ۱۹۰۳ء کے آخر میں انہیں میکلوڈ عربک ریڈر کے فرائض سے چھٹکارا مل گیا اور انہوں نے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے گورنمنٹ کالج لاہور میں مستقل ملازمت حاصل کر لی۔

اس اثناء میں اقبال اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر بیرون ملک جانے کے بارے میں سوچ رہے تھے اور منصوبے بنا رہے تھے۔ ہم اس کا اندازہ ان تعزیتی مکتوب سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے مسز سٹریٹن کو ان کے شوہر کی وفات پر لکھا۔ ڈاکٹر سٹریٹن (پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) ۲۳ اگست ۱۹۰۲ء کو گلمرگ (کشمیر) میں فوت ہوئے تھے۔ اقبال اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"انہیں (ڈاکٹر سٹریٹن کو) بھول جانا ناممکن ہے۔ انہوں نے ہمارے ذہنوں پر ایسے گہرے نقوش چھوڑے ہیں جو اَن مٹ ہیں۔ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہ محض ان کی شخصیت تھی جس نے ہماری توجہ امریکی لوگوں اور ان کے اعلیٰ اور بے

لاگ کردار کی طرف موڑ دی۔ ہم ہند میں کوئی زیادہ امتیازات میں نہیں جاتے۔ وہ کینیڈین تھے، مگر ہمارے لیے وہ ایک امریکن تھے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ڈاکٹر سٹریٹن کا اثر ہے کہ یہاں کچھ لوگ امریکن یونیورسٹیوں میں جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور مَیں ان میں سے ایک ہوں۔"

ان ایام میں اقبال اندرون بھاٹی دروازہ بازار حکیماں میں رہتے تھے۔ ان کے اکثر دوست یہاں ان سے ملنے کے لیے آتے تھے۔ احباب کی محفلیں جمتی تھیں۔ یہ زندہ دل، بے تکلف دوستوں کی ایک ایسی مجلس ہوتی تھی جس کا ہم تصور ہی کرسکتے ہیں۔ اقبال اپنے ایک مکتوب محررہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء بنام منشی سراج الدین (میر منشی ریذیڈنسی کشمیر) میں اس مجلس احباب کی تصویر کشی یوں کرتے ہیں:

"برادر مکرّم، السلام علیکم۔ آپ کا خط ابھی ملا۔ الحمدللہ کہ آپ خیریت سے ہیں۔ آج عید کا دن ہے اور بارش ہو رہی ہے۔ گرامی صاحب تشریف رکھتے ہیں اور شعر و سخن کی محفل گرم ہے۔ شیخ عبدالقادر ابھی اُٹھ کر کسی کام کو گئے ہیں۔ سید بشیر حیدر بیٹھے ہیں اور ابرِ گہربار کی اصل علّت کی آمد آمد ہے۔ یہ جملہ شاید آپ کو بے معنی معلوم ہو گا۔ مگر کبھی وقت ملاقات آپ پر اس کا مفہوم واضح ہو جائے گا۔ آپ کے خط نے ایک بڑی فکر سے مجھے نجات دی۔ مجھے تین روز سے اس بات کی کاوش تھی کہ نظم کہیں سے ملے تو ارسال کروں۔ الحمدللہ کہ آپ کو مل گئی۔ آپ کی داد کا مشکور ہوں اور اس کو کبھی تصنع نہیں سمجھتا۔ آپ کو کس بات سے یہ اندیشہ پیدا ہوا؟

ترتیب اشعار کی مجھے خود فکر ہو رہی ہے۔ مگر یہ خیال ہے کہ ابھی کلام کی مقدار تھوڑی ہے۔ بہرحال جب یہ کام ہو گا تو آپ کے صلاح و مشورے کے بغیر نہ ہو گا۔ مطمئن رہیں۔ ملٹن کی تقلید میں کچھ لکھنے کا ارادہ مدت سے ہے اور اب وہ وقت قریب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ان دنوں وقت کا کوئی لحظہ خالی نہیں جاتا جس میں اس کی فکر نہ ہو۔ پانچ چھ سال سے اس آرزو کو دل میں پرورش کر رہا ہوں۔ مگر جتنی کاوش آج کل محسوس ہوتی ہے، اس قدر کبھی نہ ہوئی۔ فکر روزگار سے نجات ملتی ہے تو اِس کام کو باقاعدہ شروع کروں گا۔"

۳۱ مئی ۱۹۰۳ء کو اقبال میکلوڈ عربک ریڈر شپ کو خیرباد کہہ کر جون ۱۹۰۳ء کے

آغاز میں گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ مقرر ہو جاتے ہیں۔ مئی ۱۹۰۳ء میں کچھ دنوں کے لیے انہیں اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد (ایس۔ ڈی۔ او ملٹری ورکس) کے فوجداری مقدمے کے سلسلے میں بلوچستان بھی جانا پڑا۔ یہ ان کا بلوچستان کا پہلا سفر تھا۔

اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

(۱۹۰۳ء -- ۱۹۰۵ء)

۳ جون ۱۹۰۳ء سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں اسسٹنٹ پروفیسر فلسفہ مقرر ہوئے۔ ان کا قیام بدستور بھاٹی دروازہ کے اندر بازار حکیماں میں رہا۔ ۲۶ فروری ۱۹۰۴ء کو پروفیسر طامس آرنلڈ گورنمنٹ کالج سے سبکدوش ہو کر عازم انگلستان ہوئے۔ اقبال نے اپنے شفیق استاد کی جدائی کے موقع پر "نالۂ فراق" لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا (مخزن، مئی ۱۹۰۴ء) اس نظم میں حصول تعلیم کے لیے انگلستان جانے کی خواہش کا بھرپور اظہار ہوا ہے:

توڑ کر پہنچوں گا مَیں پنجاب کی زنجیر کو!

اسی سال مدیر مخزن شیخ عبدالقادر بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان روانہ ہوئے۔ اقبال کا شوق سفر اور تیز ہوا۔ شیخ سے اثنائے سفر کے مشاہدات کے بارے میں استفسار کیا۔ ایک مضمون کی صورت میں جواب ملا: "پیارے اقبال! آپ گذشتہ خط میں مجھ سے سمندر کی کیفیت پوچھتے ہیں، متحیر ہوں کہ کیا لکھوں.... الخ" (مخزن، اگست ۱۹۰۴ء)

تعلیمی سفر کی اس بے پایاں خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی تیاری اور زاد راہ کی فراہمی جاری رہی۔ اگلے سال اقبال کو انگلستان میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے تین سال کی رخصت خاص مل جاتی ہے اور وہ یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے (براستہ دہلی، بمبئی) انگلستان روانہ ہو جاتے ہیں۔

اس دوران میں اقبال کا ایک نثری مضمون "قومی زندگی" مخزن، اکتوبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون ایک لیکچر کی صورت میں موسم گرما کی تعطیلات میں ایبٹ آباد

کے زمانہ قیام میں وہاں دیا گیا تھا۔ یہ اقبال کا ایک اہم لیکچر یا مضمون ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کے بارے میں ان کے ابتدائی خیال کے نقوش ملتے ہیں۔

یہ زمانہ اقبال کی شعری تخلیقات کے لیے بھی خاصا اہم ہے۔ ایمرسن، لانگ فیلو، ٹینی سن، ولیم کوپر کی بعض نظموں کے تراجم کے علاوہ کئی طبع زاد نظمیں اور غزلیں بھی اسی عرصے میں کہی گئیں جن میں مناظر قدرت سے دلچسپی، حسن، عشق اور موت کے تصورات، حب الوطنی اور ہندی قومیت کا احساس قابل ذکر ہے، جس میں ہند کی مختلف اقوام کے مابین اتحاد اور رواداری خصوصاً ہندو مسلم یکجہتی کا تصور قابل ذکر ہے۔ اس رجحان میں اقبال کے شعری تخیل پر مغرب کے رومانوی اثرات غالب ہیں اور اس کے ساتھ قومی، حب الوطنی اور ملک کے معاشرتی مسائل ہیں جو شاعر کے ذہن پر چھائے ہوئے ہیں۔ اقبال کو اپنے شعری فریضے اور فنی مرتبے کا بھی شدید احساس تھا:

شاعر رنگیں نوا ہے دیدۂ بینائے قوم!

ادبی اور قومی حلقے بھی اقبال کی شعری خدمات کا اعتراف کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں ان کی ایک اہم نظم "تصویر درد" تخلیق ہوئی اور انجمن حمایت اسلام کے انیسویں سالانہ اجلاس (اپریل ۱۹۰۴ء) میں پیش کی گئی (مخزن کے شمارہ مارچ ۱۹۰۴ء میں خاص طور سے زائد صفحات لگا کر یہ نظم شائع کی گئی) دیگر قابل ذکر نظموں کی اشاعت مخزن کے ان شماروں میں ہوئی "زہد اور رندی" (دسمبر ۱۹۰۳ء) "طفل شیر خوار" (فروری ۱۹۰۴ء) "رخصت اے بزم جہاں" (مارچ ۱۹۰۴ء)" بلال" (ستمبر ۱۹۰۴ء) "ہمارا دیس" (اکتوبر ۱۹۰۴ء) "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" "نیا شوالہ" وغیرہ۔ "ہمارا دیس" یہ وہی مشہور نظم ہے جو "بانگ درا" میں "ترانۂ ہندی" کے عنوان سے صفحہ ۸۲ پر درج ہے اور اس کے یہ اشعار وطنی قومیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بُلبلیں ہیں اِس کی یہ گلستاں ہمارا

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا
ہندی ہیں ہم، وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اے آبِ رودِ گنگا وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اُترا تیرے کنارے جب کارواں ہمارا

آخری شعر ہمیں مولانا الطاف حسین حالی کی طویل نظم "شکوۂ ہند" کی یاد دلاتا ہے۔ اس نظم کے ساتھ شیخ عبدالقادر کا ایک شذرہ بھی "مخزن" میں تھا جو شیخ صاحب نے انگلستان سے نظم کے ساتھ اشاعت کے لیے لکھ بھیجا:

"جذبات دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا عجیب قانون ہے۔ ہمارے دوست نے مندرجہ ذیل اشعار میں ہُوبہو وہ خیالات ظاہر کئے ہیں جو وطن سے دُور ہونے کے سبب راقم کے دل میں ہیں۔ مَیں اگر نظم لکھتا تو شاید لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے لکھے ہیں۔"

"بانگ درا" کے پہلے حصّے کی آخری نظمیں، شائع شدہ مخزن، یہ ہیں: "داغ دہلوی" (اپریل ۱۹۰۵ء) "ایک پرندہ اور جگنو" (جولائی ۱۹۰۵ء) "بچّہ اور شمع" (ستمبر ۱۹۰۵ء) "التجائے مسافر" (اکتوبر ۱۹۰۵ء) "کنارِ راوی" (نومبر ۱۹۰۵ء)

ہندی قومیّت کے تصور کے ساتھ ساتھ دینی جذبے اور ملّی احساس کی ایک داخلی رَو بھی ہے جو اقبال کی غزل کے اندر اپنی جھلک دکھا جاتی ہے۔ یہ رَو ایک عالمی اخوّت کی ہے جس کا مرکزِ ثقل حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ یہ دو شعر اس رَو کی بخوبی نشاندہی کرتے ہیں:

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُس کا
خوشا وہ دَور کہ دیدار عام تھا اُس کا

ہَوا ہو ایسی کہ ہندوستان سے اے اقبال
اُڑا کے مجھ کو غبارِ رہِ حجاز کرے

اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ کا سفر و حضر

(۱۹۰۵ء - ۱۹۰۸ء)

اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یہ سفر، جس کے لیے اقبال از حد مشتاق تھے، اُن کی زندگی کا اہم مرحلہ تھا۔ بلکہ صحیح طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا میں یہ سفر اور زمانۂ قیام یورپ کے مشاہدات و تجربات ایک اہم موڑ ہیں جہاں سے اقبال کی فکر و نظر ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے سفر انگلستان کے سلسلے میں دو خطوط مدیر "وطن" کو لکھے جو اثنائے سفر کی دلچسپ روداد کے علاوہ ان کے ذہن و فکر کی تبدیلی کا دیباچہ کہے جاسکتے ہیں۔ ان سفری خطوط میں بعض چھوٹے چھوٹے واقعات سے اُن کے ذہنی تاثرات اور جذباتی ردِّعمل کے دلچسپ مرقعے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

اقبال یکم ستمبر ۱۹۰۵ء کو لاہور سے روانہ ہو کر ۲ ستمبر کو "اسلامی شان و شوکت کے قبرستان--- دہلی" پہنچتے ہیں۔ احباب (خواجہ حسن نظامی، میر غلام بھیک نیرنگ وغیرہ) کی معیّت میں حضرت محبوب الٰہی (خواجہ نظام الدین اولیاؒ) کے مزار اور ان کے قدموں میں مدفون دہلی کی پرانی سوسائٹی کی زیارت کی گئی۔ مختلف سفری مناظر اور ان کے تاثرات کی چند جھلکیاں دیکھتے جائیں:

"اگرچہ دہلی کے کھنڈر مسافر کے دامنِ دل کو کھینچتے ہیں، مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ہر مقام کی سیر سے عبرت اندوز ہوتا۔ شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں فاتحہ پڑھا، دارا شکوہ کے مزار کی خاموشی میں دل کے کانوں سے ھوالموجود کی آواز سُنی اور دہلی کی عبرتناک سرزمین سے ایک ایسا اخلاقی اثر لے کر رُخصت ہُوا جو صفحہ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔"

دہلی سے روانہ ہو کر ۴ ستمبر کو اقبال بمبئی پہنچے۔ ہوٹل میں قیام کیا۔ ہوٹل کا ایک دلچسپ منظر دیکھیے:

"ایک شب مَیں کھانے کے کمرے میں تھا کہ دو جنٹلمین میرے سامنے آ بیٹھے۔ شکل

سے معلوم ہوتا تھا کہ یورپین ہیں۔ فرانسیسی میں باتیں کرتے تھے۔ آخر جب کھانا کھا کر اُٹھے تو ایک نے کُرسی کے نیچے سے اپنی تُرکی ٹوپی نکال کر پہنی جس سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ یہ کوئی تُرک ہے۔ میری طبیعت بہت خوش ہوئی اور مجھے یہ فکر پیدا ہوئی کہ کسی طرح ان سے ملاقات ہو۔ دوسرے روز مَیں نے خواہ مخواہ باتیں شروع کیں۔ یورپ کی اکثر زبانیں سوائے انگریزی کے جانتا تھا۔ مَیں نے پوچھا فارسی جانتے ہو۔ بولا بہت کم۔ پھر مَیں نے فارسی میں اُس سے گفتگو شروع کی۔ لیکن وہ نہ سمجھتا تھا۔ آخر مجبوری ٹُوٹی پھُوٹی عربی میں اُس سے باتیں کیں۔"

بحری سفر کے تاثرات:

"جہاز کے سفر میں دل پر سب سے زیادہ اثر ڈالنے والی چیز سمندر کا نظارہ ہے۔ باری تعالیٰ کی قوتِ نامتناہی کا جو اثر سمندر دیکھ کر ہوتا ہے شاید ہی کسی اور چیز سے ہوتا ہو۔ حج بیت اللہ میں جو تمدنی اور رُوحانی فوائد ہیں اُن سے قطع نظر کر کے ایک بڑا اخلاقی فائدہ سمندر کی ہیبت ناک موجوں اور اس کی خوفناک وسعت کا دیکھنا ہے جس سے مغرور انسان کو اپنے ہیچ محض ہونے کا پُورا پُورا یقین ہو جاتا ہے۔ شارعِ اسلام کی ہر بات قربان ہو جانے کے قابل ہے۔ بابی انت و امی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ساحل عرب کے قریب جہاز پہنچتا ہے تو اقبال کے جذبات و احساسات اتنی بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں کہ روحانی ترفّع کے عالم میں اُن کا قلمِ شعری نثر کا متحرک تمثیلی مرقع پیش کرنے لگتا ہے:

"اب ساحل قریب آتا جاتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہمارا جہاز عدن جا پہنچے گا۔ ساحل عرب کے تصوّر نے جو ذوق و شوق اِس وقت دل میں پیدا کر دیا ہے اس کی داستان کیا عرض کروں —— اے عرب کی مقدس سرزمین! تجھ کو مبارک ہو۔ تُو ایک پتھر تھی جس کو معماروں نے رد کر دیا تھا، مگر ایک یتیم بچّے نے خدا جانے تجھ پر کیا افسوں پڑھ دیا کہ موجودہ دُنیا کی تہذیب و تمدّن کی بنیاد تجھ پر رکھی گئی۔ باغ کے مالک نے اپنے ملازموں کو مالیوں کے پاس پھل کا حصہ لینے کو بھیجا لیکن مالیوں نے ہمیشہ ملازموں کو مارپیٹ کے باغ سے نکال دیا اور مالک کے حقوق کی کچھ پروا نہ کی۔ مگر اے

پاک سرزمین! تُو وہ جگہ ہے جہاں سے باغ کے مالک نے خود ظہور کیا، تاکہ گستاخ مالیوں کو باغ سے نکال کر پھُولوں کو اُن کے نامسعود پنجوں سے آزاد کرے۔ تیرے ریگستانوں نے ہزاروں مقدّس نقشِ قدم دیکھے ہیں اور تیری کھجوروں کے سائے نے ہزاروں ولیوں اور سلیمانوں کو تمازتِ آفتاب سے محفوظ رکھا ہے۔ کاش میرے بدکردار جسم کی خاک تیرے بیابانوں میں اُڑتی پھرے اور یہی آوارگی میری زندگی کے تاریک دِنوں کا کفّارہ ہو۔ کاش میں تیرے صحراؤں میں لُٹ جاؤں، اور دنیا کے تمام سامانوں سے آزاد ہو کر تیری تیز دھوپ میں جلتا ہوا اور پاؤں کے آبلوں کی پروا نہ کرتا ہوا اُس پاک سرزمین میں جا پہنچوں جہاں کی گلیوں میں بلالؓ کی عاشقانہ آواز گونجتی تھی۔"

سویز پہنچ کر ساحل پر اقبال اُترتے ہیں اور مسلمان دوکانداروں کے درمیان گھُل مل جاتے ہیں:

"ایک نوجوان مصری دوکاندار سے مَیں نے سگریٹ خریدنے چاہے اور باتوں باتوں میں مَیں نے اُس سے کہا کہ مَیں مسلمان ہوں۔ مگر چونکہ میرے سر پر انگریزی ٹوپی تھی، اُس نے ماننے میں تامل کیا اور مجھ سے کہا کہ تُم ہیٹ کیوں پہنتے ہو۔ تعجب ہے کہ یہ شخص ٹوٹی پھُوٹی اُردو بولتا تھا۔ جب وہ میرے اِسلام کا قائل ہو کر یہ جملہ بولا "تُم بھی مسلم، ہم بھی مسلم" تو مجھے بڑی مسرّت ہوئی —— مَیں نے چند آیات قرآن شریف کی پڑھیں تو نہایت خوش ہوا، اور میرے ہاتھ چُومنے لگا۔ باقی تمام دوکانداروں کو مجھ سے ملایا اور وہ لوگ میرے گرد حلقہ باندھ کر ماشاء اللہ، ماشاء اللہ کہنے لگے اور میری غرضِ سفر سُن کر دُعائیں دینے لگے، یا یوں کہئے کہ دو چار منٹ کے لئے وہ تجارت کی پستی سے اُبھر کر اسلامی اخوّت کی بلندی پر جا پہنچے۔"

ایک دوسرا منظر، مصری نوجوان:

"تھوڑی دیر کے بعد مصری نوجوانوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز کی سیر کے لئے آیا۔ مَیں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اُن کے چہرے اس قدر مانوس معلوم ہوتے تھے کہ مجھے ایک سیکنڈ کے لئے علی گڑھ کالج کے ایک ڈیپوٹیشن کا شبہ ہوا۔ یہ لوگ جہاز کے ایک کنارے پر کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے اور مَیں بھی دخل در معقولات اُن میں جا گھُسا۔ دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اُن میں سے ایک نوجوان ایسی خوبصورت

عربی بولتا تھا کہ جیسے حریری کا کوئی مقام پڑھ رہا ہو۔"

ایک اور نظارہ، مسلم عسکر:

"جہاز سے گزرتے ہوئے ایک اور دلچسپ نظارہ بھی دیکھنے میں آیا، اور وہ یہ کہ ہم نے ایک مصری جہاز گزرتے ہوئے دیکھا جو بالکل ہمارے ہی پاس سے ہو کر گزرا۔ اِس پر تمام سپاہی ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے اور نہایت خوش الحانی سے عربی غزل گاتے جاتے تھے۔ یہ نظارہ ایسا پُر اثر تھا کہ اِس کی کیفیت اب تک دل پر باقی ہے۔"

پورٹ سعید سے بحیرہ روم کا چھ روزہ سفر، مختلف جزیروں کا نظارہ کرتے ہوئے ۲۳ ستمبر کی صبح مارسیلز پہنچے، اور وہاں سے ٹرین پر سوار ہو کر فرانس کی سیر "حسن رہگزرے" کے طور پر کرتے ہوئے برٹش چینل سے ڈوور اور وہاں سے لندن پہنچے، جہاں احباب چشم براہ تھے: "شیخ عبدالقادر کی باریک نگہ نے باوجود میرے انگریزی لباس کے مجھے دُور ہی سے پہچان لیا اور دوڑ کر بغل گیر ہوگئے"--- "مکان پر پہنچ کر رات بھر آرام کیا۔ دوسری صبح سے "کام" شروع ہوا۔ یعنی اُن تمام فرائض کا مجموعہ جن کی انجام دہی نے مجھے وطن سے جُدا کیا تھا اور میری نگاہ میں ایسا ہی مقدس ہے جیسے عبادت۔"

اقبال ٹرینٹی کالج، کیمبرج میں داخل ہوئے۔ لنکنز اِن میں بار ایٹ لا کے لیے نام رجسٹر کروایا۔ (٦ نومبر ۱۹۰۵ء) کیمبرج سے بی۔ اے کیا اور پروفیسر میک ٹیگرٹ کی نگرانی میں "ایران میں مابعدالطبیعیات" کے موضوع پر اعلیٰ تحقیق کے لیے کام شروع کیا۔ تحقیقی مطالعے کے دوران مروجہ تصوّف اور وحدت الوجود کے تصور کے بارے میں کچھ شکوک پیدا ہونے لگے۔ خواجہ حسن نظامی اور (ان کے ذریعے) شاہ سلیمان پھلواری سے ان مسائل پر خط کتابت کی:

".... قرآن شریف میں جس قدر آیات صریحاً تصوف کے متعلق ہوں اُن کا پتہ دیجیے، سپارہ اور رکوع کا پتہ لکھیے۔ اِس بارے میں آپ قاری شاہ سلیمان صاحب یا کسی اور صاحب سے مشورہ کر کے مجھے بہت جلد مفصّل جواب دیں۔ اس مضمون کی سخت ضرورت ہے اور یہ گویا آپ کا کام ہے۔ قاری شاہ سلیمان صاحب کی خدمت

میں میرا یہی خط بھیج دیجئے اور بعد التماسِ دُعا عرض کیجئے کہ میرے لئے یہ زحمت گوارا کریں اور مہربانی کر کے مطلوبہ قرآنی آیات کا پتہ دیویں۔ اگر قاری صاحب موصوف کو یہ ثابت کرنا ہو کہ مسئلہ وحدت الوجود یعنی تصوف کا اصل مسئلہ قرآن کی آیات سے نکلتا ہے تو وہ کون کون سی آیات پیش کر سکتے ہیں، اور ان کی کیا تفسیر کرتے ہیں؟ کیا وہ یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ تاریخی طور پر اسلام کو تصوف سے تعلق ہے۔ کیا حضرت علی مرتضیٰؓ کو کوئی خاص پوشیدہ تعلیم دی گئی تھی؟ غرضیکہ اس امر کا جواب معقولی اور منقولی اور تاریخی طور پر مفصل جاننا چاہتا ہوں۔ میرے پاس کچھ ذخیرہ اِس امر کے متعلق موجود ہے۔ مگر آپ سے اور قاری صاحب سے استصواب ضروری ہے۔ آپ اپنے کسی اور صوفی دوست سے بھی مشورہ کر سکتے ہیں، مگر جواب جلد آئے۔"

اقبال اس وقت وحدت الوجود کے تصور کے خلاف نہیں تھے۔ حافظ شیرازی کے بھی وہ بڑے مداح تھے:

"جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی رُوح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور مَیں خود حافظ بن جاتا ہوں۔"

لیکن مطالعہ و تحقیق کے دوران اُن کے ذہن میں ایک خلجان پیدا ہوا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا گیا حتیٰ کہ وہ مروجہ تصوف اور وحدت الوجود کے تصور کو مسلمانوں کے زوال کا ایک اہم سبب سمجھنے لگے۔ "اَسرارِ خودی" کی طباعت (اور ڈاکٹر نکلسن کے انگریزی ترجمہ کی اشاعت) کے بعد پروفیسر میک ٹیگرٹ نے انہیں ایک مکتوب میں اس تبدیلی رجحان کے بارے میں لکھا:

☆ "مَیں یہ لکھتے ہوئے آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے آپ کی نظمیں پڑھتے ہوئے کتنی مسرّت ہوتی ہے۔ کیا آپ نے اپنا موقف بہت زیادہ بدل نہیں لیا؟ یقیناً ان ایام میں جب ہم باہم فلسفے پر گفتگو کیا کرتے تھے، آپ ازحد وحدت الوجودی اور متصوّف تھے۔"

کیمبرج کے زمانۂ قیام میں یا جہاں کہیں بھی وہ یورپ میں گئے اقبال اپنے مطالعہ و تحقیق میں ازحد مصروف رہے۔ ان کے علمی انہماک کے بارے میں کچھ معاصرانہ شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ ڈاکٹر آر۔ اے نکلسن "دی سیکرٹ آف دی سیلف"

کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

☆ "مجھے تقریباً پندرہ سال قبل ایک موقع پر شیخ محمد اقبال آف لاہور سے ملنے کی مسرت حاصل ہوئی تھی، جب وہ کیمبرج میں فلسفے کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ آدھ گھنٹے کی گفتگو کے دوران مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک محکم شخصیت اور تخلیقی ذہن کے انسان ہیں، اور میرے اس اوّلین تاثر کی جلد ہی اُس تحقیقی مقالے سے توثیق ہو گئی جو انہوں نے اپنی ڈگری کے لیے پیش کیا۔ اس مقالے کا موضوع ایران میں مابعد الطبیعیات کا ارتقا تھا جو ۱۹۰۸ء میں کتابی صورت میں منظر عام پر آیا۔ ہر چند کہ یہ صرف خاکہ سا ہے، مگر اس کے بعض حصے اتنے روشن اور خیال افروز ہیں کہ جو اس موضوع پر اب تک لکھے گئے۔ اس میں اقبال نے اپنے آپ کو مسلم فلسفیوں کے نظریات کے جائزے تک محدود رکھا ہے، لیکن ہند میں واپس جانے کے بعد انہوں نے اپنا ایک فلسفہ پیش کیا ہے جو صاحب فکر مسلمانوں کے لیے لازماً گہری دلچسپی کا موجب ہے اور ہر اس شخص کے لیے بھی جو یہ سوچتا ہے کہ مستقبل میں اس ملک اور یورپ کے تعلقات بالعموم اہل اسلام کے ساتھ کس نوعیت کے ہوں گے اور یہ کتنا ضروری ہے کہ ہم اُن کے نظریات اور آرزوؤں کو سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں۔ اقبال کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ "وہ اپنے عہد کا انسان ہے اور اپنے عہد سے آگے کا انسان ہے۔ وہ ایک ایسا انسان بھی ہے جو اپنے عہد سے اختلاف کرتا ہے۔"

دس سال بعد، دوسری گول میز کانفرنس کے دوران ڈاکٹر نکلسن نے اپنے تاثرات کا اظہار کیمبرج میں تقریر کرتے ہوئے کیا:

"مَیں کیمبرج میں ڈاکٹر اقبال سے تقریباً پچیس سال قبل ملا تھا۔ طالب علمی کے ایام میں کوئی شخص کسی نوجوان کی شہرت کے بارے میں پیش بینی نہیں کر سکتا، مگر اقبال کے بارے میں استثنیٰ ہے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ عظمت کی بلندیوں تک پہنچیں گے۔"

اقبال کے علمی انہماک کے بارے میں ڈاکٹر سارلے کہتے ہیں:

"آج سے پچیس سال قبل جب ڈاکٹر سر محمد اقبال کیمبرج میں پڑھتے تھے تو اگرچہ وہ زیادہ بولتے نہیں تھے اور خاموش سے رہتے تھے، لیکن کیمبرج سے جا کر انہوں نے جو عظمت و شہرت حاصل کی، وہ ہمارے لیے تعجب انگیز نہ تھی۔ اس لیے کہ ہم

طالب علمی کے زمانے سے جانتے تھے کہ ان میں جوہر خاص موجود ہیں اور یہ ضرور چمکیں گے۔"

کیمبرج میں کانٹ اور ہیگل پر پروفیسر میک ٹیگرٹ کے دروس میں اقبال بالالتزام شریک ہوتے رہے۔ میک ٹیگرٹ کے فلسفے پر اقبال اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

☆ "میری ملاقات تقریباً روزانہ ان کے کمرے میں ہوتی تھی، اور مسائل و افکار پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ ہماری گفتگو اکثر وجود باری تعالیٰ کے مسئلے پر آ جاتی۔ (خدا کے عدم وجود کے بارے میں) میک ٹیگرٹ کی پُرزور منطق مجھے خاموش تو کرا دیتی لیکن وہ مجھے قائل کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکے۔"

اقبال نے اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۰۷ء کے شروع میں مکمل کر لیا تھا جسے پی ایچ، ڈی کے لیے میونخ یونیورسٹی (جرمنی) میں پیش کیا جانا تھا کیونکہ اس وقت کیمبرج یونیورسٹی میں فلسفے کی صرف ماسٹرز ڈگری تھی۔ کیمبرج کے نگران پروفیسر کی سفارش پر میونخ یونیورسٹی نے اقبال کو اس سلسلے میں یہ رعایات دیں:

۱۔ یونیورسٹی کی اقامت (ڈیڑھ سے تین سال تک) سے انہیں مستثنیٰ کر دیا گیا۔
۲۔ مقالہ لاطینی یا جرمن زبان کی بجائے انگریزی میں پیش کرنے کی اجازت دی گئی۔
البتہ مقالے کے بارے میں زبانی امتحان جرمن زبان میں ہونا قرار پایا۔

جرمن زبان کے امتحان کے لیے اقبال نے "تاریخ عالم" پر مقالہ لکھا۔ جولائی ۱۹۰۷ء کے تیسرے ہفتے میں اقبال جرمنی گئے۔ ہائیڈل برگ اور میونخ کی یونیورسٹیوں میں چند ماہ تک جرمن زبان اور فلسفے کا مطالعہ جاری رکھا۔ میونخ یونیورسٹی میں انہوں نے اپنا مقالہ "Development of Metaphysics in Persia" پیش کیا اور اس سلسلے میں زبانی امتحان میں کامرانی کے بعد انہیں نومبر ۱۹۰۷ء میں پی ایچ۔ ڈی کی سند ملی۔

جرمنی سے لندن واپس آ کر اقبال نے لنکنز ان میں بیرسٹر ایٹ لاء کے مراحل کی تکمیل کی (۶ جولائی ۱۹۰۸ء) اسی دوران چند ماہ پروفیسر طامس آرنلڈ کی رخصت کے زمانے میں یونیورسٹی کالج لندن میں معلّم عربی کے فرائض بھی انجام دیے۔

انگلستان کے زمانۂ قیام کے دوران شیخ عبدالقادر اور کچھ اور احباب گاہے بگاہے

ملتے رہتے تھے۔ ان دنوں میں عبداللہ مامون سہروردی اور مشیر حسین قدوائی نے لندن میں پان اسلامک سوسائٹی قائم کی تھی۔ اقبال اس سوسائٹی میں دلچسپی لیتے رہے۔ شیخ عبدالقادر اور مشیر حسین قدوائی نے اگست، ستمبر ۱۹۰۶ء میں استنبول، ترکی کی سیاحت کی اور شیخ عبدالقادر نے اس سیاحت کے بارے میں انگریزی میں کچھ آرٹیکل لکھے جن میں اس اسلامی مرکز کی سیاحت کے بارے میں اپنے مشاہدات رقم کیے۔ ان مضامین کے علاوہ انہوں نے "مقامِ خلافت" کے عنوان سے انہی مشاہدات پر مبنی اردو میں کتاب لکھی اور باتصویر شائع کی۔ شیخ عبدالقادر کے توسّط سے اقبال نے ترکی کے بارے میں راست معلومات حاصل کیں۔ ہم ان دو بے تکلّف دوستوں کے مابین گفتگو کی تفصیلات سے تو آگاہ نہیں مگر اقبال کی ایک نظم کے حوالے سے جو بعد میں انہوں نے شیخ عبدالقادر سے خطاب کرتے ہوئے کہی ہے، ہم اُن کے مستقبل کے ارادوں اور منصوبوں سے کچھ آگاہی حاصل کرسکتے ہیں۔ (ہم اس نظم پر اگلے صفحات میں کچھ اظہار خیال کریں گے)۔

اسی زمانے کی ایک اور غزل میں جس کی تخلیق کا سنہ اور مہینہ (مارچ ۱۹۰۷ء) خاص طور سے شروع میں دیا گیا ہے، اقبال اپنے شعری وجدان کی بدولت کچھ ایسی الہامی پیش گوئیاں کرتے ہیں جو اُن کے ذہن و فکر کے ارتقائی مراحل کے سلسلے میں سنگ میل کہی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر کیمبرج کی ایک تقریب میں اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

"مَیں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب (مغربی تہذیب) کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پیشین گوئیاں کی تھیں۔ اگرچہ مَیں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔"

مارچ ۱۹۰۷ء کی اردو غزل کے یہ اشعار اقبال کے اسی شعری وجدان کا الہامی اظہار ہیں:

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرا سے باندھا گیا تھا پھر اُستوار ہو گا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سُنا ہے یہ قدسیوں سے مَیں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تُم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہو گا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہو گا

سفینہ برگِ گُل بنا لے گا قافلہ مورِ ناتواں کا!
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا سے پار ہو گا!

مَیں ظلمتِ شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہو گی آہ میری، نفس میرا شعلہ بار ہو گا

ایک عالمگیر ملّت کا تصور جو اسلامی بھائی چارے، مساوات اور اخوّت پر مبنی، علاقائی و جغرافیائی خصوصیات، نسل، رنگ اور لسانی امتیازات سے ماورئ ہو (یعنی اسلامی اُمّہ) اسی لمحے اقبال کے ذہن میں اُبھرا، اور یہ تصور ان کے یقین و ایمان کی قیمتی متاع بن کر ان کے تخلیقی وجدان میں سما گیا۔ اسی زمانے کی ایک اور غزل میں انہوں نے عالم انسانی کے اس بھائی چارے کے تصور کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا ہے جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع کے لیے رحمت کا لقب دے کر بھیجا:

(وما ارسلنک الّا رحمۃ للعلمین)

نرالا سارے جہاں سے اِس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملّت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اسی غزل کے مقطع میں وہ شیخ عبد القادر سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مدیرِ مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں اُنہیں مذاقِ سخن نہیں ہے!

اس دَور قیام یورپ کے بارے میں اقبال کے منظوم تاثرات کے علاوہ چند خود نوشت بیانات بھی اُن کی ذہنی و وجدانی کیفیت پر روشنی ڈالتے ہیں کہ کیسے یہ انقلابی تبدیلی اُن کے ذہن پر وارد ہوئی اور کس طرح انہوں نے اسے لبیک کہا۔ ۷ ستمبر ۱۹۲۱ء کے ایک مکتوب میں اقبال مدیر "نقیب" بدایوں' وحید احمد کو لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا دشمن اسلام اور اسلامیوں کا نسلی امتیاز و ملکی قومیت کا خیال ہے۔ پندرہ برس ہوئے جب مَیں نے پہلے پہل اس کا احساس کیا۔ اُس وقت مَیں یورپ میں تھا اور اس احساس نے میرے خیالات میں انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگذشت قلم بند کروں گا جس سے مجھے یقین (ہے کہ) بہت لوگوں کو فائدہ ہو گا۔ اُس دن سے جب یہ احساس مجھے ہُوا آج تک برابر اپنی تحریروں میں یہ ہی خیال میرا مطمح نظر رہا ہے۔ معلوم نہیں میری تحریروں نے اَور لوگوں پر اثر کیا یا نہیں کیا، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اِس خیال نے میری زندگی پر حیرت انگیز اثر کیا ہے۔"

دوسرا بیان اس کے دس سال بعد گول میز کانفرنس کے دوران کیمبرج کی ایک تقریب میں اقبال کی ایک تقریر میں آتا ہے (جسے مولانا مہر نے قلم بند کیا تھا)۔ طلبہ اور اسکالروں سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

"مَیں ان نوجوانوں کو جو اس وقت کیمبرج میں تحصیل علم کر رہے ہیں' چند مشورے دینا چاہوں گا۔۔۔ مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ الحاد اور مادہ پرستی کی رَو سے اپنے آپ کو بچایئے۔ یورپ سے بہت بڑی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے مذہب اور ریاست کو الگ الگ کر دیا۔ اس لغزش نے ان کے کلچر کو اخلاق روحانی سے محروم کرکے مادہ پرستی کی راہ پر ڈال دیا۔ مَیں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام کے متعلق بعض پیشین گوئیاں کی تھیں۔ اگرچہ مَیں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے' اس سے چھ سات سال بعد یعنی ۱۹۱۴ء میں میری پیشین گوئیاں حرف بحرف پوری ہوگئیں۔ ۱۹۱۴ء کی

یورپین جنگ عظیم متذکرہ بالا لغزش کا شاخسانہ تھی جو یورپین قوموں نے چرچ اور سٹیٹ کی علیحدگی سے کی تھی۔"

شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے مقدمے میں ایک دلچسپ واقعہ اقبال کے شعر گوئی ترک کر دینے کے ارادے کا بیان کیا ہے۔ عبدالقادر نے اس بارے میں اقبال سے اختلاف کیا اور معاملہ حتمی فیصلے کے لیے پروفیسر آرنلڈ کے سامنے پیش کیا گیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے یہ کہتے ہوئے عبدالقادر کا ساتھ دیا کہ اقبال ایسی شاعری تخلیق کر کے ایک مفید مقصد کو انجام دے رہا ہے۔ چنانچہ اقبال اس ارادے سے باز آ گیا۔ ایک اور واقعہ اسی زمانے میں پیش آیا اور وہ تھا اقبال کا اردو سے فارسی کی طرف میلان جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ شیخ عبدالقادر نے ان واقعات کی کوئی تاریخ نہیں دی لیکن غالب امکان یہ ہے کہ یہ واقعات ۱۹۰۶ء کے آخری حصے میں پیش آئے۔

سال ۱۹۰۷ء کے چند اور معمولی واقعات کا تذکرہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔ اقبال کے قریبی ساتھی شیخ عبدالقادر بار ایٹ لاء کی تکمیل کر کے اسی سال وطن مراجعت کر گئے۔ اسی سال کے شروع میں مس بیک نے اقبال کو مس عطیہ سے متعارف کرایا اور وہ ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ جب اس سال کے آخری نصف میں اقبال جرمنی میں تھے تو مس عطیہ ہندوستان واپس جاتے ہوئے وہاں ٹھہری۔ بعد میں اس نے اقبال پر اپنی کتاب میں اِس مجلسی صحبت کے بعض مشاہداتی واقعات بیان کیے ہیں۔

لندن میں اپنے قیام کے آخری ایّام میں اقبال نے لندن یونیورسٹی میں تدریس عربی کے علاوہ اسلامی ثقافت اور تاریخ پر لیکچروں کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا جس کے بارے میں وہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں۔ (مکتوب مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۸ء):

"انگلستان میں مَیں نے اِسلامی تہذیب و تمدن پر لیکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ ایک لیکچر ہو چکا ہے۔ دُوسرا "اسلامی تصوف" پر فروری کے تیسرے ہفتہ میں ہو گا۔ باقی لیکچروں کے معانی یہ ہوں گے "مسلمانوں کا اثر تہذیب یورپ پر"، "اسلامی جمہوریت"، "اسلام اور عقل انسانی" وغیرہ۔"

انہی ایّام میں اقبال کا ایک آرٹیکل Islam and Khilafat لندن کے سوشیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا۔ اسی سال لوزاک کمپنی لندن نے ان کا پی، ایچ۔ ڈی کا

مقالہ : Development of Metaphysics in Persia شائع کیا (یہ اقبال کی دوسری مطبوعہ کتاب بزبان انگریزی تھی۔ کئی سال بعد جب میر حسن الدین نے اقبال کی اس کتاب کا اردو ترجمہ "فلسفہ عجم" کے عنوان سے کیا تو پہلے انہوں نے اقبال سے ترجمے کی اجازت طلب کی۔ اقبال نے یہ اجازت تو دے دی مگر ساتھ ہی یہ لکھا: "یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آ چکا ہے--- میرے خیال میں اب اس کتاب کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔" (مکتوب محررہ ۱۱ جنوری ۱۹۲۷ء)

۱۹۰۸ء میں سید امیر علی نے لندن میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کی۔ اقبال اس کی مجلس عاملہ کے رُکن تھے۔ یورپ میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اپنی خواہشات کی تکمیل کے بعد جولائی ۱۹۰۸ء کے شروع میں اقبال نے اپنے وطن کی طرف مراجعت فرمائی۔

اگست ۱۹۰۸ء تا دسمبر ۱۹۰۹ء

سہ سالہ قیام یورپ کے بعد اقبال ۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کی شام کو لاہور پہنچے اور اگلے روز اپنے والدین کی قدم بوسی کے لیے سیالکوٹ روانہ ہوگئے۔ ۲۹ اگست ۱۹۰۸ء کے ایک مکتوب میں (شاطر مدراسی کے نام) اقبال اپنے آئندہ پروگرام کے بارے میں لکھتے ہیں:

"مَیں ایک دو ماہ کے لئے سیالکوٹ مقیم رہوں گا۔ اس کے بعد لاہور بیرسٹری کا کام شروع کروں گا۔ ملازمت کا سلسلہ ترک کر دیا ہے۔"

خواجہ حسن نظامی کے نام مکتوب محررہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں اقبال لکھتے ہیں:

"آپ اپنی ہر تحریک میں بغیر پُوچھے مجھے شریک تصور کیجئے۔ مگر جس درد نے کئی مہینوں سے مجھے بے تاب کر رکھا ہے، جو مجھے راتوں کو سونے نہیں دیتا، جو مجھے تنہائی میں رُلاتا ہے، اس کی وجہ مجھ سے پہلے سُن لیجئے، پھر جو چاہے کیجئے، مَیں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ میرے ساتھ۔ کئی دنوں سے بیمار ہوں۔ دعا کیجئے کہ بالکل اچھا ہو جاؤں۔"

اقبال کا یہ ذہنی کرب قابل غور ہے جو ان کی فکری اور عملی زندگی کی کشمکش کو ظاہر کرتا ہے جس سے وہ ان دنوں دوچار تھے۔

اکتوبر ۱۹۰۸ء میں اقبال سیالکوٹ سے لاہور آگئے اور چیف کورٹ میں وکالت کے لیے درخواست دی۔ ان کی درخواست ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۸ء کو منظور ہوگئی اور انہوں نے ایک وکیل کی حیثیت سے چیف کورٹ میں کام کا آغاز کر دیا۔ انہوں نے موہن لال روڈ (اب اردو بازار) پر کرائے کے ایک مکان کا بندوبست کیا جو مفید عام پریس کے بالمقابل تھا۔ چند ماہ بعد وہ انارکلی بازار کی ایک عمارت کی بالائی منزل میں منتقل ہوگئے (جہاں اب نیو مارکیٹ ہے) اس مکان میں اقبال ۱۹۲۲ء کے آخر تک مقیم رہے۔

شروع شروع میں اقبال قانون کے پیشے میں ازحد مصروف رہے۔ وہ خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں، (مورخہ ۲ اگست ۱۹۰۹ء):

"کچھ دنوں سے بہت عدیم الفرصت ہوں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ قانونی پیشہ میں اس قدر مصروفیت رہے گی۔"

شاطر مدراسی کے نام محولہ بالا مکتوب میں اقبال پہلے ہی یہ لکھ چکے تھے:

"گذشتہ تین سال سے بہت کم اتفاق شعر گوئی کا ہوتا ہے، اور اب تو مَیں پیشہ ہی اس قسم کا اختیار کرنے کو ہوں جس کو شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔"

گو شعر گوئی کی مقدار کم ہوگئی لیکن جو فکر و احساس اقبال یورپ سے لے کر آئے تھے وہ کبھی نظم میں، اور کبھی نثری مضمون کی صورت میں ڈھل کر منظر عام پر آ رہا تھا۔ واپسی کے سفر میں بحیرۂ روم سے گزرتے ہوئے جو تاثرات اقبال کے ذہن میں اُبھرے، وہ اُن کی نظم "صقلیہ" (جزیرہ سسلی) میں منعکس ہیں۔ خصوصاً اس نظم کا آخری بند یہاں قابل ذکر ہے:

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟
تیرے ساحل کی خاموشی میں ہے اندازِ بیاں

درد اپنا مجھ سے کہہ مَیں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تُو منزل تھا، مَیں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصّہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

مَیں ترا تحفہ سُوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہُوں، اَوروں کو وہاں رلواؤں گا

اقبال کی نظم "عبدالقادر کے نام" نومبر ۱۹۰۸ء کے "مخزن" میں شائع ہوئی تھی جس کے ساتھ مدیر مخزن شیخ عبدالقادر کا یہ شذرہ بھی چھپا تھا:

"اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہوئے مجھے اس بات سے شرم آتی ہے کہ ایسی نظم اور ایسے خیالات کا مخاطب مجھے بنایا گیا ہے، اور ایسے بلند ارادوں میں مجھے شریک کیا گیا ہے۔ سوائے اس کے کہ دل اپنے دلنواز کی محبت کا شکریہ ادا کرے اور مَیں یہ دعا کروں کہ خدا حضرت اقبال کے ارادوں میں برکت دے اور اگر میرے نصیب میں کوئی خدمت ملک کی لکھی ہے تو مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، کوئی جواب اس خط کا مجھ سے بَن پڑتا نہیں۔ خصوصاً جب جناب اقبال کے اشعار آبدار کے مقابل اپنی نثر کی خشکی اور بے مائیگی پر نظر کرتا ہوں۔"

"عبدالقادر کے نام" اس نظم کے یہ اشعار اقبال کے عزمِ صمیم اور پُختہ ارادے کے آئینہ دار ہیں:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اِسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اقبال کی ایک نظم "پیامِ عشق" اکتوبر ۱۹۰۸ء کے شمارہ مخزن میں چھپی اور ایک دوسری نظم "دو ستارے" اگست ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔ ایک آرٹیکل :

Islam As a Moral and Political Ideal "ہندوستان ریویو" بابت جولائی، دسمبر ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ اقبال کا ایک اہم مکتوب منشی غلام قادر فرخ امرتسری کے نام ۲۸ مارچ ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا۔ اس مکتوب میں امرتسر کے ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے مشترکہ تعلیمی، علمی، ادبی ادارے "منروالاج" کے حوالے سے قومی تشخّص کے مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس ادارے کا سالانہ اجلاس اپریل ۱۹۰۹ء میں امرتسر میں ہو رہا تھا اور اس میں غالباً اقبال کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ مکتوب درج ذیل ہے :

"باوجود کوشش بلیغ کے مسلمان برہمو سماج اور کانگرس کی مجالس سے متنفّر رہے اور اب تک ہیں۔ خیر، اِن کی نسبت تو کہا جا سکتا ہے کہ ان ہر دو تحریکوں سے روکنے والے بہت سے تھے۔ مگر مَیں یہ دیکھتا ہوں کہ جس شہر یا گاؤں میں دو سکول تھے، ایک ہندوؤں کا اور دوسرا عیسائیوں کا، تو مسلمان فطرتاً عیسائیوں کے سکول کی طرف متوجہ ہوتے۔ خواہ ہندوؤں کا مدرسہ بھی اُن کے لئے کُشادہ ہو۔ یہ ایسے واقعات ہیں کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے لئے کوئی متفقہ حکمت عملی سوچنے کے لئے ان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ مَیں خود اس خیال کا رہ چکا ہوں کہ امتیازِ مذہب اس ملک سے اُٹھ جانا چاہئے اور اب تک پرائیویٹ زندگی میں اسی پر کاربند ہوں۔ مگر اب میرا یہ خیال ہے کہ قومی شخصیت کو محفوظ رکھنا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان میں ایک مشترک قومیت پیدا کرنے کا خیال اگرچہ نہایت خوبصورت ہے اور شعریت سے معمور ہے، تاہم موجودہ حالت اور قوموں کی نادانستہ رفتار کے لحاظ سے ناقابل عمل ہے۔"

یورپ سے واپسی کے بعد پیشہ وکالت کی ابتدائی دقتوں اور مصروفیتوں، اور قومی مسائل پر اضطراب انگیز غور و فکر کے علاوہ اقبال کے کچھ نامساعد نجی حالات بھی اُن کے لیے شدید پریشانی اور جذباتی ہیجان کا سبب بنے رہے۔ اقبال اپنی ازدواجی زندگی سے مطمئن نہیں تھے جس کا بندھن بزرگوں کے اصرار و دباؤ پر بندھا تھا۔ بعض نقّاد اس جذباتی ہیجان و اضطراب سے طرح طرح کے خود ساختہ نتیجے نکالتے ہیں۔ یہ درست ہے

کہ اقبال کی زندگی کا یہ ایک آزمائشی دَور تھا اور کچھ عرصے تک یہ ہیجان و اضطراب اور عدم اطمینان کی کیفیت اُن پر طاری رہی، حتیٰ کہ اُن کا عقد ثانی و ثالث ان کی نجی زندگی میں سکون و اطمینان کا باعث بنا۔ اس دوران میں ان کی ذہنی و جذباتی کیفیتوں کا اظہار مس عطیہؔ کے نام اقبال کے خطوط سے ہوتا ہے۔ یہ خطوط انگریزی میں ہیں۔ موجودہ مطالعہ کے لحاظ سے اقبال کی کچھ ذہنی کیفیتوں اور عملی دشواریوں کا تذکرہ بصورت اردو ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۳ جنوری ۱۹۰۹ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

مائی ڈیئر مس عطیہ، آپ کے مشفقانہ مکتوب کے لیے ازحد ممنوں ہوں جو ابھی ملا اور میرے اطمینان کا باعث ہوا۔ نواب صاحب، بیگم صاحبہ اور آپ کی طرف سے جنجیرہ آنے کی دعوت انتہائی کرم نوازی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی چیز میرے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر مسرّت و منفعت بخش نہیں ہو سکتی۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ حال ہی میں، مَیں نے اپنا کاروبار شروع کیا ہے جس کے لیے میری ہمہ وقت یہاں موجودگی ازبس ضروری ہے۔ دوسروں کی بھلائی کی خاطر مجھے آپ کی پُرلطف صحبت سے محروم ہونا پڑ رہا ہے۔ ہرچند کہ میری شدید خواہش تھی کہ آپ کے اور آپ کی ہمشیرہ کے حالیہ غم و الم میں شریک ہو کر اس اندوہ غم کے اثرات کو کم کرنے کی کوشش کروں، اور مَیں محسوس کرتا ہوں کہ اس امر میں مَیں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں لیکن ان نامساعد حالات میں مَیں اپنے جذبات کو دبا دینے پر مجبور ہوں۔ دوسروں کے مفاد اور لحاظ داری کی خاطر، جو اپنی قوت زیادہ پُرزور طریقے سے محسوس کراتی ہے، مَیں ان حالات میں بے بس ہوں۔

ازرہ مہربانی، آپ میری اس دنیا پرستی کے لیے مجھے مطعون نہ کریں جو ظاہر ہے موجودہ صورت میں حماقت کے مترادف ہے جب ہم شاعری کی خواب آور فضا میں ہوں۔ اندریں حالات، میرے لیے مستقبل قریب میں جنجیرہ آنا ممکن نہیں ہے۔"

۹ اپریل ۱۹۰۹ء کے مکتوب میں اقبال اپنے کچھ نجی حالات اور ذہنی کیفیات بیان کرتے ہیں:

"--- جی ہاں، مَیں نے علی گڑھ کے شعبہ فلسفہ کی پروفیسری سے انکار کر دیا

ہے اور چند روز پیشتر گورنمنٹ کالج لاہور میں شعبہ تاریخ کی پروفیسرشپ قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ مَیں قید ملازمت سے آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ جس قدر جلد ممکن ہو اس ملک سے بھاگ جاؤں۔ آپ کو وجہ معلوم ہے۔ صرف بھائی صاحب کی طرف سے مجھ پر ایک اخلاقی قرض و فرض کی پابندی ہے جس نے مجھے روکا ہوا ہے۔ میری زندگی ازحد اندوہناک ہے۔ انہوں نے مجھ پر میری بیوی مسلّط کر دی۔ مَیں نے اپنے والد صاحب کو لکھا ہے کہ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ میری شادی کا بندوبست کریں، خصوصاً جبکہ مَیں نے اس قسم کے کسی بندھن میں شرکت سے انکار کر دیا تھا۔ مَیں اُس کے نان نفقے کی امداد کے لیے تیار ہوں مگر اُس کو اپنے ساتھ رکھ کر اپنی زندگی کو تلخ بنانے کے لیے تیار نہیں۔ ایک انسان کی حیثیت سے مجھے بھی مسرّت کا حق حاصل ہے۔ اگر معاشرہ یا قدرت مجھے یہ مسرت دینے سے انکار کرتا ہے تو مَیں دونوں سے بغاوت کروں گا۔ اس کا ایک ہی علاج ہے کہ مَیں اس بدنصیب ملک کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ جاؤں یا بادہ نوشی میں پناہ لوں جو خودکُشی کا آسان ترین ذریعہ ہے۔ کتابوں کے بوسیدہ اوراق میرے لیے وجہ مسرت سے عاری ہیں۔ میری روح کا سوز دروں انہیں اور تمام سماجی رسوم و آداب کو جلا کر خاکستر کر دینے کے لیے کافی ہے۔ آپ فرماتی ہیں کہ یہ سب عالم ایک خدائے خیر نے تخلیق کیا ہے۔ ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن زندگی کے حقائق تو کسی دوسرے ہی نتیجے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ عقلی طور پر یہ باور کرنا آسان ہے کہ یزداں کی بہ نسبت ایک قادر مطلق اور ابدی اہرمن پر یقین کیا جائے۔ ان مزخرافات کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ مَیں ہمدردی کا طالب نہیں۔ مَیں تو صرف اپنی روح سے وہ بار ہلکا کرنا چاہتا تھا جس کے نیچے وہ دبی جا رہی ہے۔ آپ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔ اس لیے اپنے احساسات کو آپ کے سامنے بے باکانہ بیان کر دیا۔ یہ بات اعتماد کی ہے۔ ازرہ کرم کسی سے اس کا تذکرہ نہ کیجئے۔ مجھے امید ہے کہ اب آپ سمجھ جائیں گی کہ مَیں نے ملازمت کے بندھن سے انکار کیوں کیا!"

مندرجہ بالا مکتوب کے جواب میں مس عطیہ نے ہمدردانہ مشورے دیے۔ جواباً اقبال نے شکریے کے ساتھ اپنے محسوسات کا اظہار یوں کیا (مکتوب ۱۷ اپریل ۱۹۰۹ء):

"مائی ڈیئر عطیہ، آپ کے ہمدردانہ کلمات کا ممنون ہوں۔ آپ کے مکتوب میرے لیے بے حد طمانیت کا باعث ہوتے ہیں۔ مَیں بھی آپ سے ملاقات کا متمنّی ہوں اور آپ کے رُوبرو اپنے تمام احساسات بیان کرنا چاہتا ہوں۔ آپ فرماتی ہیں کہ مجھ سے آپ کئی استفسار کرنا چاہتی ہیں۔ ہاں، کیوں نہیں؟ آپ کے مکتوب ہمیشہ میرے سینے میں محفوظ رہتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اور آپ یہ بھی جانتی ہیں کہ مَیں آپ سے کچھ نہیں چھُپاتا۔ اور یہ میرا یقین ہے کہ ایسا کرنا گناہ ہے--- گذشتہ شب سَیرِ فلک کرتا ہوا مَیں بہشت کی طرف گیا۔ مگر جہنم کے دروازوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ دوزخ خوفناک حد تک سرد ہے۔ دوزخ کے محافظوں نے میری حیرت کو بھانپتے ہوئے کہا کہ یہ جگہ اپنی فطرت میں تو سخت ٹھنڈی ہے مگر یہ سخت گرم ہو جائے گی کیونکہ ہر شخص جو یہاں آئے گا دنیا سے اپنا ایندھن ساتھ لائے گا--- ☆ مَیں بھی تیاری کے طور پر امکان بھر دھکتے ہوئے کوئلے اکٹھے کر رہا ہوں۔ اس ملک میں کوئلے کی کانوں کی قلّت ہے---- عبدالقادر سے میری اکثر ملاقات ہوتی ہے۔ چیف کورٹ کے بار روم میں تقریباً ہر روز ملنا ہوتا ہے۔ مگر عرصہ ہوا کہ ہم نے آپ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ مَیں اب دوسروں سے بہت کم کلام کرتا ہوں۔ میرا اپنا وجود یاس انگیز خیالات کی کان ہے۔ یہ خیالات میری روح کی تاریک بانبیوں سے سانپوں کی طرح نکلے چلے آتے ہیں۔ میرا خیال ہے، مَیں ایک سپیرا بن جاؤں گا۔ گلیوں بازاروں میں پھروں گا اور تماش بین لڑکے ٹولیوں کی صورت میں میرے پیچھے پیچھے ہوں گے--- یہ خیال نہ فرمائیں کہ مَیں قنوطی ہوگیا ہوں۔ یقین کریں کہ میری تیرہ بختی میرے لیے ایک لطف و کیف اور لذّت کا خزینہ ہوگئی ہے اور مَیں ان لوگوں پر خندہ زن ہوں جو اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ مَیں نے اپنی مسرّت کو کس طرح حاصل کیا ہے!"

(☆ خواب کی اس کیفیت کو اقبال نے "سیر فلک" کے عنوان سے نظم کیا ہے۔ دیکھیے بانگ درا)

اور مندرجہ ذیل مکتوب (محررہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۹ء) بھی اقبال کے ذہن و فکر اور داخلی محسوسات کا اظہار کرتا ہے:

"مائی ڈیر مس عطیہ، آپ کے مکتوب کے لیے جو ابھی ابھی موصول ہوا، سراپا سپاس ہوں۔ آج صبح سے میری طبیعت غیر معمولی طور پر بشاش ہے۔ لہٰذا اگر آپ میرے مکتوب میں مزاح کی چاشنی محسوس کریں تو از رہ مہربانی مجھے معاف کر دیں۔۔ مَیں بالعموم جب کسی کام کی انجام دہی کے لیے اپنے ذہن کو آمادہ کر لیتا ہوں تو پھر اپنے آپ کو حالات کے سپرد کر دیتا ہوں کہ جدھر چاہیں مجھے لے جائیں۔ آپ کو اندازہ نہیں کہ آپ نے مجھے کیا کر دیا ہے، یہ صحیح ہے اور مناسب بھی، آپ کو اس کا احساس بھی نہیں ہو سکتا۔ مَیں اس سے آگاہ ہوں مگر اس کے اظہار پر قادر نہیں ہو سکتا۔ چلیے، اس موضوع کو یہاں چھوڑیں۔ یہ میرے لیے بے کار بھی ہو گا کہ ناقابل بیان کو بیان کروں اور پھر آپ کہتی ہیں کہ تم اپنے خیالات میں واضح نہیں ہو۔ معمولی معمولی شکایات (آپ انہیں معمولی کہنے میں غلطی پر ہیں) کیا مَیں انہیں جان سکتا ہوں؟ آپ اس نقطے پر معلومات کو روکیں گی نہیں، علی الخصوص اگر یہ شکایات میرے خلاف ہیں۔ بیشک، ہر شخص زندگی میں آرام گاہ (موت) کا انتظار کر رہا ہے۔ مَیں بھی اگلے جہان کی سیاحت کا آرزو مند ہوں، کیونکہ مَیں اپنے خالق کی زیارت کر کے اس سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ میری ذہنی کیفیت کے بارے میں عقلی توضیح کی جائے، جو میرے خیال میں اتنا آسان کام نہیں ہو گا۔ مَیں تو خود اپنے لیے بھی ایک معمّہ ہوں۔ آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ کئی سال ہوئے مَیں نے لکھا تھا:

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے!
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے!

.... مجھے یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ آپ کو اس بات سے قلق ہوا کہ شمالی ہند کے لوگ میری عزّت و توقیر نہیں کرتے۔ یقین مانئے کہ مَیں دوسروں کی واہ واہ پر زندہ رہنا نہیں چاہتا:

جینا وہ کیا جو ہو نفس غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

مَیں ایک بے ریا زندگی بسر کرتا ہوں۔ میرا دل میری زبان سے مکمّل طور پر ہم آہنگ ہے۔ لوگ منافقت کی عزت و توقیر کرتے ہیں۔ اگر منافقت ہی میرے لیے

عزت اور شہرت لاسکتی ہے تو مَیں عزلت کی زندگی بسر کرنا اور بلاتعزیت مر جانا پسند کروں گا۔ عوام کے احترام و عقیدت کا خراج ان لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو عوام کے غلط نظریات اخلاق و مذہب کے مطابق جیتے اور عمل کرتے ہیں۔ مجھے عوام کے احترام کی خاطر ان کے غلط نظریات کو قبول کرکے اپنے آپ کو گرانا اور روح انسانی کی فطری آزادی کو دبانا نہیں آتا۔ بائرن، گوئٹے اور شیلے کو اپنے معاصرین کا احترام حاصل نہ ہوسکا۔۔۔ مَیں اگرچہ فن شاعری میں اُن کی ہمسری کا دعوے دار نہیں ہوسکتا، تاہم مجھے فخر ہے کہ کم از کم اس اعتبار سے اُن کی ہم نشینی کا حق دار ضرور ہوں۔

کیا مَیں نے کبھی آپ کی رہنمائی کی ہے؟ آپ کو تو کبھی میری طرف سے علمی رہنمائی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ مَیں نے افلاطون سے آپ کو روشناس کرایا تھا اور بس یہاں تک۔ یہ مطالعہ اس قدر کم اور سرسری تھا کہ اس سلسلے میں آپ کی علمی رہنمائی کے شرف کا اپنے کو حقدار نہیں سمجھتا۔ آپ فرماتی ہیں کہ مَیں آپ کی خواہشات کے عدم احترام کا مرتکب ہوں۔ یہ واقعی عجیب بات ہے، کیونکہ مَیں نے آپ کی خواہشات کا احترام ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور آپ کی خوشنودی کے لیے حتی الامکان کوشاں رہا ہوں۔ البتہ، جب کبھی کوئی امر ہی میرے حیطہ اختیار سے باہر ہو تو مَیں مجبور ہوں۔ میری فطرت کا تقاضا میری رہنمائی کسی دوسری طرف کرتا رہا۔ "وگرنہ آپ زیادہ محتاط ہوتے۔" مجھے اعتراف ہے، مَیں آپ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔ از راہ کرم ذرہ وضاحت فرمایئے کہ کس اعتبار سے زیادہ محتاط رہنا چاہیے؟ مَیں ہمہ تن آپ کی خوشنودی کی خاطر خدمت کے لیے آمادہ ہوں۔ دنیا میری پرستش نہیں کرسکتی۔ کوئی میری پرستش کیا کرے گا کیونکہ میری فطرت میں پرستاری کے تقاضے اتنے پختہ اور گہرے ہیں کہ مَیں پرستاری پر مجبور ہوں۔۔۔ لیکن وہ خیالات جو میری روح کی گہرائیوں میں ایک طوفان برپا کیے ہوئے ہیں، لوگوں پر ظاہر ہو جائیں تو مجھے یقین واثق ہے کہ میری موت کے بعد میری پرستش ہوگی۔ دنیا میرے گناہوں کی پردہ پوشی کرے گی اور مجھے اپنے آنسوؤں کا خراج عقیدت پیش کرے گی۔"

گورنمنٹ کالج کی ملازمت سے اقبال لاہور آنے سے پہلے ہی مستعفی ہوگئے تھے۔ اس کے بعد انہیں ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ اور گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسر

شپ پیش کی گئی (جن کا تذکرہ گذشتہ صفحات پر ہوا) لیکن انہوں نے وکالت ہی کے نسبتاً آزاد پیشے کو سرکاری ملازمت پر ترجیح دی۔ تاہم جب یکم مئی ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ مسٹر ویاٹ جیمز (Wyatt james) کا انتقال ہوگیا تو ان کی جگہ فوری طور پر پُر کرنے میں پرنسپل روبسن کو بہت دشواری پیش آئی۔ ڈاکٹر اقبال کو آمادہ کیا گیا اور حکومت کے توسط سے چیف کورٹ میں ان کے مقدمات کی پیشی کا خاص انتظام کرکے انہیں قائم مقام پروفیسر فلسفہ مقرر کیا گیا۔ وہ دسمبر ۱۹۱۰ء تک یہ خدمت انجام دیتے رہے اور یکم جنوری ۱۹۱۱ء کو نئے پروفیسر فلسفہ ایل پی ساونڈرس کے آنے پر اپنے فرائض سے سبکدوش ہوئے۔

۱۹۱۰ء

اس سال کے دوران اقبال اپنے نئے پیشہ وکالت میں بہت مصروف رہے۔ چیف کورٹ کے مقدمات کی مصروفیت کے علاوہ وہ گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفے کی کلاسوں کو پڑھاتے رہے۔ اگرچہ وہ قومی مسائل پر بھی مسلسل غورو فکر کرتے اور گاہے بگاہے لکھتے بھی رہے مگر اُن کا ذہن شعری تخلیق کی طرف کم متوجہ ہوا۔ اقبال کے ذہن و فکر کا مطالعہ عطیہؓ کے نام ان کے خطوط اور Stray Reflections کے عنوان سے گاہے گاہے لکھی گئی انگریزی یادداشتوں سے کیا جاسکتا ہے۔ یہ ڈائری اپریل ۱۹۱۰ء سے شروع ہو کر چند ماہ تک وقفوں وقفوں سے لکھی جاتی رہی۔ ذہنی مطالعے کے لحاظ سے یہ دو اہم مآخذ ہیں۔

مارچ ۱۹۱۰ء میں اقبال پہلی بار حیدر آباد (دکن) گئے تاکہ اس دیسی ریاست میں آبرو مندانہ روزگار کے امکانات کا جائزہ لے سکیں۔ وہ چند روز وہاں رہے۔ کچھ اکابر سے ان کی ملاقاتیں ہوئیں۔ واپسی پر اقبال نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے مقبرے کی زیارت کی اور ۲۹ مارچ ۱۹۱۰ء کو لاہور پہنچے۔ اس کے دوسرے روز (۳۰ مارچ ۱۹۱۰ء) انہوں نے عطیہؓ بیگم کو یہ مکتوب لکھا:

''اگر میرا قیام حیدر آباد کچھ دن اور رہتا تو مجھے یقین ہے کہ ہزہائی نس نظام مجھے ضرور شرف باریابی بخشتے۔ مَیں حیدر آباد میں جملہ اکابر سے ملا۔ اکثر نے مجھے اپنے

ہاں مدعو کیا۔ میرا سفر حیدر آباد بلامقصد نہ تھا۔ عند الملاقات عرض کروں گا۔ میرے پاس رخصت اتفاقی کے صرف دس روز تھے جو ۲۸ مارچ کو ختم ہوگئی۔ مَیں ۲۳ مارچ کو حیدر آباد سے روانہ ہوا، اور لاہور پہنچنے میں چار دن لگے۔ علاوہ ازیں واپسی سفر پر مجھے حضرت عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پُرانوار پر بھی حاضر ہونا تھا۔ حضرت عالمگیرؒ پر ایک ایسی وجد انگیز نظم لکھوں گا کہ اردو والوں نے آج تک دیکھی نہ ہوگی--، مَیں ۲۹ مارچ کی صبح لاہور پہنچا۔ سیدھا کالج گیا اور وہاں سے عدالت عالیہ میں--- اندریں حالات میرے لیے جنجیرہ کا سفر کیونکر ممکن تھا---"

ایک ہفتے بعد اقبال نے ایک طویل مکتوب (محررہ ۷ اپریل ۱۹۱۰ء) لکھا جس میں سیاحت حیدر آباد کی غرض و غایت بیان کی:

"--- ازرہ کرم میری سیاحت حیدر آباد سے متعلق کوئی نتائج اخذ نہ کیجئے۔ مثلاً یہ کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام میری قدر افزائی فرما رہے ہیں۔ اس معاملے میں خود میری تحریر کا انتظار فرمایئے۔ مَیں نے اتنا طویل سفر اس زمانے میں جبکہ میرے پاس قطعاً گنجائش نہ تھی، محض ملاقاتوں کے لیے ہی اختیار نہیں کیا تھا۔ حیدر آباد کی سوسائٹی کے متعلق اتنا ہی کہوں گا کہ مجھے آپ کی رائے سے اتفاق ہے--- مَیں نے کب اعلیٰ حضرت نظام کی طرف سے اپنی قدر افزائی کو اپنے لیے سرمایہ افتخار سمجھا ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ مجھے ان باتوں کی مطلق پروا نہیں۔ اگرچہ لوگ بدقسمتی سے مجھے ایک شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں لیکن مَیں شاعر کی حیثیت سے شہرت کا آرزومند نہیں ہوں۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے اطالیہ کی ایک شہزادی کا مکتوب موصول ہوا جس میں اس نے میری چند نظمیں مع انگریزی ترجمہ کے طلب کی تھیں۔ لیکن شاعری کے لیے میرے دل میں کوئی ولولہ موجود نہیں اور آپ اس کی ذمے دار ہیں۔ جب ممالک غیر سے مجھے ایسے مہذب و شائستہ اشخاص کی قدر دانی میسّر آئے تو مجھے ایک دیسی والی ریاست کی قدر دانی کی کیا پروا ہوسکتی ہے، مائی ڈیر مس عطیہ، مجھے غلط مت سمجھیں اور نہ ہی مجھ پر ایسا عتاب فرمائیں جو میری توقع کے خلاف آپ کے مکتوب سے ٹپک رہا ہے۔ آپ نے تمام حقیقت تو سُنی نہیں۔ آپ کو میری ان مشکلات کا جو میری روش کا باعث ہوئی ہیں کچھ اندازہ ہی نہیں۔ میرے روّیہ کی مفصّل تشریح ایک طویل

خط کی طالب ہے جس کی طوالت ناگواری کی حد تک پہنچ جائے گی، اور شاید یہ داستان طویل متعدد خطوط کی طالب ہو، اور ایک نیازنامہ اس کا متحمّل نہ ہوسکے۔ مزید برآں اس حقیقت سے کیسے انکار ہوسکتا ہے کہ کاغذ کے نقوش بے جان سے الفاظ کی آواز زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ کاغذ جذبات انسانی کی حرارت کا کب متحمل ہوتا ہے اور کئی امور ایسے بھی تو ہوتے ہیں جن کا ضبط تحریر میں لانا مناسب نہیں ہوتا۔

میرے روّیوں کو پرکھنے میں اس قدر جلد بازی سے کام مت لیں۔ آپ مجھے دنیائے عمل میں قدم رکھنے اور بک جانے کا الزام دیتی ہیں۔ شاید اس میں حقیقت کا ایک شمہ ضرور موجود ہو لیکن جب آپ پر تمام حالات منکشف ہوں گے تو آپ کو میرے طرز عمل کے لیے وجہ جواز بھی نظر آ جائے گی۔ دیگر حالات سے مَیں اب تک ایک خواب دیکھنے والا ہی ہوں اور بقول آپ کے ایک دوست کے جیساکہ انہوں نے اردو ادب پر اپنے ایک حالیہ مقالے میں مجھے "سُہانے خواب دیکھنے والا" قرار دیا ہے--- ملک کے مختلف حصوں سے تقاضے آ رہے ہیں کہ مَیں اپنی نظموں کو کتابی صورت میں شائع کروں۔ ایک صاحب نے جنہیں آپ سے ملاقات حاصل ہے، اپنی خدمات اس سلسلے میں پیش کی ہیں۔ وہ خود مقدمہ لکھیں گے۔ ہندوستان کے بہترین مطبع میں اسے زیور طبع سے آراستہ کرائیں گے اور جرمنی سے اس کی جلد بندی کروائیں گے، لیکن مجھ میں شاعری کے لیے اب کوئی ولولہ باقی نہیں رہا۔ ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے کسی نے میری شاعری کا گلا گھونٹ دیا ہو اور مَیں محروم تخیل کر دیا گیا ہوں--- شاید حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ پر جن کے مرقد منور کی مَیں نے حال ہی میں زیارت کی سعادت حاصل کی ہے، میری آخری نظم ہوگی۔ مَیں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ نظم لکھنا مجھ پر فرض ہے۔ امید ہے کہ ایک دفعہ یہ نظم مکمّل ہو جائے تو آنے والے وقتوں میں عرصے تک زندہ رہے گی۔"

اقبال نے یہ نظم لکھی، مگر بجائے اردو میں لکھنے کے، انہوں نے یہ نظم فارسی میں لکھی۔ اُن کی شہرۂ آفاق مثنوی "اسرار و رموز" جو آئندہ چند برسوں میں مکمّل ہوئی، اس الہامی کیفیت کا نتیجہ تھی جو شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تربت پر حاضری کے دوران اُن پر طاری ہوئی۔ اقبال نے اس مثنوی میں اپنا بنیادی فلسفہ حیات اور

مسلم قومیت کا نظریہ پیش کیا۔ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے حوالے سے اس مشہور زمانہ مثنوی کے تین ابیات یہاں درج کیے جاتے ہیں:

درمیانِ کار زارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں
برق تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمع دیں در محفل ما بر فروخت
در صف شاہنشہاں یکتا ستے
فقرِ او از تربتش پیدا ستے

Stray Thoughts میں اقبال نے شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کی سیاسی بصیرت و ادراک، مگر ناکافی تجربے کے بارے میں تجزیہ پیش کیا ہے:

"اورنگ زیب کی سیاسی فطانت بغایت ہمہ گیر تھی۔ اس ملک کی مختلف قومیتوں کو ایک عالمگیر سلطنت کے تصور میں شامل کر لینا گویا اس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ لیکن اس امپیریل (ملوکانہ) وحدت کے حصول میں اس نے غلطی سے اپنے غیر متزلزل عزم و ہمت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جس کے پس پشت سیاسی تجربہ ناکافی تھا۔ اپنی متصوّرہ سلطنت کے سیاسی ارتقا میں وقت کے پہلو کو نظرانداز کرکے اس نے ہندوستان کی منتشر اور بے ربط سیاسی وحدتوں کو اپنی ہی زندگی میں مجتمع کر دکھانے کی توقع پر ایک لامتناہی مہم شروع کر دی۔ جس طرح سکندر اعظم پورے ایشیا پر یونان کو مسلّط کرنے میں ناکام رہا۔ اسی طرح وہ بھی ہندوستان بھر کو پرچم اسلام کے تلے نہ لا سکا (مذہبی طور پر نہیں)۔ انگریز، قدیم اقوام کے سیاسی تجربات سے پوری طرح مسلح ہو کر آیا تھا۔ اس کا صبر و تحمل اور کچھوے کا سا استقلال وہاں کامیاب رہا جہاں اورنگ زیب کی جلد باز فطانت ٹھوکر کھا کر رہ گئی تھی۔ عسکری فتح لازماً اتحاد کے ہم معنی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں سابقہ مسلم خاندانوں کی تاریخ نے اورنگ زیب پر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا اقتدار اس ملک کے باشندوں کی خیر خواہی پر اتنا منحصر نہیں (جیساکہ اس کے جدّ اکبر نے سوچا تھا) جتنا کہ خود حکمران قوم کی اپنی طاقت پر مبنی ہے۔ لیکن اپنے گہرے سیاسی شعور کے باوجود وہ اپنے اجداد کے کرتوتوں کے نتائج کو مٹا

نہ سکا۔ سیواجی، اورنگ زیب کے عہد کی پیداوار نہیں تھا۔ اس کا وجود ان معاشرتی اور سیاسی عوامل کا رہین منت ہے جو اکبر کی حکمت عملی سے ظہور میں آئے۔ اورنگ زیب کا سیاسی فہم و ادراک صائب ہونے کے باوجود، بعد از وقت ثابت ہوا۔ تاہم اس سیاسی بصیرت کی اہمیت کے پیش نظر، اسے ہندوستان میں مسلم قومیّت کا بانی قرار دینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسلیں میرے اس قول کی صداقت کو تسلیم کریں گی۔"

تاریخ ہند میں اورنگ زیب عالمگیرؒ کا تاریخی کردار خصوصیت کے ساتھ ہند میں مسلم قومیت کے احیاء کے ضمن میں اقبال کے ذہن و فکر پر چھایا رہا اور اس سال کے آخر میں انہوں نے علی گڑھ کالج میں اپنے مشہور لیکچر "ملّتِ بیضا پر ایک عُمرانی نظر" میں ایک دوسرے زاویئے سے اس موضوع پر روشنی ڈالی (لیکچر انگریزی میں تھا جس کا ترجمہ ظفر علی خان نے عنوان بالا کے تحت کیا)۔ فرماتے ہیں:

"--- سیرت کے وہ مختلف نمونے جنہیں ایک قوم پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے بخت و اتفاق کی کورانہ قوتوں ہی کا ماحصل نہیں ہیں۔ زمانۂ حال کا علم عمرانیات ہمیں یہ نکتہ سکھاتا ہے کہ قوموں کا اخلاقی تجربہ خاص خاص قوانین معیّنہ کا تابع ہوا کرتا ہے۔ زمانہ قبل تاریخ میں جبکہ زندہ رہنے کے لیے انسان کو سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی اور دماغی قابلیتوں کے مقابلے میں وہ جسمانی قوتوں سے زیادہ کام لیتا تھا تو اسی شخص کی سب تعریف و تقلید کرتے تھے جو شجاع ہوتا تھا۔ جب جُہد للبقا کی کشمکش فرو ہوئی اور خطرہ زائل ہوگیا تو دَور شجاعت گیا اور باصطلاح گڈ نگس دَورِ مروّت آیا جس میں جرأت و دلاوری اگرچہ پھر بھی مستحسن سمجھی جاتی تھی لیکن انسانی سیرت کا ہر دلعزیز اور عام پسند نمونہ وہ شخص متصوّر ہوتا تھا جو نشاط عمر کی ہر صنف کا رسیا ہو اور فیاضی و ایثار اور ہم نوالگی و ہم پیالگی کے گوناگوں اوصاف سے متصّف ہو۔ لیکن چونکہ ان دونوں اسالیب کا میلان غلو و افراط کی جانب تھا، لہٰذا ان کے عمل کا ردّ ایک تیسرے نمونہ یا اُسلوب نے کیا جس کی غایت الغایات ضبط نفس ہے اور جو زندگی پر زیادہ متانت و تقشّف کے ساتھ نظر ڈالتا ہے۔ ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اُسلوبِ اوّل کا مظہر نظر آتا ہے۔ بابر اسالیب اول و دوم

کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔ جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے، اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے مبری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں، اُسلوبِ ثالث کا چہرہ کُشا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جنھوں نے عالمگیر کے حالات تاریخ ہند کے مغربی شارحین کی زبانی سُنے ہیں، عالمگیر کا نام سفاکی و قساوت، جبر و استبداد، مکاری و غداری اور پولیٹیکل سازشوں اور منصوبوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ خلط مبحث کا خوف مانع ہے ورنہ مَیں متعاصرانہ تاریخ کے واقعات کی صحیح تعبیر و تفسیر سے ثابت کرتا کہ عالمگیر کی پولیٹیکل زندگی کی وجوہ تحریک سراسر جائز و حق بجانب تھیں۔ اس کے حالات زندگی اور اس کے عہد کے واقعات کا بنظر انتقاد مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یقین واثق ہوگیا ہے کہ جو الزامات اس پر لگائے جاتے ہیں وہ واقعات متعاصرہ کی غلط تعبیر اور اُن تمدّنی و سیاسی قوتوں کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جو اُن دنوں سلطنت اسلام کے طول و عرض میں عمل کر رہی تھیں۔ میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اُسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے، اور ہماری تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔"

حیدر آباد میں مختصر قیام کے دوران اقبال سر اکبر حیدری کے ہمراہ ایک چاندنی شب کو وہاں کے شاہی قبرستان میں گئے۔ اس منظر نے انہیں ازحد متاثر کیا اور اس کا نتیجہ ان کی نظم "گورستان شاہی" کی تخلیق تھی جو "مخزن" کے شمارہ جون ۱۹۱۰ء میں اقبال کے اس تعارفی نوٹ کے ساتھ چھپی:

"مجھے ایک شب مسٹر حیدری اُن شاندار مگر حسرت ناک گنبدوں کی زیارت کے لیے لے گئے جن میں سلاطین قطب شاہی سو رہے ہیں۔ رات کی خاموشی، ابر آلود آسمان اور بادلوں میں چھن کے آتی ہوئی چاندنی نے اس پُرحسرت منظر کے ساتھ مل کر میرے دل پر ایسا اثر کیا جو کبھی فراموش نہ ہو گا۔ یہ نظم اس یادگار واقعہ کے تاثرات کا اظہار کرتی ہے۔"

Stray reflections کے بعض ٹکڑے ان نازک ایّام میں اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے ہیں۔ بعض افکار آئندہ تخلیقات کے ابتدائی

نقوش پیش کرتے ہیں۔ اس لیے جستہ جستہ چند اقتباسات کا ترجمہ شذرات فکر اقبال کے حوالے سے یہاں پیش کیا جاتا ہے:

فن اور فن کار

☆ "سائنس، فلسفہ، مذہب، ان سب کی حدیں معیّن ہیں، صرف فن ہی لامحدود ہے۔" (صفحہ ۱۷۰)

☆ "فلسفہ، انسانی عقل کی خنک تیرگی میں ٹھٹھرتے ہوئے تجربات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ شاعر آتا ہے اور اپنے سوزِ دل سے انہیں گرما کر واقعیّت میں بدل دیتا ہے۔" (صفحہ ۱۴۹)

☆ "قومیں شعرا کے دلوں میں جنم لیتی ہیں اور سیاست دانوں کے ہاتھوں میں پلتی اور مرجاتی ہیں۔" (صفحہ ۱۴۸)

☆ "روح ارضی اپنی داخلی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو علامات کے پردوں میں چھپا لیتی ہے۔ کائنات ایک عظیم علامت کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن وہ ہمارے لیے ان علامات کی توجیہ و تعبیر کی زحمت گوارا نہیں کرتی۔ یہ فرض شاعر کے ذمے عائد ہوتا ہے کہ ان کی توجیہ کرے اور انسان پر ان کا مفہوم واضح کر دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اور روح ارضی باہم مدمقابل ہیں، کیونکہ جو کچھ یہ چھپاتی ہے، اسے وہ ظاہر کر دیتا ہے۔" (صفحہ ۱۳۹)

☆ "مَیں اعتراف کرتا ہوں کہ مَیں نے ہیگل، گوئٹے، مرزا غالب، عبدالقادر بیدل اور ورڈزورتھ سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے۔ ہیگل اور گوئٹے نے اشیاء کی باطنی حقیقت تک پہنچنے میں میری رہنمائی کی۔ بیدل اور غالب نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود، اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھوں اور ورڈزورتھ نے طالب علمی کے زمانے میں مجھے دہریت سے بچا لیا۔" (صفحہ ۱۰۵)

☆ "شیکسپیئر اور گوئٹے دونوں تخلیق کے تصوّرِ ایزدی پر باز فکر کرتے ہیں۔ لیکن ان کے درمیان ایک اہم فرق ہے۔ واقعیت پسند انگریز "انفس" کی باز فکر کرتا ہے

اور عینیت پسند جرمن "آفاق" کی۔ گوئٹے کا "فاؤست، محض برائے نام فرد ہے۔ درحقیقت وہ انسانیت کی تجسیم ہے۔" (صفحہ ۱۵۹)

☆ "ترشے ہوئے ہیروں جیسے آب دار لفظوں میں حافظ نے بُلبُل کی غیر شعوری روحانیت کی مٹھاس بھر دی ہے۔" (صفحہ ۱۶۷)

شخصیّت (اَنا، خودی) کے ابتدائی نقوش

☆ "شخصیّت کی بقا کوئی کیفیت نہیں بلکہ ایک طریق عمل ہے۔ میرا خیال ہے کہ روح و بدن کی تفریق نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ کئی مذہبی نظام اسی باطل تفریق پر مبنی ہیں۔ انسان اصلاً ایک توانائی، ایک قوت یا قوتوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے عناصر کی ترتیب میں اختلاف کی گنجائش ہے۔ ان قوتوں کی ایک مخصوص ترتیب کا نام شخصیّت ہے۔ یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ آیا یہ ترتیب محض اتفاقی ہے۔ مَیں اسے فطرت کے حقائق میں سے ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتا ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں کہ کیا قوتوں کی یہ مخصوص ترتیب جو ہمیں اتنی عزیز ہے، بعینہٖ قائم رہ سکتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ قوتیں جس طرح زندہ، صحت مند شخصیت میں عمل پیرا ہیں، اسی رُخ پر ان کا عمل جاری رہے؟ مَیں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ممکن ہے۔ انسانی شخصیت کو ایک دائرہ فرض کیجئے اور یوں سمجھئے کہ قوتوں کی ایک خاص ترتیب کے نتیجے میں ایک معین دائرہ تشکیل پاتا ہے اور ان کی ترتیب میں خلل پیدا ہونے سے وہ دائرہ مٹ جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس دائرے کے تسلسل کو ہم کس طرح محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ بظاہر اس کی صورت یہی ہے کہ ہم اپنی شخصیت کو کچھ اس طرح تقویت پہنچائیں کہ اس کے قوائے ترکیبی کو اپنے مقررہ معمول کے مطابق عمل کرنے میں مدد ملے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ فعلیت کی ان تمام صورتوں سے دست بردار ہو جائیں جو شخصیت کو تحلیل کرنے پہ مائل ہوں، مثلاً عجز و انکسار، قناعت، غلامانہ تابعداری وغیرہ۔ ان کے برخلاف بلند حوصلگی، عالی ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات و قوت پر جائز فخر، ایسی چیزیں ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔

شخصیّت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے، لہٰذا اسی کو خیر مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدرو قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔ اگر ہم وہ طرز زندگی اختیار کریں جس سے شخصیت کو تقویت پہنچے، تو دراصل ہم موت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ موت، جس کی ضرب سے ہماری شخصیت کی اندرونی قوتوں کی ترتیب گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ پس شخصیت کی بقا ہمارے اپنے اختیار میں ہے۔ اس کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ یہ خیال جو یہاں پیش کیا گیا ہے، دور رس نتائج کا حامل ہے۔ کاش اس نقطۂ نظر سے اسلام، بدھ مت اور عیسائیت کی تقابلی حیثیت پر بحث کرنے کا مجھے موقع میسّر آتا، لیکن بدقسمتی سے اس مسئلے کی تفصیلات کا جائزہ لینے کی مجھے فرصت نہیں۔" (ص ۲۶-۷۸)

☆ "ضبطِ نفس افراد میں ہو تو خاندانوں کی تعمیر ہوتی ہے، قوموں میں ہو تو سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔" (صفحہ ۱۳۶)

☆ "قوت میں صداقت سے زیادہ الوہیت ہے۔ خدا قوی ہے، تو بھی اپنے آسمانی باپ کی طرح قوی ہو جا۔"

☆ "☆ قوی انسان ماحول تخلیق کرتا ہے۔ کمزوروں کو ماحول کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا پڑتا ہے۔" (ص ۱۳۲)

☆ "فلسفہ حق کی منطق ہے اور تاریخ طاقت کی منطق۔ لیکن مؤخر کے احکام و اصول، مقدم کے احکام و اصول سے زیادہ معقول ہوتے ہیں۔" (ص ۸۹)

عرب کا سوز، عجم کا ساز (اسلامی تہذب)

☆ "اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ تاریخ اسلام کا اہم ترین واقعہ کون سا ہے تو مَیں بے تامل کہوں گا: "فتح ایران"۔ نہاوند کی جنگ نے عربوں کو ایک حسین ملک کے علاوہ ایک قدیم تہذیب بھی عطا کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک ایسی قوم سے روشناس ہوئے جو سامی اور آریائی عناصر کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب کو جنم دے سکتی تھی۔ ہماری مسلم تہذیب، سامی اور آریائی تصورات کی پیوند کاری کا حاصل ہے۔

گویا یہ ایسی اولاد ہے جسے آریائی ماں کی نرمی و لطافت اور سامی باپ کے کردار کی پختگی و صلابت ورثے میں ملی ہے۔ فتح ایران کے بغیر اسلامی تہذیب یک رخی رہ جاتی۔ فتح ایران سے ہمیں وہی کچھ حاصل ہوگیا جو فتح یونان سے رومیوں کو ملا تھا۔" (ص ۱۰۱)

مسلمانوں کی تہذیبی و علمی تاریخ (ورثہ)

☆ "مسلم قوم کی تاریخ پر آپ جتنا غور کریں گے، اتنا ہی اسے حیرت انگیز پائیں گے۔ ابتدائی دَور سے سولہویں صدی کے آغاز تک--- پورے ایک ہزار سال--- یہ توانا نسل (مَیں نسل اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اسلام نے ایک نسل ساز قوت کا کردار ادا کیا ہے) سیاسی توسیع کے ہمہ جاذب مشغلے میں پیہم منہمک رہی ہے۔ تاہم مسلسل جدوجہد کے اس طوفانی دور میں بھی، اس حیرت انگیز قوم نے بڑے بڑے تہذیبی کارنامے انجام دینے کے لیے، کافی موقع نکال لیا۔ اس نے قدیم علوم کے مدفون خزانوں کو باہر نکالا اور محفوظ کیا۔ ان میں ٹھوس اضافے کیے۔ ایک منفرد نوعیت کا ادب تخلیق کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مکمّل نظام قانون مرتب کیا، جو ہمارے لیے مسلم فقہا کا سب سے قیمتی ورثہ ہے۔" (صفحہ ۱۳۷)

قومی عصبیت، مسلم قومیت کا نظریہ اور وطن پرستی

☆ "تمام قومیں ہم پر عصبیت کا الزام لگاتی ہیں۔ مجھے یہ الزام قبول ہے، بلکہ مَیں یہ بھی کہتا ہوں کہ ہم اپنی عصبیت میں حق بجانب ہیں۔ حیاتیات کی زبان میں، عصبیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اصول فردیت، بجائے فرد واحد کے، ایک جماعت پر عمل کرتا ہے۔ اس مفہوم میں حیات کی تمام صورتیں کم و بیش متعصّبانہ ہوتی ہیں، اور اگر انہیں اپنے اجتماعی وجود کی کچھ پروا ہے تو انہیں ایسا ہی ہونا چاہیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ساری قومیں متعصّب ہیں۔ کسی انگریز کے مذہب پر تنقید کیجئے تو اس پر کوئی اثر نہ ہوگا، لیکن ذرا اس کی تہذیب، اس کے ملک یا عملی سرگرمیوں کے کسی دائرے میں اس کے قومی شعار پر نکتہ چینی کیجئے تو اس کا اندرونی تعصّب ظاہر ہو جائے گا۔ بات یہ ہے کہ اس کی قومیت کا انحصار مذہب پر نہیں بلکہ ایک جغرافیائی بنیاد یعنی اس کے ملک

پر ہے۔ لہٰذا جب آپ اس کے ملک پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو بجا طور پر اس کا جذبۂ عصبیت برانگیختہ ہو جاتا ہے۔ ہماری حیثیت اصلاً اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری قومیت محض ایک تصور ہے جس کی کوئی مادی بنیاد نہیں۔ حیات و کائنات کے ایک خاص نظریے کے بارے میں ایک طرح کا ذہنی سمجھوتہ ہی ہمارا واحد نقطۂ اجتماع ہے۔ اب اگر مذہب پر تنقید ہماری عصبیت کو برانگیختہ کر دیتی ہے تو مَیں سمجھتا ہوں کہ اس معاملے میں ہم اسی طرح حق بجانب ہیں جیسے وہ انگریز جس کی تہذیب کو مطعون کیا جائے۔ احساس کی نوعیت دونوں حالتوں میں یکساں ہے، اگرچہ اس کا تعلق مختلف چیزوں سے ہے۔ عصبیت، دینی وطن پرستی ہے اور وطن پرستی، ملکی عصبیت۔"

☆ "اسلام کا ظہور بُت پرستی کے خلاف ایک احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے۔ وطن پرستی بھی بت پرستی کی ایک نازک صورت ہے۔ مختلف قوموں کے وطنی ترانے میرے اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ وطن پرستی ایک مادی شے کی پرستش سے عبارت ہے۔ اسلام کسی صورت میں بت پرستی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ بت پرستی کی تمام اقسام کے خلاف احتجاج کرنا ہمارا ابدی نصب العین ہے۔ اسلام جس چیز کو مٹانے کے لیے آیا تھا اسے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا بنیادی اصول قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پیغمبر اسلامؐ کا اپنی جائے پیدائش مکہ سے ہجرت فرما کر مدینے میں قیام اور وصال، غالباً اسی حقیقت کی طرف ایک مخفی اشارہ ہے۔" (صفحہ ۸۱۔۸۳)

☆ "اسلام اور وطن پرستی کے بارے میں جو کچھ پہلے لکھ چکا ہوں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے ملّی اتحاد کا انحصار اس بات پر ہے کہ مذہبی اصول پر ہماری گرفت مضبوط ہو۔ جونہی یہ گرفت ڈھیلی پڑی ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔ شاید ہمارا وہی انجام ہو جو یہودیوں کا ہوا۔ اس گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کسی معاشرے میں مذہب کا سب سے بڑا امین و محافظ کون ہوتا ہے؟ عورت ہوتی ہے۔ مسلم خواتین کو صحیح مذہبی تعلیم حاصل ہونی چاہیے کیونکہ وہی قوم کی حقیقی معمار ہیں۔ مَیں آزاد نظام تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم بھی دیگر امور کی طرح قومی ضروریات کے تابع ہوتی ہے۔ ہمارے مقاصد کے پیش نظر، مسلم بچیوں کے لیے مذہبی تعلیم بالکل کافی ہے۔ ایسے تمام مضامین جن میں عورت کو نسوانیت اور دین سے محروم کر دینے کا

میلان پایا جائے، احتیاط کے ساتھ تعلیم نسواں کے نصاب سے خارج کر دیے جائیں۔ لیکن ہمارے ماہرین تعلیم اب بھی اندھیرے میں ٹٹول رہے ہیں۔ انہیں اب تک لڑکیوں کا نصاب تعلیم مقرر کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ شاید مغربی تصورات کی چمک دمک سے اُن کی آنکھیں اتنی خیرہ ہوگئی ہیں کہ وہ اسلامیت اور مغربیت کے اس واضح فرق کو بھی نہیں سمجھتے کہ ایک طرف اسلامیت، خالصتاً ایک مجرّد تصور یعنی مذہب کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر کرتی ہے، دوسری طرف مغربیت ہے جس کے تصور قومیت کی روح ایک مادی شے یعنی ملک ہے۔" (صفحہ ۸۵، ۸۶)

اقبال نے اس سال "گورستان شاہی" کے علاوہ کچھ اور نظمیں بھی کہیں۔ "فلسفۂ غم" اپنے قدیم دوست اور گورنمنٹ کالج کے ہم جماعت میاں فضل حسین بیرسٹر ایٹ لا کے والد کے انتقال پر کہی اور "مخزن" جولائی ۱۹۱۰ء میں چھپی۔ "رات اور شاعر" پنجاب ریویو، ستمبر ۱۹۱۰ء میں چھپی۔ وطنیت اور ترانہ ملّی بھی غالباً اسی سال لکھی گئیں۔

دسمبر ۱۹۱۰ء میں اقبال نے علی گڑھ کالج میں The Muslim Community A Sociological Study کے موضوع پر خطبہ دیا جس کا ترجمہ مولوی ظفر علی خاں نے "ملّتِ بیضا پر ایک عُمرانی نظر" کے عنوان سے کیا اور برکت علی اسلامیہ ہال میں سنانے کے علاوہ پنجاب ریویو (مارچ، اپریل ۱۹۱۱ء) میں شائع کیا۔ یہ خطبہ بھی فکر اقبال میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا شذرات کے بعض حصے اس میں شامل ہیں۔ اس خطبے میں اقبال ایک واضح قومی نقطۂ نظر لے کر منظر عام پر آتے ہیں۔

۱۹۱۱ء

اقبال کا ایک مضمون Political Thought in Islam "ہندوستان ریویو" (۱۰-۱۹۱۱ء) میں شائع ہوا۔

یہ سال اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا اور جذباتِ ملّی کی ترجمانی کے لحاظ سے فیصلہ کُن کہا جاسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ علی گڑھ کے بعد انہوں نے خدمت قومی کے میدان میں اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کے ساتھ سرگرم عمل ہونے کا قطعی

فیصلہ کر لیا۔ حالات بڑی تیزی کے ساتھ بدل رہے تھے۔ تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی پُرزور تحریک کے نتیجے میں اس تقسیم کو منسوخ کر دیا گیا۔ یہ واقعہ ہندی مسلمانوں کے لیے ایک ضربِ شدید تھا۔ وہ دو راہے پر کھڑے آئندہ کے راہ عمل کے بارے میں رہنمائی کے خواہاں تھے۔ استعمار مغرب کے شکنجے میں جکڑے ہوئے مسلمانوں کی زبوں حالی کا نقشہ ہر جگہ یکساں تھا۔ تعلیمی لحاظ سے وہ پسماندہ تھے۔ سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے وہ سامراجی محکومی کی ایڑیوں تلے پس رہے تھے۔ برائے نام آزاد مسلم ممالک بھی تباہی کے کنارے پر کھڑے ڈانواں ڈول تھے۔ وسط ایشیا کی مسلم ریاستیں زار روس کا نوالہ تر بن چکی تھیں۔ ایران کو روسی اور برطانوی حلقہ اثر میں تقسیم کیا جا چکا تھا۔ مصر اور افغانستان پہلے ہی برطانوی تسلّط میں آ چکے تھے۔ یورپ کی عیسائی طاقتیں عثمانی سلطنت کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کی تکمیل کر کے مسئلہ شرق کو ہمیشہ کے لیے حل کرنے پر تُلی ہوئیں تھیں۔ اطالیہ نے پہل کی اور ۱۹۱۱ء میں طرابلس الغرب (لیبیا) پر حملہ کر دیا۔ بلقانی ریاستوں نے مغربی طاقتوں کے تعاون سے یورپی ترکی پر ہلہ بول دیا۔ ادرنہ کا محاصرہ کر لیا گیا اور استانبول خطرے میں گر گیا۔ تمام استعماری طاقتیں (برطانیہ، فرانس، روس) حملہ آوروں کی پشت پناہی کر رہی تھیں اور بعض طاقتوں نے تو جنگ بلقان کو صلیبی جنگ قرار دے دیا۔ اس الم انگیز صورت حال نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو ازحد متاثر کیا۔ اس یاس انگیز منظر میں اقبال کے شعری افکار نے ایک نئی کروٹ لی۔ انہوں نے اپنی مشہور نظم "شکوہ" لکھ کر انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ اپریل ۱۹۱۱ء میں سنائی اور رقت کا سماں پیدا کر دیا (یہ نظم ہاتھوں ہاتھ بکی اور انجمن کے لیے کثیر سرمایہ جمع ہوگیا) اگلے سال (۱۹۱۲ء میں) اس نظم کا دوسرا حصہ "جواب شکوہ" تخلیق ہوا، اور اسے موچی دروازہ کے ایک خصوصی اجلاس میں سنایا گیا۔

ان دو نظموں کے علاوہ اقبال نے جنگ طرابلس و بلقان کے حوالے سے کئی اور مؤثر اردو نظمیں لکھ کر اس الم انگیز دَور کے احساسات کی مرّقع کشی کی۔ "غرۂ شوال" زوال اسلامیان عالم پر نظم غم و الم سے لبریز ہے جو "زمیندار" کے خصوصی عید نمبر اور مخزن (اکتوبر ۱۹۱۱ء) میں شائع ہوئی۔ "عندلیب حجاز کی نذر" یا "حضور رسالت مآب ؐ میں"

۶ اکتوبر ۱۹۱۱ء کو تاریخی بادشاہی مسجد لاہور میں سنائی گئی۔

مثنوی "اَسرارِ خودی" کا آغاز بھی اسی سال میں ہوا، مگر وہ اسے تسلسل سے جاری نہ رکھ سکے۔ اس بارے میں اقبال ۷ جولائی ۱۹۱۱ء کو عطیہ بیگم کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"قبلہ والد صاحب نے فرمائش کی ہے کہ حضرت بو علی قلندرؒ کی مثنوی کی طرز پر ایک فارسی مثنوی لکھوں۔ اس راہ کی مشکلات کے باوجود مَیں نے کام شروع کر دیا ہے۔ تمہیدی بند ملاحظہ فرمایئے:

نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن
بزم را از ھائے و ھو آباد کُن
آتش استی بزمِ عالم بر فروز
دیگراں را ھم ازیں آتش بسوز
سینہ را سر منزلِ صد نالہ ساز
اشک خونین را جگر پرکالہ ساز
پشت پا بر شورشِ دنیا بزن
موج ء بیرون ایں دریا بزن

بقیہ اشعار حافظے سے اُتر گئے ہیں۔ امید ہے عدالت سے واپسی پر یاد آ جائیں گے۔ دس بج چکے ہیں، مجھے جانا ہوگا۔ ایک تازہ غزل جو "ادیب" میں شائع ہوتی ہے، ملفوف ہے۔"

یہ امر قابل ذکر ہے کہ خود حضرت بو علی قلندر کی مثنوی مولانا جلال الدین رومی کی مثنوی معنوی کی پیروی میں لکھی گئی تھی۔ ایک اور بات کا تذکرہ یہاں دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، جیساکہ بعد میں اقبال نے تمکین کاظمی کے نام مکتوب میں لکھا ہے (مکتوب محررہ ۱۶ اگست ۱۹۲۸ء)

"مَیں نے خود اسرار خودی پہلے اردو میں لکھنی شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا اُس کو تلف کر دیا گیا۔"

لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کو اقبال اپنا خراج تحسین گذشتہ سال علی گڑھ کالج

کے خطبے میں پیش کرچکے تھے۔ اسی دوران اکبر الٰہ آبادی سے ان کی خط کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان مکتوبات میں اقبال کا جذبۂ عقیدت مندی اور تمنائے قلبی کا اظہار قابل دید ہے۔ اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا کے مطالعے میں یہ تحریریں ازبس اہم ہیں، کیونکہ ان میں اقبال نے اپنا درد دل کھول کر بیان کیا ہے:

"مَیں آپ کو اُسی نگاہ سے دیکھتا ہوں جس نگاہ سے کوئی مُرید اپنے پیر کو دیکھے اور وہی محبت و عقیدت اپنے دل میں رکھتا ہُوں۔ خدا کرے وہ وقت جلد آئے کہ مجھے آپ سے شرفِ نیاز حاصل ہو اور مَیں اپنے دل کو چیر کر آپ کے سامنے رکھ دوں۔ لاہور ایک بڑا شہر ہے لیکن مَیں اِس ہجوم میں تنہا ہوں۔ ایک فردِ واحد بھی ایسا نہیں جس سے دل کھول کر جذبات کا اظہار کیا جا سکے۔" (مکتوب، ٦ اکتوبر ۱۹۱۱ء)

اسی مکتوب میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

"ناتمام نظم کے اشعار آپ نے پسند فرمائیے۔ مجھے یہ سُن کر مسرّت ہوتی ہے کہ آپ میرے اشعار پسند فرماتے ہیں۔ "غرۂ شوال" پر چند اشعار لکھے تھے۔ "زمیندار" اخبار کے عید نمبر میں شائع ہوئے۔ ان کو ضرور ملاحظہ فرمائیے۔ مَیں نے چند اشعار آخر میں ایسے لکھے ہیں کہ ٹرکی و اٹلی کی جنگ نے ان کی تصدیق کر دی ہے اور وہ چند (منتخب) اشعار یہ ہیں:

قافلے دیکھ، اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ
رہرو درماندہ کی منزل سے بیزاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ
بت کدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ
مکر کے پھندے میں شہباز مراقش آ گیا
امت عیسیٰ کا آئین جہانداری بھی دیکھ
ساز عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سُن
اور ایراں میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ
چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ، اَوروں کی عیاری بھی دیکھ

صورت آئینہ سب کچھ دیکھ، اور خاموش رہ
شورش امروز میں محو سرود دوش رہ

۹ نومبر ۱۹۱۱ء کے مکتوب میں اقبال اکبر الٰہ آبادی کو لکھتے ہیں:

"ترکوں کی فتح کا مژدۂ جانفزا پہنچا۔ مسّرت ہوئی، مگر اس کا کیا علاج کہ دل کو پھر بھی اطمینان نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں روح کیا چاہتی ہے اور آنکھوں کو کس نظارے کی ہوس ہے۔ مَیں ایک زبردست تمنّا کا احساس اپنے دل میں کرتا ہوں۔ گو اس تمنا کا موضوع مجھے اچھی طرح سے معلوم نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے مسرت بھی ہو تو اس میں اضطراب کا عنصر غالب رہتا ہے۔"

۱۹۱۲ء

۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسے میں اپنی تاریخ ساز نظم "شمع و شاعر" سنائی۔ یہ نظم ملّتِ اسلامیہ کی اُس وقت کی صورت حال کے فکر انگیز تجزیے، خود شناسی کے احساس و پیغام اور اپنے رجائی نقطہ نظر کے اعتبار سے اقبال کے فکر و فن میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

یہ نظم بھی جنگ طرابلس اور بلقان کے دوران لکھی گئی جب ٹرکی مغربی طاقتوں کے شدید دباؤ میں تھا۔ مگر اس دَور اور اسی پس منظر میں لکھی جانے والی دوسری نظموں اور اس نظم میں جذبے و احساس اور فکر و فن کے لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ دوسری نظموں میں بقول پروفیسر شکور احسن "عالم اسلام کے زوال و انحطاط پر گہرے غم و الم اور تلخی و غصے کا اظہار ہوا ہے۔ اقبال نے "شکوہ" کا اختتام جہاں اس دعا پر کیا ہے کہ رحمت باری تعالیٰ امت مرحوم کی مشکلات آساں کر دے وہاں شاعر اپنے آپ کو اس اجڑے ہوئے چمن میں ایک بلبل تنہا قرار دے کر اپنے پُرسوز نغموں سے سینہ کاوی کر رہا ہے۔ اس کے برعکس شمع و شاعر تاریک ماحول میں بے پناہ رجائیت کی حامل ہے اور شاعر کے اس غیر متزلزل ارادے کی مظہر ہے کہ ملّت کے مقاصد اور اس کے احیا و بقا کی جدوجہد میں اپنے آپ کو وقف کر دے۔"

"شمع و شاعر" اردو میں تمثیلی انداز کی طویل نظم بصورت ترکیب بند ہے جس

کی تکمیل کا مہینہ اور سال (فروری ۱۹۱۲ء) خصوصیت سے اقبال نے بانگ درا میں واضح کیا ہے۔ اقبال کی چند اہم ترین نظموں کی طرح یہ نظم بھی مکالمے کے انداز میں ہے۔ یہ مکالمہ شاعر (جو غمزدہ ہے) اور "شمع" جو خود علامتی کردار ہے اور سوزدروں اور نور ہدایت کی علامت ہے۔ شمع، شاعر کو غمزدہ اور بے عمل دیکھ کر اسے راہِ عمل بجھاتی ہے:

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھے
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ بے صہبا ترا

ایک دوسرے شعر میں شاعر نہ صرف شاعری کو پیغمبری کے مقام بلند تک پہنچا دیتا ہے بلکہ اپنے اس عزم کا بھی عہد کرتا ہے کہ وہ مفکّر رہنما بن کر اپنا فرض انجام دے گا۔ یہاں پھر شمع اسے یہ مشورہ دیتی ہے:

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سنا دے محفلِ ملّت کو پیغام سروش

شمع کی زبان سے یہ طنزیہ اشعار بھی شاعر کے احساس و فکر کے لیے تازیانے کا کام دیتے ہیں:

اب نوا پیرا ہے کیا؟ گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنّم، نغمہ بے موسم ترا
پھول بے پروا ہیں، تُو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے، آواز درا ہو یا نہ ہو

اور پھر اس طنزیہ زجر و توبیخ کے بعد "شمع" خود بھی سوز دروں میں ڈوب کر اظہار افسوس پر اُتر آتی ہے:

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مگر چونکہ شاعر کا مقصد یہاں زوال امت پر آنسو بہانا نہیں تھا اور نہ شکوے اور جواب شکوہ کا مرحلہ درپیش تھا، اس لیے اب غم و الم کی شب تاریک کی تصویر کھینچنے کے بعد شمع کی زبانی ہی رجائیت کی نوید سحر کا منظر سامنے آ جاتا ہے:

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی!

ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی!

یہاں سے نظم ایک نیا انداز اختیار کر لیتی ہے اور شمع ہی کی زبانی مژدۂ بیداری، پیغام خود اعتمادی اور حُریّت و آزادی کا درس جاں فزا دیا جاتا ہے اور آخر میں شاعر شمع ہی کے توسّط سے اس دور مسرت و شادمانی کے بارے میں پیش گوئی کرتا ہے جو بظاہر اس وقت کے تیرہ و تار ماحول میں عجیب معلوم ہوتی ہے--- مگر یہی تو وہ مقام ہے جہاں شاعری "جزویست از پیغمبری" بن جاتی ہے:

آسماں ہو گا سحر کے نُور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گُل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

اس سال کی چند اور نظموں کا حوالہ بھی یہاں قابل ذکر ہے۔ مسلم، نوید صبح، فاطمہ بنت عبداللہ، محاصرۂ ادرنہ، یہ نظمیں بھی اس تاریک تریں دور میں "شمع و شاعر" کی طرح عالم اسلام کے لیے امید افزا پیغام اور ان کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی سے معمور ہیں۔ مثلاً یہ اشعار:

ہاں یہ سچ ہے، چشم بر عہد کُہن رہتا ہوں مَیں
اہل محفل سے پُرانی داستاں کہتا ہوں میں
یاد عہدِ رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے
میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے
سامنے رکھتا ہوں اُس دورِ نشاط افزا کو مَیں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو مَیں

("مسلم" - بانگ درا، صفحہ ۲۱۷)

مسلم خوابیدہ اُٹھ! ہنگامہ آرا تُو بھی ہو
وہ چمک اُٹھا اُفق گرمِ تقاضا تُو بھی ہو

("نویدِ صبح" - بانگ درا، صفحہ ۲۳۶)

"فاطمہ بنت عبداللہ" بھی اسی دَور کی ایک نظم ہے جس میں طرابلس میں جنگ کے دوران ایک ننھی سی معصوم بچّی کی شہادت کے واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ فاطمہ بنت عبداللہ میدان کارزار میں زخمی غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوگئی تھی۔ شاعر نے نہ صرف اس معصوم لڑکی کی جرأت و بہادری اور شہادت کے واقعہ کو نظم کرکے اسے زندۂ جاوید بنا دیا ہے بلکہ اس عظیم قربانی سے ایک نئی سحر کے طلوع ہونے اور ایک نئی قوم کے اُبھرنے کی خوشخبری بھی سنائی ہے:

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمہ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تُربتِ خاموش میں
پَل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں

(بانگ درا، صفحہ ۲۳۹- ۲۴۰)

اقبال کی نجی زندگی میں چند سال قبل جو ایک جذباتی ہیجان اور بے چینی و اداسی طاری ہوئی تھی جس کا تذکرہ عطیہ بیگم کے نام خطوط میں گذشتہ صفحات پر آ چکا ہے، اس عرصے میں دُور ہوچکی تھی۔ اقبال کی دوسری شادی لدھیانہ کے نولکھا خاندان میں رواں سال میں ہوئی۔ دراصل یہ ان کا تیسرا نکاح تھا۔ اس سے پہلے دوسرا نکاح اندرون موچی دروازہ کے ایک کشمیری خاندان میں ہوا تھا لیکن رخصتی نہ ہوئی تھی اور غلط فہمیوں کی وجہ سے یہ مسئلہ دو سال سے زائد عرصے تک التواء میں رہا اور بالآخر اگلے سال (۱۹۱۳ء میں) یہ معاملہ خوش اسلوبی سے اپنے نیک انجام کو پہنچا۔ اس طرح اقبال کی نجی زندگی کا پریشان کُن مسئلہ اطمینان بخش طور پر حل ہوگیا۔ مہاراجہ کشن پرشاد کے نام ایک مکتوب میں اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں:

"خود تین بیویاں رکھتا ہوں اور دو اولادیں۔ تیسری بیوی آپ کے تشریف لے جانے کے کچھ عرصہ بعد کی (یعنی ۱۹۱۳ء میں)۔ ضرورت نہ تھی مگر یہ عشق و محبت کی ایک عجیب داستان ہے۔ اقبال نے گوارا نہ کیا کہ جس عورت نے حیرت ناک ثابت قدمی کے ساتھ تین سال تک اُس کے لئے طرح طرح کے مصائب اٹھائے ہوں، اُسے اپنی بیوی نہ بنائے۔ کاش! دوسری بیوی کرنے سے پیشتر یہ حال معلوم ہوتا۔"
(محررہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

۱۹۱۳ء

شعری تخلیق کے سلسلے میں اس سال کچھ تعطّل رہا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں بھی اقبال نے معمول کے خلاف کوئی نظم نہ پڑھی۔ ممکن ہے وہ اس دوران اپنی فارسی مثنوی کے بارے میں متفکّر رہے ہوں۔ خواجہ حسن نظامی کے نام اس زمانے کا ایک اہم مکتوب ہے (اس خط پر تاریخ درج نہیں، لیکن اندازاً یہ اسی زمانے کا خط ہے) اقبال اس میں شکایت کے طور پر ہندی مسلمانوں کی بیداری کے سلسلے میں اپنی پوزیشن واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مسلمانان ہندوستان کی بیداری کے پانچ اسباب جو آپ نے اِس ہفتہ کے "توحید" میں ارقام فرمائے ہیں، بالکل بجا ہیں۔ لیکن آپ نے یہ نہیں لکھا کہ اقبال، جس نے اسلامی قومیت (کی) حقیقت کا راز اُس وقت منکشف کیا جب ہندوستان والے اِس سے غافل تھے، اور جس کے اشعار کی تاریخ زمیندار، کامریڈ، بلقان، طرابلس اور نواب وقار الملک کی حق گوئی کی تاریخ سے پہلے کی ہے، کس کا خوشہ چین ہے؟ شاعروں کی بدنصیبی ہے کہ اُن کا کام بُرا بھلا جو کچھ بھی ہو، غیر محسوس ہوتا ہے، اور ظاہر بیں آنکھیں مرئیات کی طرف قدرتاً زیادہ متوجہ ہوتی ہیں۔"

اور پھر ایک دوسرے مکتوب (محررہ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۳ء) میں لکھتے ہیں:

"... لیکن آپ کو معلوم ہے کہ مَیں اپنے آپ کو شاعر تصور نہیں کرتا اور نہ کبھی بحیثیت فن کے مَیں نے اِس کا مطالبہ کیا ہے۔ پھر میرا کیا حق ہے کہ صف شعرا میں بیٹھوں.... دُردانہ بیچاری موتیوں کا ہار دے سکتی ہے، مگر گردن دینے کی وہ بساط نہیں

رکھتی!"

اس سال اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کی دو بار ملاقات ہوئی (ایک جنوری میں دوسری ستمبر میں) دوسری ملاقات کے بارے میں اقبال مہاراجہ کشن پرشاد کے نام مکتوب (محررہ یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء) میں لکھتے ہیں :

"مَیں ستمبر کا قریباً کُل مہینہ لاہور سے باہر رہا۔ پہلے کانپور مسجد کے مقدمے کے لئے گیا۔ وہاں سے دہلی آیا اور حاذق الملک صاحب (حکیم اجمل خاں) کے ہاں بغرضِ علاج مقیم رہا۔ الہ آباد بھی گیا۔ وہاں دو روز مولانا اکبر کی خدمت میں رہا۔"

اقبال فکر معاش سے مطمئن ہو کر اپنے مقاصدِ ملّی کے لیے (فکر و فن کے ذریعے) کام کرنے کے خواہش مند تھے۔ سرکار برطانیہ کی ملازمت ان مقاصد کی پیشرفت میں حائل ہوتی تھی اس لیے ان کی نظر دیسی ریاستوں پر تھی۔ اسی خاطر ۱۹۱۰ء میں وہ حیدر آباد گئے تھے۔ بعض دوسری ریاستوں میں بھی (مثلاً الور، گوالیار) کوشش کی گئی لیکن کوئی موزوں صورت نہ بن سکی۔ مہاراجہ کشن پرشاد نے اس سال ایک معقول رقم بطور وظیفہ مقرر کرنا چاہی جسے اقبال نے گوارا نہ کیا (مہاراجہ شاد اس زمانے میں ریاست کے مدارالمہام نہیں تھے۔ میر عثمان علی خاں کے برسراقتدار آنے کے ساتھ انہیں اس منصب سے سبکدوش کر دیا گیا تھا۔) اقبال اس سلسلے میں اپنے مکتوب محررہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء میں لکھتے ہیں :

"جو عنایت آپ اقبال کے حال پر فرماتے ہیں اس کا شکریہ کس زبان سے ادا ہو۔ دوست پروری اور غریب نوازی آپ کے گھرانے کا حصہ ہے۔ کیوں نہ ہو، جس درخت کی شاخ ہو، اس کے سائے سے ہندوستان بھر مستفیض ہوچکا ہے۔ الور کی ملازمت نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تنخواہ قلیل تھی۔ سات آٹھ سو روپے ماہوار تو لاہور میں بھی مل جاتے ہیں۔ اگرچہ میری ذاتی ضروریات کے لیے تو اس قدر رقم کافی ہے، بلکہ اس سے زیادہ ہے، تاہم چونکہ میرے ذمے اوروں کی ضروریات کا پورا کرنا بھی ہے، اس واسطے اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ گھر بھر کا خرچ میرے ذمے ہے۔ بڑے بھائی جان جنہوں نے اپنی ملازمت کا اندوختہ میری تعلیم پر خرچ کر دیا، اب پنشن پا گئے۔ ان کے اور ان کی اولاد کے اخراجات بھی

میرے ذمے ہیں اور ہونے چاہئیں--- غرض کہ مختصر طور پر یہ حالات ہیں جو مجھے بسا اوقات مزید دوڑ دھوپ کرنے پر مائل کر دیتے ہیں۔ آپ کی خدمت میں رہنا میرے لیے باعث افتخار ہے۔ آہ! اس وقت ہندوستان میں ہُنر کا قدر دان سوائے آپ کے کون ہے؟ مَیں تو بسا اوقات قحط خریدار سے تنگ آ جاتا ہوں:

ذوق گویائی خموشی سے بدلتا کیوں نہیں
میرے آئینے سے یہ جوہر نکلتا کیوں نہیں

"مَیں اپنا سامان یعنی قاش ہائے دلِ صد پارہ ایسے وقت بازار میں لے کر آیا جب سوداگروں کا قافلہ رُخصت ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے کہ آپ کی جانب سے "بُوے کسے" آتی ہے۔ متاع گراں مایہ اپنے دامن میں چھپائے رکھتا ہوں۔ حالات مساعد پاؤں تو دُنیا کو دکھاؤں، اور اگر حالات مساعد نہ ملے تو اقبال کو خیالاتِ ناگفتہ کا ایک متحرک مزار سمجھ لیجئے گا۔ آپ کی فیاضی کہ زمان و مکان کی قیود سے آشنا نہیں ہے، مجھ کو ہر شے سے مستغنی کر سکتی ہے۔ مگر یہ بات مروت اور دیانت سے دُور ہے کہ اقبال آپ سے ایک بیش قرار تنخواہ پائے اور اس کے عوض میں کوئی ایسی خدمت نہ کرے جس کی اہمیت بقدر اِس مشاہرے کے ہو۔ خدا کو منظور ہُوا تو کوئی نہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے گی کہ اقبال جو ہمیشہ معنوی طور پر آپ کے ساتھ رہا ہے، صوری طور پر بھی آپ کے ہمراہ ہو گا۔"

سر تھیوڈور ماریسن (سابق پرنسپل ایم۔ اے۔ او کالج علی گڑھ) ممبر کونسل سیکرٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی درخواست پر اقبال نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا کے لیے اردو لٹریچر کا باب لکھنا منظور کر لیا (اکبر اور شاد کے نام خطوط میں اقبال نے یہ ذکر کیا ہے لیکن یہ کام وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کر نہ سکے) لالہ رام پرشاد پروفیسر تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور کے اشتراک سے درسی کتب کے سلسلے میں تاریخ ہند لکھی جسے منشی گلاب سنگھ ایجوکیشنل پبلشرز نے شائع کیا۔

۱۹۱۴ء

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے عجمی تصوف اور اسلام کے

موضوع پر تقریر کی، اور اپنی زیر تالیف فارسی مثنوی کے بعض مقامات پڑھ کر سنائے۔ گرامی، اکبر اور شاد کے نام اقبال کے مکتوبات میں اس سال کی مصروفیات اور ذہنی کیفیات کا حال معلوم ہوتا ہے۔

مولانا غلام قادر گرامی کے نام مکتوب (محررہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء) میں اقبال لکھتے ہیں:

"جناب مولانا گرامی! آپ کہاں ہیں؟ حیدر آباد میں ہیں یا عدم آباد میں؟ اگر عدم آباد میں ہیں تو مجھے مطلع کیجئے کہ مَیں آپ کو تعزیت نامہ لکھوں۔ صدیاں گزر گئیں۔ کہیں آپ کا کلام دیکھنے میں نہیں آیا۔ کبھی کبھی چند اشعار بھیج دیا کرو تو کون سی بڑی بات ہے۔ مَیں تو اب بوجہ مشاغل منصبہ کے تارک الشعر ہوں۔ ہاں کبھی فرصت ملتی ہے تو فارسی اساتذہ کے اشعار پڑھ کر مزا اُٹھا لیتا ہوں۔ میری شاعری گھٹ کر اب اِسی قدر رہ گئی ہے کہ اَوروں کے اشعار پڑھ لوں۔ گذشتہ سال ایک مثنوی فارسی لکھنی شروع کی تھی۔ ہنوز ختم نہیں ہوئی، اور اِس کے اختتام کی اُمید بھی نہیں۔ خیالات کے اعتبار سے مشرقی اور مغربی لٹریچر میں یہ مثنوی بالکل نئی ہے۔ لیکن آپ سے ملاقات ہو تو آپ کو اِس کے اشعار سُناؤں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اسے سُن کر خوش ہوں گے۔ کہئے اِدھر آنے کا کب تک قصد ہے؟ مَیں ایک عرصے سے آپ کا منتظر ہوں۔ خدارا جلد آیئے۔ سب سے بڑا کام تو یہ ہے کہ آکر میری مثنوی سنئے اور اِس میں مشورہ دیجئے۔"

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام مکتوب (محررہ ۷ مارچ ۱۹۱۴ء) میں رقم طراز ہیں:

"آج کل شعر و شاعری کا شغل بھی کم ہے۔ "بھائی گدھا" یعنی پیٹ دم بھر کے لئے مہلت نہیں دیتا۔ "لاؤ چارا، لاؤ چارا" خدا اِسے غارت کرے۔ مولانا اکبر کا خط کل آیا تھا۔ خیریت سے ہیں۔ اُن کا دم بھی غنیمت ہے۔ خدا اُنہیں خوش رکھے۔ مَیں نے اُن کے رنگ میں چند اشعار لکھے تھے۔ مگر وہ بات کہاں؟... فارسی مثنوی کے اشعار ساتھ ساتھ ہو رہے ہیں۔ اس مثنوی کو مَیں اپنی زندگی کا مقصد تصور کرتا ہوں۔ مَیں مر جاؤں گا، یہ زندہ رہنے والی چیز ہے۔"

ایک دوسرے مکتوب میں کچھ نجی مشکلات کا ذکر کرنے کے بعد ۲۲ اپریل ۱۹۱۴ء

کے مکتوب میں لکھتے ہیں :

"کیا کروں۔ ارادے بلند رکھتا ہوں مگر تکمیل کے اسباب مفقود ہیں۔ جو عمل میرے ذہن میں ہے، وہ سفر کا مقتضی ہے اور علاوہ اِس کے صبر و استقلال کا۔"

۲۸ اگست ۱۹۱۴ء کے مکتوب میں جنگ عظیم اوّل کے آغاز کے بارے میں شاد کو لکھتے ہیں :

"یورپ میں ایک خوفناک جنگ ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اور کیا عجب کہ یہ وہی جنگ ہو جس کا ذکر پُرانی کتب مقدسہ میں ہے۔ اللہ تعالیٰ دُنیا کو امن نصیب کرے اور اہلِ دُنیا کو توفیق نصیب کرے کہ وہ مادیات سے مغلوب ہو کر روحانیت سے غافل نہ ہو جائیں۔"

۹ نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ محترمہ رحلت فرما گئیں۔ انہوں نے اس صدمے کو شدّت سے محسوس کیا اور ایک طویل نظم "والدہ مرحومہ کی یاد میں" لکھ کر اپنے غم کا اظہار کیا۔ شاد کے نام مکتوب (محررہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء) میں بھی اپنے جذبات غم کے حوالے سے لکھا :

".... گذشتہ چھ ماہ سے دل کی حالت نہایت بے اطمینانی کی ہے۔ کوئی شعر نہیں لکھ سکا، ورنہ ضرور آپ کی خدمت میں ارسال کرتا۔ ہاں فارسی مثنوی ختم ہو گئی ہے۔ مطمئن ہو جاؤں تو اِس کے چھپوانے کی فکر کروں۔"

شاد کے نام ۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء کے مکتوب میں ایک دلچسپ بات ملتی ہے۔ اقبال نے فارسی غزل کے چھ اشعار کہے ہیں۔ یہ غزل بعد میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ "پیام مشرق" (طبع ۱۹۲۳ء) میں شائع ہوئی۔ ذیل کے شعر میں "مولد حافظ" کو گلشن ویمر" میں بدل دیا گیا :

صبا بہ (مولد ۔حافظ) سلام ما برساں
کہ چشم نکتہ وراں خاک آں دیار افروخت

اقبال نے اس زمانے میں اکبر الٰہ آبادی کے تتبع میں کچھ ظریفانہ کلام کہنا شروع کیا تھا۔ بعض کم ظرفوں اور کج بحثیوں نے اس بارے میں اکبر اور اقبال کا موازنہ کرتے ہوئے اقبال کو ہدف تنقید بنایا۔ اکبر نے بھی اس نکتہ چینی کو ناپسند کیا اور

"نقاد" (آگرہ) کو خط لکھ کر اقبال کو اس کی اطلاع دی۔ جواب میں اقبال نے اکبر کو لکھا (۱۶ جولائی ۱۹۱۴ء):

"مخدوم مکرم حضرت قبلہ مولانا، السلام علیکم۔ آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا جس کو پڑھ کر بہت مسرت ہوئی۔ حضرت! مَیں آپ کو اپنا پیرو مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذّمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں، بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی، اس وقت بھی میری ارادت و عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے، اور انشاء اللہ جب تک مَیں زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی۔ اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول آپ کے حصول دولت و جاہ نہیں محض اظہار عقیدت ہے۔ عام لوگ شاعرانہ انداز سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اُن کو کیا معلوم کہ کسی شاعر کی داد دینے کا بہترین طریق یہ ہے کہ اگر داد دینے والا شاعر ہو تو جس کو داد دینا مقصود ہو، اس کے رنگ میں شعر لکھے۔ یا بالفاظ دیگر اس کا تتبع کرکے اس کی فوقیت کا اعتراف کرے۔ مَیں نے بھی اس خیال سے چند اشعار آپ کے رنگ میں لکھے ہیں مگر عوام کے رجحان بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ اور سمجھ لیا اور میرے اس فعل سے عجیب و غریب نتائج پیدا کر لیے۔ سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو سمجھ عطا کرے۔"

والدۂ محترمہ کی وفات کے صدمے نے اقبال پر گہرا اثر کیا تھا۔ طویل نظم میں اپنے غم و الم کو سمونے کے علاوہ اقبال نے اپنے خطوط میں بھی اپنے ذہنی تاثرات کو بیان کیا ہے۔ شاد کے نام مکتوب (محررہ ۲۳ نومبر ۱۹۱۴ء) میں لکھتے ہیں:

"آہ! انسان اپنی کمزوری کو چھپانے میں کس قدر طاق ہے۔ بے بسی کا نام صبر رکھتا ہے اور پھر اس صبر کو اپنی ہمت و استقلال کی طرف منسوب کرتا ہے۔ مگر اس حادثے نے میرے دل و دماغ میں ایک شدید تغیر پیدا کر دیا ہے۔ میرے لیے دنیا کے معاملات میں دلچسپی لینا اور دنیا میں بڑھنے کی خواہش کرنا صرف مرحومہ کے دم سے وابستہ تھا۔ اب یہ حالت ہے کہ "موت کا انتظار ہے۔" دنیا میں موت سب انسانوں تک پہنچتی ہے اور کبھی کبھی انسان بھی موت تک جا پہنچتا ہے۔ میرے قلب کی موجودہ

کیفیت یہ ہے کہ وہ تو مجھ تک پہنچتی نہیں، کسی طرح مَیں اس تک پہنچ جاؤں---
گذشتہ چھ ماہ سے دل کی حالت نہایت بے اطمینانی کی ہے۔ کوئی شعر نہیں لکھ سکا، ورنہ ضرور آپ کی خدمت میں ارسال کرتا۔ ہاں فارسی مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ مطمئن ہو جاؤں تو اس کے چھپوانے کی فکر کروں۔"

سیالکوٹ میں والدہ مرحومہ کے چہلم کے بعد لاہور سے شاد کو اُن کے خط کے جواب میں لکھتے ہیں۔ (۲۸ دسمبر ۱۹۱۴ء):

"افسوس ہے کہ تزک عثمانیہ، کے لیے کچھ نہیں لکھ سکا۔ مگر قانونی مشاغل میں اشعار کے لیے کہاں سے وقت نکلے۔ "دل اور دماغ" دونوں کام کرنا چاہتے ہیں مگر "پیٹ" کا حکم ہے کہ ہماری رضا کے بغیر ایک خیال یا ایک تاثر اپنے اندر نہ داخل ہونے دو۔ عجب کشمکش کی حالت ہے۔ مگر شکایت نہیں کہ ہمارے مذہب میں شکایت ہی کفر ہے۔"

اس سال کا ایک دلچسپ خط مولانا شوکت علی کے نام ہے جس پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ اقبال کو علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس میں دعوت شمولیت دی گئی تھی جس کے جواب میں یہ خط لکھا گیا اور آخر میں نظم "خطاب بہ جوانان اسلام" درج کی گئی:

"بھائی شوکت! اقبال عزلت نشیں ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانے میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے۔ تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو، مَیں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہوسکتی۔ علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیے۔ مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ یہ چند اشعار میری طرف سے ان کی خدمت میں عرض کر دیجیے۔ والسلام"

۱۹۱۵ء

ذہنی و فکری ارتقا کے لحاظ سے اقبال کی زندگی کا یہ سال بہت اہم ہے کیونکہ

اس میں مثنوی "اسرار خودی" تکمیل، کتابت اور طباعت و اشاعت کے مرحلوں سے گزر کر نقد و نظر کا موضوع بنتی ہے۔ درد گردہ کی شکایت کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا جس کی وجہ سے فروری میں کئی روز تک صاحبِ فراش رہے۔ گرامی کے نام ۱۸ جنوری کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"مثنوی ختم ہوگئی ہے۔ آپ تشریف لائیں تو آپ کو دکھا کر اس کی اشاعت کا اہتمام کروں۔۔۔ اردو اشعار لکھنے سے دلبرداشتہ ہوتا جاتا ہوں۔ فارسی کی طرف زیادہ میلان ہوتا جاتا ہے اور وجہ یہ کہ دل کا بخار اردو میں نکال نہیں سکتا۔" چند اشعار عرض کرتا ہوں:

بیار بادہ کہ گردوں بکام ما گردید
مثال غنچہ نواہا ز شاخسار دمید

۔۔۔ الخ (ترمیم کے بعد یہ اشعار "پیام مشرق" کی زینت بنے۔

خواجہ حسن نظامی کے نام مکتوب (محررہ ۶ فروری ۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں:

"ڈیئر خواجہ صاحب، آپ کی سرکار سے جو خطاب مجھے عطا ہوا ہے اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ لیکن وہ مثنوی جس میں خودی کی حقیقت و استحکام پر بحث ہے، اب قریباً تیار ہے اور پریس جانے کو ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی عمدہ نام یا خطاب تجویز فرمایئے۔ شیخ عبدالقادر صاحب نے اِس کے نام اسرارِ حیات، پیام سروش، پیام نو، آئینِ نو تجویز کئے ہیں۔ آپ بھی طبع آزمائی فرمایئے اور نتائج سے مجھے مطلع کیجئے تاکہ مَیں انتخاب کر سکوں۔"

گرامی کے نام مکتوب (محررہ ۵ مئی ۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں:

"مثنوی ختم ہو گئی۔ اب اس کی اشاعت کا اہتمام درپیش ہے۔ چھپ جانے پر انشاء اللہ ارسالِ خدمت کروں گا۔ کاش! آپ یہاں ہوتے یا مَیں حیدر آباد میں ہوتا تو پریس میں جانے سے پہلے آپ کے ملاحظے سے گزر جاتی۔ مَیں نے ارادہ کیا تھا کہ حیدر آباد تو دُور ہے لکھنؤ جا کر خواجہ عزیز کو سُنا آؤں لیکن لاہور کے علائق نہیں چھوڑتے۔"

شاد کے نام مکتوب (محررہ ۳۰ اگست ۱۹۱۵ء) میں اطلاع دیتے ہیں:

"مثنوی فارسی عنقریب شائع ہو گی۔ اِس کا اُردو دیباچہ دیکھنے کے قابل ہو گا۔"

۱۲ ستمبر ۱۹۱۵ء کو "اسرار خودی" کا ایک نسخہ شاد کو اس معذرت نامے کے ساتھ ارسال کرتے ہیں:

"اسرارِ خودی" کی ایک کاپی ارسالِ خدمت کرتا ہوں۔ مجھے اِس کتاب کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اِس وجہ سے کہ اِس کی چھپائی وغیرہ کچھ دلکش نہیں۔ مگر اِس خیال سے کہ مَیں زیادہ روپیہ اِس کی اشاعت پر خرچ کرنے کی استطاعت نہ رکھتا تھا، اُمید کرتا ہوں کہ آپ میری مجبوری کو ملحوظ خاطر رکھ کر اِس جرأت کو معاف کریں گے۔"

متذکر بالا مکتوب سے قبل ۹ ستمبر ۱۹۱۵ء کو شاد کے نام مکتوب میں مثنوی کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ غالباً مطبع سے ۱۱ یا ۱۲ ستمبر کو کتاب موصول ہوئی ہوگی اور ملتے ہی فوراً خاص خاص احباب کو اس کے نسخے ارسال کر دیے گئے ہوں گے۔ مثنوی پڑھ کر پہلا ردِ عمل خوشگوار تھا۔ حوصلہ افزائی کے پیغامات موصول ہونے لگتے ہیں۔ جواب میں اقبال شاد کے نام مکتوب (محررہ ۳۰ ستمبر ۱۹۱۵ء) میں لکھتے ہیں:

"نوازش نامہ موصول ہوا۔ مثنوی کی رسید ملی.... مجھے اِس سے بڑی مسّرت ہوئی کہ سرکار نے اِس نظم کو پسند فرمایا۔ دوسرا حصہ انشاء اللہ باعتبار معانی کے اِس سے لطیف تر ہو گا۔ خدا فرصت دے تو اسے بھی پورا کر دوں۔ گو ہجوم مشاغل سفلی میں اُمید کی کمر شکستہ ہے، تاہم جو کچھ بھی ہو سکے گا کروں گا۔ خیالات عجیب و غریب دل میں دَورہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر لٹریری مشاغل اِس ملک میں بطور ایک پیشے کے اختیار کئے جا سکتے تو مَیں اپنے موجودہ کاروبار کو مع اِس کی تمام دلچسپیوں اور اُمیدوں کے خیرباد کہہ دیتا۔ بہرحال جو کچھ اللہ کو منظور۔ میرزا سلطان احمد خان بہادر جو پنجاب کے مشہور مبصّر اور اہلِ قلم ہیں، اِس پر ریویو کر رہے ہیں۔ آپ کا ریویو مثنوی کو چار چاند لگا دے گا۔ میرے لیے اِس سے بڑھ کر عزّت اور کیا ہو گی، آپ نے اور مولانا اکبر نے اسے پسند فرمایا۔ بس یہی داد میرے لئے کافی ہے، اور مَیں سمجھتا ہوں کہ میری محنت ٹھکانے لگ گئی۔"

اکبر الٰہ آبادی کے نام مکتوب (محررہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء) میں اکبر کے ایک شعر کے

حوالے سے اقبال نے مثنوی کے بنیادی خیال کے بارے میں یہ اہم بات کہی :

"آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کُھلتی ہے... "مذہب بغیر قوت کے محض ایک فلسفہ ہے" یہ نہایت صحیح مسئلہ ہے اور حقیقت میں مثنوی لکھنے کے لئے یہی خیال محرک ہوا۔ مَیں گذشتہ دس سال سے اِسی پیچ و تاب میں ہُوں۔"

اور پھر اگلے مکتوب (محررہ ۲۵ اکتوبر) میں اپنے درد ملّی اور قلب و ذہن کی کیفیت بیان کی ہے :

"کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دُکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ضروریات اِسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکرِ مناصب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور اگر خدا تعالیٰ نے کوئی خاص مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیا کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرتِ اسلامی کی متاع نہیں بکتی —— کئی صدیوں سے علماء اور صوفیا میں طاقت کے لئے جنگ رہی جس میں آخرکار صوفیا غالب آئے۔ یہاں تک کہ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی نہ کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں، ہردلعزیز نہیں ہو سکتے۔ یہ روش گویا علماء کی طرف سے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ مجدد الف ثانی، عالمگیر اور مولانا اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہم نے اسلامی سیرت کے احیاء کی کوشش کی۔ مگر صوفیاء کی کثرت اور صدیوں کی جمع شدہ قوت نے اِس گروہِ احرار کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ اب اِسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسا ہے۔ مَیں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ صرف ایک بے چین اور مضطرب جان رکھتا ہوں۔ قوتِ عمل مفقود ہے۔ ہاں، یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نوجوان جو ذوقِ خداداد کے ساتھ قوتِ عمل بھی رکھتا ہو، مل جائے جس کے دل میں اپنا اضطراب منتقل کر دوں۔"

اقبال اپنے ایک قدیم دوست اور صاحب ذوق، منشی سراج الدین کو لکھتے ہیں، (۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء) :

"... الحمدللہ کہ آپ کو مثنوی پسند آئی... یہ مثنوی گذشتہ دو سال کے عرصے میں لکھی گئی۔ مگر اِس طرح کہ کئی کئی ماہ کے وقفوں کے بعد طبیعت مائل ہوتی

رہی۔ چند اتوار کے دِنوں اور بعض بے خواب راتوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ مشاغل وقت نہیں چھوڑتے اور جوں جوں اِس پروفیشن میں زمانہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، کام بڑھ ہی جاتا ہے۔ لٹریری مشاغل کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ اگر مجھے پُوری فرصت ہوتی تو غالباً اِس موجودہ صورت سے یہ مثنوی بہتر ہوتی۔ اِس کا دُوسرا حصہ بھی ہوتا جس کے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ حصہ اِس حصے سے زیادہ لطیف ہو گا۔ کم از کم مطالب کے اعتبار سے، گو زبان اور تخیل کے اعتبار سے مَیں نہیں کہہ سکتا کہ کیسا ہو گا۔ یہ بات طبیعت کے رنگ پر منحصر ہے جو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اِس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی ہیں۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اِس مثنوی میں حقیقی اِسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول اللہ صلعم کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دُوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے، اور کہاں سے آیا اور صحابہ کرام کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے۔"

۱۹۱۶ء

یہ سال پیشہ ورانہ مصروفیت کے ساتھ ساتھ مثنوی کے دوسرے حصے (رموز بے خودی) کی تخلیق اور "اسرار خودی" کے معارضے کی نذر ہوا۔ اس لحاظ سے حیات اقبال کا یہ سال بڑا ہنگامہ خیز تھا۔ فریق مخالف کے سرگروہ خواجہ حسن نظامی تھے جو اقبال کے دیرینہ دوست و آشنا بھی تھے، اور رسالہ "توحید" میں مثنوی کا کچھ حصہ چھاپ کر اس کی توصیف بھی کر چکے تھے۔ مباحثے کا آغاز مثنوی پر خواجہ حسن نظامی کے ایک رفیق ذوقی شاہ کے تنقیدی مضمون سے ہوا جو ۳۰ نومبر ۱۹۱۵ء کے "خطیب" میں شائع ہوا۔ اس کے جواب میں "کشّاف" کے قلمی نام سے ایک مراسلہ ۲۲ دسمبر ۱۹۱۵ء کے "وکیل" امرتسر میں شائع ہوا۔ جواب الجواب میں خواجہ حسن نظامی کا ایک مراسلہ

"وکیل" ۲۹ دسمبر ۱۹۱۵ء میں چھپا اور دوسرا مضمون "سِرّ اَسرارِ خودی" ۳۰ جنوری کے "خطیب" میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں خواجہ حسن نظامی نے اصل مثنوی کو چھوڑ کر دیباچہ مثنوی کے اُن اشعار پر جن میں اقبال نے حافظ شیرازی اور افلاطون کے مسلک و نظریے پر نکتہ چینی کی تھی، بحث کی بنیاد رکھی اور بعض اشعار کو سیاق سے الگ کر کے اور من مانے معنی پہنا کر عام قارئین کے لیے مغالطہ انگیز فضا پیدا کر دی۔ اس کے بعد دونوں اطراف سے ایک طویل مباحثے اور مناقشے کا دَور شروع ہوگیا۔ پیرانِ طریقت کا ایک گروہ خواجہ حسن نظامی کے جلو میں شریک معرکہ آرائی تھا اور کچھ رفقا اقبال کے ساتھ دفاع میں شامل تھے۔ بعض انتہا پسند اور جنونی متصوّفین جذبات کی رَو میں بہہ کر حد اعتدال سے بھی تجاوز کر گئے اور اقبال پر سب و شتم کرنے لگے۔ کچھ منصف مزاج اور اعتدال پسند علماء و صوفیا نے دونوں فریقوں میں مفاہمت اور رواداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ خصوصاً اکبر الہ آبادی نے اگرچہ دیباچہ مثنوی کو بے احتیاطی پر محمول قرار دیا، تاہم اقبال اور خواجہ حسن کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کیا۔ شاہ سلیمان پھلواری، مولانا اسلم جیراجپوری، پروفیسر محمود علی (رندھیر کالج کپورتھلہ) مولوی عبداللہ العمادی، مولوی سراج الدین پال نے عالمانہ انداز میں اس بحث میں حصہ لیا۔ خود اقبال نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اور تصوف کے مسئلے پر علمی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جو "وکیل" اور دوسرے اخبارات میں شائع ہوا۔ "وکیل" امرتسر میں اقبال کے یہ مضامین اس سلسلے میں شائع ہوئے: "اسرار خودی اور تصوف" (۱۵ جنوری ۱۹۱۶ء) "سِرّ اَسرارِ خودی" (۹ فروری ۱۹۱۶ء) "علم ظاہر و علم باطن" (۲۸ جون ۱۹۱۶ء) "تصوف وجودیہ" (۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء) ان مسائل اور اپنے احوال و افکار پر بعض خطوط میں بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اکبر الہ آبادی کے نام ایک مکتوب (محررہ ۴ فروری ۱۹۱۶ء) میں لکھتے ہیں:

"مَیں تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں جو ممکن ہے ایک کتاب بن جائے۔ چونکہ خواجہ حسن نظامی نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ مَیں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں، اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے۔ ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ

تھی۔

چونکہ مَیں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے، اس واسطے ان کا خیال ہے میں تحریک تصوف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔ "بّر اسرار خودی" کے عنوان سے انھوں نے ایک مضمون خطیب میں لکھا ہے جو آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ جو پانچ وجوہ مثنوی سے اختلاف کرنے کے لکھے ہیں انہیں ذرا غور سے ملاحظہ فرمایئے۔ تاریخ تصوف سے فارغ ہو لوں تو تقویتہ الایمان کی طرف توجہ کروں۔ فی الحال جو فرصت ملتی ہے وہ اسی مضمون کی نذر ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ ضروری کتب لاہور کے کتب خانوں میں نہیں ملتیں۔ جہاں تک ہو سکا میں نے تلاش کی ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ اس مضمون کو پڑھ کر خوش ہوں گے۔ منصور حلاج کا رسالہ کتاب الطواسین نام فرانس میں شائع ہو گیا ہے۔ وہ بھی منگوایا ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ فی الحال مثنوی کا دوسرا حصہ بھی ملتوی ہے۔ مگر اس میں عالمگیر اورنگ زیب کے متعلق جو شعر لکھے ہیں ان میں سے ایک عرض کرتا ہوں

درمیان کارزار کفر و دیں
ترکش ما را خدنگ آخریں

آپ کا قطعہ "حضرت اقبال اور خواجہ حسن" بہت خوب رہا۔ صرف ایک بات ہے کہ خواجہ صاحب کو تو کبھی رقص اور سُکر نصیب ہوتا ہو گا، مَیں اس نعمت سے محروم ہوں۔"

نیاز الدین خان کے نام مکتوب (محررہ ۱۳ فروری ۱۹۱۶ء) میں لکھتے ہیں:

"میرا تو خیال تھا کہ فرصت کا وقت مثنوی کے دوسرے حصے کو دوں گا جو پہلے سے زیادہ ضروری ہے۔ مگر خواجہ حسن نظامی نے بحث چھیڑ کر توجہ اور طرف منعطف کر دی ہے۔ تصوف کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ دو باب لکھ چکا ہوں یعنی منصور حلاج تک، پانچ چار باب اور ہوں گے۔"

مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام مکتوب (محررہ ۳ اپریل ۱۹۱۶ء) میں رقم طراز ہیں:

"خواجہ حافظ کے متعلق جو عریضہ مَیں نے آپ کی خدمت میں لکھا تھا، افسوس ہے سرکار تک نہ پہنچ سکا۔ مَیں نے اس میں یہ عرض کیا تھا کہ سرکار نے جو رائے

مثنوی اسرار خودی کے متعلق لکھی ہے، وہ میرے پاس محفوظ ہے۔ کہیں شائع نہیں کی گئی اور نہ کی جائے گی۔ مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ اس سے اختلاف ہوگا اور جن کرم فرماؤں نے سرسری نظر سے دیکھ کر مثنوی کی تعریف لکھ دی تھی، مَیں نے ان کی آرا کو محفوظ رکھا، محض اس خیال سے کہ بغور پڑھنے کے بعد ممکن ہے کہ ان کی رائے تبدیل ہو جائے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب نے تنقید حافظ کی وجہ سے اس مثنوی کو مخالف تصوف سمجھا ہے اور اسی مفروضے پر ان کے مضامین کا دارو مدار ہے، جن میں مجھے انہوں نے دشمن تصوف کہہ کر بدنام کیا ہے۔ اُن کو تصوف کے لٹریچر سے واقفیت نہیں اور جس تصوف پر وہ قائم ہیں، اس کا مَیں مخالف نہیں۔ ہاں اس کے بعض مسائل کو مَیں صحیح تسلیم نہیں کرتا اور جس مسئلے میں، مَیں نے اختلاف کیا ہے، مجھ سے پہلے ہزاروں صوفی اس سے اختلاف کرچکے ہیں۔ خواجہ حافظ کی شاعری کا مَیں معترف ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہیں ہوا، اور غالباً پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ کیفیت قوائے حیات کو کمزور و ناتواں کرنے والی ہے۔ یہ ایک نہایت طویل اور دلچسپ بحث ہے جو اس مختصر سے خط میں سما نہیں سکتی۔ مَیں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کی گذشتہ دماغی تاریخ اور موجود حالت پر بہت غور کیا ہے، جس سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ ان دونوں قوموں کے اطبّا کو اپنے مریض کا اصلی مرض اب تک معلوم نہیں ہوسکا۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان کا اصلی مرض قوائے حیات کی ناتوانی اور ضعف ہے، اور یہ ضعف زیادہ تر ایک خاص قسم کے لٹریچر کا نتیجہ ہے، جو ایشیا کی بعض قوموں کی بدنصیبی سے ان میں پیدا ہوگیا۔ جس نکتہ خیال سے یہ قومیں زندگی پر نگاہ ڈالتی ہیں وہ نکتہ خیال صدیوں سے مضعف مگر حسین و جمیل ادبیات سے محکم ہوچکا ہے، اور اب حالات حاضرہ اس امر کے مقتضی ہیں کہ اس نکتہ خیال میں اصلاح کی جائے۔

یہ مثنوی جس کا نام "اسرار خودی" ہے، ایک مقصد سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ میری فطرت کا طبعی اور قدرتی میلان سُکر و مستی و بے خودی کی طرف ہے۔ مگر قسم ہے اس خدائے واحد کی جس کے قبضے میں میری جان و مال و آبرو ہے، مَیں نے یہ مثنوی از خود نہیں لکھی، بلکہ مجھ کو اس کے لکھنے کی ہدایت ہوئی ہے۔ اور مَیں حیران

ہوں کہ مجھ کو ایسا مضمون لکھنے کے لئے کیوں انتخاب کیا گیا۔ جب تک اس کا دوسرا حصہ ختم نہ ہو لے گا، میری روح کو چین نہ آئے گا۔ اس وقت مجھے یہ احساس ہے کہ بس میرا یہی ایک فرض ہے اور شاید میری زندگی کا اصل مقصد ہی یہی ہے۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کی مخالفت ہوگی۔ کیونکہ ہم سب انحطاط کے زمانے کی پیداوار ہیں اور انحطاط کا سب سے بڑا جادو یہ ہے کہ یہ اپنے تمام عناصر و اجزا و اسباب کو اپنے شکار (خواہ وہ شکار کوئی قوم ہو خواہ فرد) کی نگاہ میں محبوب و مطلوب بنا دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بدنصیب شکار اپنے تباہ و برباد کرنے والے اسباب کو اپنا بہترین مربّی تصور کرتا ہے۔ مگر:

من صدائے شاعر فردا ستم

اور:

ناامید ستم ز یارانِ قدیم
طور من سوزد کہ می آید کلیم

نہ خواجہ حسن نظامی رہے گا نہ اقبال۔ یہ بیج جو مُردہ زمین میں اقبال نے بویا ہے، اُگے گا، ضرور اُگے گا اور علی الرغم مخالفت بار آور ہو گا۔ مجھ سے اس کی زندگی کا وعدہ کیا گیا ہے۔ الحمدللہ۔"

اقبال اور شاد کے مابین بحث کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے اور ان خطوط میں اقبال نے اپنی پوزیشن کا بھرپور دفاع کیا ہے۔ اس سے ہم اقبال کے قلب و ذہن کی کیفیات کا بخوبی مطالعہ کرسکتے ہیں۔ مکتوب محررہ ۱۰ مئی ۱۹۱۶ء میں اقبال رقم طراز ہوتے ہیں:

"سرکار نے جو ارشاد فرمایا ہے، بالکل صحیح ہے۔ یعنی اس بات کے ثبوت میں، مَیں نے مثنوی میں کچھ نہیں لکھا کہ جو کیفیت خواجہ حافظ اپنے ریڈر کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ قوت حیات کو ضعیف و ناتواں کرنے والی ہے۔ اس دعوے کے ثبوت دو طرح سے دیے جاسکتے ہیں، فلسفیانہ اور شاعرانہ۔ مقدم الذکر قسم کا ثبوت اس مثنوی میں کوئی نہیں، کیونکہ کتاب نظم ہے اور نظم میں فلسفیانہ ثبوت پیش نہیں کیے جاسکتے۔ اگر یہی مضمون نثر میں لکھا جاتا تو وہ تمام ثبوت لکھے جاتے۔ شاعرانہ ثبوت

منطقی اعتبار سے ضروری نہیں کہ صحیح ہوں، تاہم اس نکتہ خیال سے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ مثنوی میں جابجا موجود ہے۔ آپ مطالعہ فرمائیں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ مسئلہ نہایت دقیق اور گہرا ہے۔ اور چونکہ اس کا تعلق انسان کی موجودہ اور مابعد الموت کی زندگی سے ہے، اس واسطے ہر ایک آدمی کے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا ضروری ہے۔ مَیں جس نتیجے پر پہنچا ہوں وہ نتیجہ بیشتر اقوام مشرق کے موجودہ مذاق اور میلان طبیعت کے خلاف ہے۔ لیکن مشرق قدیم کے حکما اس سے نا آشنا نہیں ہیں اور یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ مَیں اس نتیجے پر پہنچنے میں فلاسفۂ مغرب سے متاثر ہوا ہوں۔

اگرچہ مَیں کوئی غیر معمولی ذہانت و فطانت رکھنے والا آدمی نہیں ہوں اور نہ کوئی غیر معمولی علم رکھتا ہوں، تاہم عام لوگوں سے علم اور سمجھ کسی قدر زیادہ رکھتا ہوں۔ جب مجھ کو اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے بیس سال کی ضرورت ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ عام لوگ جو دنیا کی دماغی اور عملی تاریخ سے پورے واقف نہیں، تھوڑے غور و فکر سے اس کی حقیقت تک پہنچ جائیں۔ اعتراض کرنا دوسری بات ہے۔۔۔"

اور پھر اگلے مکتوب (محررہ ۲۴ جون ۱۹۱۶ء) میں اقبال، شاد کو لکھتے ہیں:

"آپ کی تحریر مجھے قطعاً ناگوار نہیں ہو سکتی، کیونکہ مجھے خوب معلوم ہے کہ خلوص آپ کی زندگی کی خصوصیت ہے۔ خیال کا اختلاف اور بات ہے اور مفید ہے۔ مگر تعجب ہے آپ کا بھی یہ خیال ہے کہ مَیں نے جرمن فلسفہ اس مثنوی میں لکھا ہے! علماء اسلام ابتدا سے آج تک تصوف وجودیہ کے مخالف رہے ہیں۔ مَیں نے کوئی نئی بات نہیں کی۔ ہندوؤں میں کشن کی گیتا (جہاں تک مَیں اسے سمجھتا ہوں) اس کے خلاف ایک زبردست آواز تھی۔ پھر اگر کوئی شخص تصوف وجودیہ کی مخالفت کرے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ تصوف کا مخالف ہے۔ حقیقی اسلامی تصوف اور چیز ہے۔ تصوف وجودیہ مذہب اسلام سے قطعاً تعلق نہیں رکھتا اور مذہب ہنود سے گو تعلق رکھتا ہے، تاہم ہندوؤں کے لئے سخت مضر ثابت ہوا ہے۔ ہمارے صوفیاء کی کتابوں میں اس امر پر ایک عجیب و غریب بحث موجود ہے کہ "گستن" اچھا ہے یا "پیوستن" اور صوفیا کا اس میں اختلاف ہے۔ اسلامی تصوف کا دارومدار "گستن" پر ہے، تصوف وجودیہ کا

"پیوستن" یا فنا پر۔ اگر مَیں نے "گسستن" کی حمایت کی ہے تو کوئی بدعت نہیں کی۔ صوفیا میں سے جن لوگوں نے مجھ پر اعتراض کیا ہے وہ خود اپنے تصوف کے لٹریچر سے آگاہ نہیں معلوم ہوتے۔ تصوف وجودیہ کے متعلق خود نبی کریم کی ایک پیش گوئی موجود ہے جس پر مَیں نے مفصل بحث کی ہے۔ انشاء اللہ عنقریب یہ مضمون شائع ہو گا۔ میرا ذاتی میلان "پیوستن" کی طرف ہے مگر وقت کا تقاضا اور ہے۔ اور مَیں نے جو کچھ لکھا ہے اس کے لکھنے پر مجبور تھا۔ حکم کی اطاعت لازم تھی۔ اس سے چارہ نہ تھا۔ دنیا مخالفت کرتی ہے تو کرے۔ اس کی پرواہ نہیں۔ مَیں نے بساط کے مطابق اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"

مولوی سراج الدین پال کے نام اقبال اپنے مکتوب (محررہ ۱۰ جولائی ۱۹۱۶ء) میں رقمطراز ہیں:

"حدیث میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ افسوس ہے مسلمان مردہ ہیں۔ انحطاطِ ملّی نے ان کے تمام قویٰ کو شل کر دیا ہے اور انحطاط کا سب سے بڑا جادُو یہ ہے کہ یہ اپنے صید پر ایسا اثر ڈالتا ہے جس سے مسحور اپنے قاتل کو اپنا مُربّی تصور کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے... شعرائے عجم میں بیشتر وہ شعرا ہیں جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے۔ اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان طبیعت میں موجود تھا اور اگرچہ اسلام نے کچھ عرصہ تک اس کا نشو و نما نہ ہونے دیا، تاہم وقت پا کر ایران کا آبائی اور طبعی مذاق اچھی طرح سے ظاہر ہوا۔ یا باالفاظ دیگر مسلمانوں میں ایک ایسے لٹریچر کی بنیاد پڑی جس کی بنا وحدت الوجود تھی۔ ان شعرا نے نہایت عجیب و غریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائرِ اسلام کی تردید و تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا..."

اور اگلے مکتوب (محررہ ۱۹ جولائی ۱۹۱۶ء) میں سراج الدین پال کو لکھتے ہیں:

"یہ حیرت کی بات ہے کہ تصوف کی تمام شاعری مسلمانوں کے پولیٹیکل انحطاط کے زمانے میں پیدا ہوئی اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ جس قوم میں طاقت و توانائی مفقود ہو جائے جیسا کہ تاتاری یورش کے بعد مسلمانوں میں مفقود ہو گئی، تو پھر اس قوم کا نکتہ

نگاہ بدل جایا کرتا ہے۔ ان کے نزدیک ناتوانی ایک حسین و جمیل شے ہو جاتی ہے اور ترک دنیا موجب تسکین۔ اس ترک دنیا کے پردے میں قومیں اپنی سستی و کاہلی اور اس شکست کو جو تنازع للبقا میں ہو، چھپایا کرتی ہیں۔ خود ہندوستان کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ ان کے ادبیات کا انتہائی کمال لکھنؤ کی مرثیہ گوئی پر ختم ہوا۔"

نیاز الدین خان کے نام ۱۱ ستمبر ۱۹۱۶ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ اگست کے مہینے میں تصوف کی تاریخ پر کچھ نہ لکھ سکا۔ البتہ مثنوی کے دوسرے حصے کے بہت سے اشعار لکھے گئے۔ یعنی آدھی مثنوی لکھی گئی۔ کیا عجب کہ باقی بھی جلد تمام ہو جائے اور دوسرے حصے کی اشاعت بھی جلد ہو جائے۔ پہلے حصے کی دوسری ایڈیشن کا کاغذ کل خرید کیا ہے۔

شاہ ولی اللہ علیہ الرحمتہ کو اللہ تعالیٰ نے مغربی ہند کے ملاحدہ کی رد اور اصلاح کے لئے مامور کیا تھا اور یہ کام انہوں نے نہایت خوبی سے کیا ہے۔ ان کی کتاب فضیات الشیخین بھی ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے آخری حصے میں تصوف پر انہوں نے خوب بحث کی ہے۔ امام غزالی علیہ الرحمتہ کی نسبت یہ فیصلہ کرنا کہ وہ ہمہ اوست یا ہمہ از اوست کے قائل تھے، نہایت مشکل ہے۔ وہ فلسفی تھے اور دونوں طرفوں کی مشکلات کو خوب سمجھتے تھے۔"

۱۹۱۷ء

یہ سال بھی مثنوی "رموز بے خودی" کی تخلیق و تکمیل کے علاوہ اپنے قومی، ملی اور شعری نظریات کی وضاحت و صراحت میں گزرا۔ سال کے شروع میں حیدر آباد ہائی کورٹ میں ایک جج خالی ہوئی۔ میونسپل گزٹ لاہور کے مدیر منشی دین محمد نے اس کے لیے اقبال کا نام تجویز کیا۔ اقبال بھی اس کی خواہش رکھتے تھے کہ فکر روزگار سے مطمئن ہو کر اپنا تخلیقی کام جاری رکھ سکیں گے۔ لیکن یہ تجویز عملی شکل اختیار نہ کر سکی۔ پھر اکبر حیدری نے قانون کی پروفیسری پیش کرنی چاہی جسے اقبال بوجوہ قبول نہ کر سکے، اور راضی بہ رضا ہو کر لاہور ہی میں اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں اور قومی خدمات کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا (ان امور کی تفصیلات شاد اور گرامی کے نام خطوط میں دیکھی

جاسکتی ہیں)۔

ذہنی و فکری امور کی نشان دہی گرامی، نیاز، شاد اور سید سلیمان ندوی کے نام اقبال کے خطوط میں ہوئی ہے، جن کے ضروری حصے درج ذیل ہیں۔ مولوی الف دین کے نام خط (محررہ ۹ جنوری ۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں :

''مثنوی اسرار خودی کے دوسرے حصے کا قریب پانچ سو شعر لکھا گیا ہے۔ مگر ہاتف کبھی کبھی دوچار ہوتے ہیں، اور مجھے فرصت کم ہے۔ امید (ہے) کہ رفتہ رفتہ ہو جائیں گے۔ ہجرت کے مفہوم کے متعلق جو چند اشعار لکھے ہیں عرض کرتا ہوں'' (اس کے بعد ۲۱ اشعار لکھے ہیں۔ پہلا شعر یہ ہے :)

ہندی و چینی سفال جامِ ما ست
رومی و شامی گل اندامِ ما ست

نیاز الدین خاں کے نام مکتوب (محررہ ۷ فروری ۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں :

''افسوس کہ مثنوی کا دوسرا حصہ ابھی تیار نہیں ہو سکا۔ کل کچھ فرصت مل گئی تھی۔ فقہ کا وہ مسئلہ نظم کیا جس کی رُو سے مسلمانوں پر اُس دشمن پر حملہ کرنا حرام ہے جو صلح کی امید میں اپنے حصار وغیرہ گرا دے۔ اس مسئلے کا ذکر کر کے اِس کی حقیقت اور فلسفہ لکھا ہے کہ شرع نے کیوں ایسا حکم دیا ہے۔ عجیب عجیب باتیں ذہن میں آتی ہیں، مگر قلب کو یکسوئی میسّر نہیں۔''

۸ فروری کو اسی مسئلے پر گرامی کو بھی خط لکھا اور متعلقہ آٹھ اشعار بھی بہ نظر اصلاح و تنقیح درج کیے (مکاتیب بنام گرامی ص ۱۱۰) پھر ۱۹ فروری کو حضرت امام حسینؓ کے واقعہ شہادت کا تاریخی مفہوم نظم کرتے ہوئے ضمناً چار شعر عقل اور عشق پر لکھے (ص ۱۱۴) اور مشورۂ سخن کا یہ سلسلہ ۲۲ مارچ، ۳ مئی، ۷ مئی، ۲۱ مئی، ۲۸ جون، یکم جولائی، ۳ جولائی، ۶ جولائی کے خطوط میں بھی جاری رہتا ہے۔

نیاز الدین خان کے نام مکتوب (محررہ ۲ مارچ ۱۹۱۷ء) میں لکھتے ہیں :

''مَیں لاہور کے ہجوم میں رہتا ہوں مگر زندگی تنہائی کی بسر کرتا ہوں۔ مشاغل ضروری سے فارغ ہوا تو قرآن یا عالم تخیل میں قرون اولیٰ کی سیر۔ مگر خیال کیجئے جس زمانے کا تخیل اس قدر حسین و جمیل و روح افزا ہے وہ زمانہ خود کیسا ہو گا!

خوشا وہ عہد کہ یثرب مقام تھا اُس کا!
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اُس کا!

"مثنوی کا دوسرا حصہ جس کا نام "رموز بے خودی" ہو گا، انشاء اللہ اس سال کے ختم ہونے سے پیشتر ختم ہو جائے گا۔"

شاد کے نام مکاتیب محررہ ۷ مارچ و ۱۹ مئی میں اقبال لکھتے ہیں:

"انسانی قلب کے لئے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پروردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے۔ انشاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دل غیور عطا کیا ہے جو خدمت کا طالب نہیں اور احباب کی خدمت کو ہمیشہ حاضر ہے۔"

"میں فارسی مثنوی کے دوسرے حصے کی تکمیل میں مصروف ہوں۔ اس کا نام رموز بے خودی ہو گا... حال میں ایک اردو غزل لکھی تھی۔ اس کے دو ایک شعر ملاحظہ کے لئے لکھتا ہوں:

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی"

نیاز الدین خان کے نام مکتوب محررہ ۲۷ جون ۱۹۱۷ء میں اقبال لکھتے ہیں:

"رموز بے خودی کو مَیں اپنے خیال میں ختم کر چکا تھا مگر پرسوں معلوم ہوا کہ ابھی ختم نہیں ہوئی۔ ترتیب مضامین کرتے وقت یہ بات ذہن میں آئی کہ ابھی دو تین ضروری مضامین باقی ہیں، یعنی قرآن اور بیت الحرام کا مفہوم و مقصود حیاتِ ملیّہ اسلامیہ میں کیا ہے؟ ان مضامین کے لکھ چکنے کے بعد اس حصہ مثنوی کو ختم سمجھنا چاہئے۔ مگر ایسے ایسے مطالب ذہن میں آئے ہیں کہ خود مسلمانوں کے لئے موجب حیرت و مسرت ہوں گے۔ کیونکہ جہاں تک مجھے معلوم ہے ملّتِ اسلامیہ کا فلسفہ اس صورت میں اس سے پہلے کبھی اسلامی جماعت کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ نئے سکول کے مسلمانوں کو معلوم ہو گا کہ یورپ جس قومیت پر ناز کرتا ہے وہ محض بودے اور سست تاروں کا بُنا

ہوا ایک ضعیف چیتھڑا ہے۔ قومیت کے اُصول حقہ صرف اسلام نے ہی بتائے ہیں جن کی پختگی اور پائیداری مرور ایام و اعصار سے متاثر نہیں ہو سکتی۔"

گرامی کے نام مکاتیب محررہ یکم جولائی ۱۹۱۷ء و ۳ ستمبر ۱۹۱۷ء میں اقبال رقمطراز ہیں:

"حیدر آباد والا معاملہ ابھی بدستور ہے، یعنی اس میں خاموشی ہے۔ مہاراجہ کے خطوط آتے ہیں مگر ان میں کوئی اشارہ کنایہ اس بارے میں نہیں ہوتا۔ مجھے تو زیادہ تر خوشی اس وجہ سے ہے کہ آپ وہاں ہوں گے اور آپ کی صحبت میں مثنوی کی تکمیل میں آسانی ہوگی۔ دوسرا حصہ قریب الاختتام ہے۔ مگر اب تیسرا حصہ ذہن میں آرہا ہے اور مضامین دریا کی طرح اُمڈے آ رہے ہیں اور حیران ہو رہا ہوں کہ کس کس کو نوٹ کروں۔ اس حصہ کا مضمون ہو گا "حیات مستقبلہ اسلامیہ" یعنی قرآن شریف سے مسلمانوں کی آئندہ تاریخ پر کیا روشنی پڑتی ہے، اور جماعت اسلامیہ جس کی تاسیس دعوت ابراھیمی سے شروع ہوئی، کیا کیا واقعات و حوادث آئندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے۔ اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔ میری سمجھ اور علم میں یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود ہیں اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔ مَیں نے پندرہ سال تک قرآن پڑھا ہے اور بعض آیات و سورتوں پر مہینوں بلکہ برسوں غور کیا ہے اور اتنے طویل عرصے کے بعد مندرجہ بالا نتیجے پر پہنچا ہوں۔ مگر مضمون بڑا نازک ہے اور اس کا لکھنا آسان نہیں۔ بہرحال مَیں نے یہ قصد کر لیا ہے کہ اس کو ایک دفعہ لکھ ڈالوں گا اور اشاعت میری زندگی کے بعد ہو جائے گی، یا جب اس کا وقت آئے گا، اشاعت ہو جائے گی۔"

"تقریظ کے اشعار آپ نے خوب لکھے۔ مگر یہ اشعار تو پہلے حصے کی تقریظ کے لئے زیادہ موزوں ہیں۔ دوسرے حصے میں جو اب شائع ہو گا حیات ملّی یعنی اجتماعی زندگی کے اصول پر بحث ہے اور خالص اسلامی نکتہ خیال سے۔ اس کے علاوہ یہ اشعار بہت تھوڑے ہیں۔ میرا مقصد کچھ شاعری نہیں بلکہ (یہ ہے کہ) ہندوستان کے مسلمانوں میں

وہ احساس ملیہ پیدا ہو، جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا خاصہ تھا۔ اس قسم کے اشعار لکھنے سے غرض عبادت ہے، نہ (کہ) شہرت۔ کیا عجب کہ نبی کریم ؐ کو میری یہ کوشش پسند آجائے اور اُن کا استحسان میرے لئے ذریعہ نجات ہو جائے۔"

نیاز الدین خاں کے نام مکتوب (محررہ ۴ نومبر ۱۹۱۷ء) میں اقبال لکھتے ہیں:

"دوسرا حصہ انشاء اللہ اس سال سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ صرف چند اشعار کی کسر باقی ہے۔ اگر آج وہ اشعار لکھے جائیں تو ایک ہفتے کے اندر نقل کر کے کتاب مطبع میں دی جا سکتی ہے۔ مگر مَیں انتظار میں ہوں کہ وہ اشعار آئیں تو ان کو مثنوی میں داخل کروں۔ دوسرے حصے کے مضامین سے پہلے حصہ پر کافی روشنی پڑے گی اور بہت سی تشریحات جو پہلے حصے کے اشعار کی کی جا رہی ہے خود بخود غلط ہو جائے گی۔ اسلامی نیشنلزم کی حقیقت اس سے واضح ہو گی اور یہ کہنے میں کوئی مبالغہ یا خودستائی نہیں کہ اس رنگ کی کوئی نظم یا نثر اسلامی لٹریچر میں آج تک نہیں لکھی گئی۔"

سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب محررہ ۱۳ نومبر ۱۹۱۷ء میں اقبال رقمطراز ہیں:

"آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور اطمینان قلب کا باعث ہے۔ مَیں ایک مدت کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد انہیں نتائج پر پہنچا ہوں جو آپ کے والا نامے میں درج ہیں۔ جو کام آپ کر رہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ؐ آپ کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے۔ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوّف کا وجود ہی سر زمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے، جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے۔ آپ کو خیر القرون قرنی والی حدیث یاد ہو گی۔ اس میں نبی کریم صلعم فرماتے ہیں کہ میری امت میں تین قرنوں کے بعد سمن (ولیظہر فیہم السمن) کا ظہور ہو گا۔ مَیں نے اس پر دو تین مضامین اخبار "وکیل" امرتسر میں شائع کیے تھے جس کا مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ "سمن" سے مراد رہبانیت ہے جو وسط ایشیا کی اقوام میں مسلمانوں سے پہلے عام تھی۔ ائمہ محدثین نے جیسا کہ آپ کو معلوم ہے یہ لکھا ہے کہ اس لفظ سے مراد عیش پرستی ہے۔ مگر لسانی تحقیق سے محدثین کا خیال صحیح نہیں کھلتا۔ افسوس ہے کہ عدیم الفرصتی اور علالت کی وجہ سے مَیں ان مضامین کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکا۔ میرا تو عقیدہ ہے کہ غلو فی الزہد اور مسئلہ (وحدت)

وجود مسلمانوں میں زیادہ تر بدھ (بمنبت) مذہب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ خواجہ نقشبند اور مجدد سر ہند کی میرے دل میں بہت بڑی عزّت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ آج یہ سلسلہ بھی عجمیت کے رنگ میں رنگ گیا ہے۔ یہی حال سلسلہ قادریہ کا ہے جس میں مَیں خود بیعت رکھتا ہوں۔ حالانکہ حضرت محی الدین (عبدالقادر گیلانیؒ) کا مقصود اسلامی تصوف کو عجمیت سے پاک کرنا تھا.... مثنوی اسرار خودی کا دوسرا حصہ یعنی رموز بیخودی (اسرار حیات ملّیہ اسلامیہ) قریب الاختتام ہے، شائع ہونے پر ارسال خدمت کروں گا۔"

اس سال کے اختتام پر اقبال "رموز بیخودی" کے بارے میں نیاز الدین خاں کو یہ اطلاع مکتوبات محررہ ۲۷ نومبر و ۲۷ دسمبر ۱۹۱۷ء میں دیتے ہیں:

"مثنوی ختم ہو گئی۔ اسے نقل کر رہا ہوں۔ چند روز کے بعد پریس میں دے دی جائے گی۔"

"مثنوی کل سنسر کے محکمے سے واپس آ گئی ہے۔ انشاء اللہ آج کاتب کے حوالے کی جائے گی۔"

۱۹۱۸ء

اس سال کے شروع میں مثنوی کا دوسرا حصہ "رموز بے خودی" شائع ہوا۔ تصوف پر جو بحث مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "ستارۂ صبح" میں جاری تھی، اقبال نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کیا (خط بنام شاد ۲۰ جنوری ۱۹۱۸ء) اسی مکتوب کے آخر میں عثمانیہ یونیورسٹی کے دارالترجمہ کے بارے میں اقبال لکھتے ہیں:

"حیدری صاحب تو اقبال کو بلاتے بلاتے رہ گئے۔ یونیورسٹی کے کاغذات ان کی طرف سے کبھی کبھی آ جاتے ہیں کہ یہیں سے مشورہ لکھوں۔ ادھر سے مولوی عبدالحق صاحب اصطلاحات علمیہ کی ایک طویل فہرست ارسال کرتے ہیں کہ ان کے تراجم اردو پر تنقید کروں۔ گویا ان بزرگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اقبال کو کوئی اور کام نہیں۔ ترجمہ کرنے والوں کو معقول تنخواہیں دے کر بلایا ہے تو یہ کام بھی انہیں سے لینا چاہیے۔ اصل میں یہی حصہ ان کے کام کا مشکل ہے۔"

سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب محررہ ۲۸ اپریل ۱۹۱۸ء میں اقبال لکھتے ہیں :

"والا نامہ ابھی ملا ہے۔ رموز بیخودی مَیں نے ہی آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ ریویو کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آج مولانا ابوالکلام کا خط آیا ہے۔ انہوں نے بھی میری اس ناچیز کوشش کو بہت پسند فرمایا ہے۔ مولانا شبلی رحمتہ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں۔ اقبال آپ کی تنقید سے مستفید ہو گا۔ اسرار خودی کا دوسرا ایڈیشن تیار کر رہا ہوں۔ عنقریب آپ کی خدمت میں مُرسل ہو گی۔"

سید سلیمان ندوی نے "معارف" میں "رموز بیخودی" پر تبصرہ کیا۔ اس کے بعد کئی خطوط میں صحت الفاظ و محاورات کے بارے میں ان سے خط و کتابت رہی۔ ۲۳ مئی ۱۹۱۸ء کے مکتوب میں "معارف" کے لیے ایک اردو نظم ارسال کی گئی (سات اشعار) جس کا پہلا شعر درج ذیل ہے ("بانگ درا میں صفحہ ۲۸۴ پر "مَیں اور تو" کے عنوان سے یہ نظم ۹ شعروں پر مشتمل ہے) :

نہ سلیقہ مجھ میں کلیمؑ کا نہ قرینہ تجھ میں خلیلؑ کا
مَیں ہلاک جادوے سامری تو قتیل شیوۂ آزری

مہاراجہ شاد کے نام مکتوب محررہ ۱۱ جون ۱۹۱۸ء میں اقبال لکھتے ہیں :

"کئی دن گزر گئے مَیں نے ایک عریضہ ارسال خدمت کیا تھا اور ساتھ ہی اس کے ایک نسخہ رموز بیخودی کا بھی ڈاک میں ڈالا تھا۔ مگر نہ خط کا جواب ملا، نہ مثنوی کی رسید.... بندۂ روسیاہ کبھی کبھی تہجد کے لئے اٹھتا ہے اور بعض دفعہ تمام رات بیداری میں گزر جاتی ہے۔ سو خدا کے فضل و کرم سے تہجد سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دعا کروں گا کہ اس وقت عبادت الٰہی میں بہت لذت حاصل ہوتی ہے۔"

۱۱ جون ۱۹۱۸ء ہی کو اقبال، اکبر کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں :

"... اسرار خودی میں حافظ پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو خارج کر کے اور اشعار لکھے ہیں جن کا عنوان یہ ہے : "درحقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ" ان اشعار کو پڑھ کر مجھے یقین ہے کہ بہت سی غلط فہمیاں دُور ہو جائیں گی اور میرا اصل مطلب واضح ہو جائے گا... کعبہ و کاشی کے سوا کوئی اور مقام بھی ہو گا۔ مگر خدارا آج کل صرف کعبہ ہی بتائیے۔ ورنہ مسلمانوں کی جمعیّت کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ اس وقت اسلام کا دشمن

سائنس نہیں جیسا کہ بعض لوگ نادانی سے سمجھے بیٹھے ہیں۔ اسلام کی پوزیشن سائنس کے خلاف نہایت مضبوط ہے، مگر اس کا دشمن یورپ کا Territorial Nationalism ہے جس نے ترکوں کو خلافت کے خلاف اکسایا۔ مصر میں، مصر "مصریوں کے لئے" کی آواز بلند کی، اور ہندوستان کو "Pan Indian Democracy" کا بے معنی خواب دکھایا۔"

پھر ۲۰ جولائی ۱۹۱۸ء کے مکتوب میں اکبر کو یہ لکھا گیا:

"حقیقی اسلامی بیخودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیّلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکامات کا پابند ہو جانا ہے۔ اس طرح پر کہ اس کی پابندی کے نتائج سے انسان بالکل لاپرواہ ہو جائے اور محض رضا و تسلیم کو اپنا شعار بنائے۔ یہی اسلامی تصوف کے نزدیک "فنا" ہے۔"

اس سال کے آخر میں اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر فلسفہ ڈاکٹر بیگ کی وفات پر اقبال کو دو ماہ کے لیے ایم۔ اے فلسفہ کی کلاس کو پڑھانا پڑا۔ اس سلسلے میں وہ اکبر کو لکھتے ہیں (۲۸ نومبر ۱۹۱۸ء):

"لڑکے شام کو ہر روز میرے مکان پر آ جاتے ہیں۔ دن میں جو تھوڑی بہت فرصت ملتی ہے، اس میں ان کے لئے لیکچر کے لئے کتب دیکھتا ہوں۔ لیکچر کیا ہیں، انسان کی ذہنی مایوسیوں اور ناکامیوں کا افسانہ ہے جسے عرف عام میں تاریخ فلسفہ کہتے ہیں۔ ابھی کل شام ہی مَیں اُن کو آپ کا یہ شعر سنا رہا تھا:

مَیں طاقتِ ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تُل کر، نظر بھی مجھ کو ملی ہے نَپ کے

سبحان اللہ! کیا خوب کہا ہے۔ جزاک اللہ!"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے ایسٹ اینڈ ویسٹ کے اگست ۱۹۱۸ء کے شمارے میں مثنوی "اسرار و رموز" پر سیر حاصل تبصرہ انگریزی میں کیا، جسے اقبال نے پسند کیا۔ اہل مغرب بھی اس مثنوی سے روشناس ہوئے۔

۱۹۱۹ء

نومبر ۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ اتحادی طاقتوں نے انجمن اقوام متحدہ قائم کرکے اس کے سائے تلے مفتوحہ علاقوں، خصوصاً عثمانی سلطنت کی انتداب کے نام پر بندر بانٹ شروع کی اور اپنے اپنے مقبوضات میں خوف و دہشت کی فضا پیدا کی۔ برصغیر میں ہنگامی قانون دفاع ہند کی جگہ رولیٹ ایکٹ کا نفاذ ضروری سمجھا گیا۔ اس جابرانہ قانون کے خلاف عوامی جذبات برانگیختہ ہوئے تو حکومت نے جبرو تشدد سے اسے دبانا چاہا۔ امرتسر میں ۱۰ اپریل کو حالات قابو سے باہر ہوگئے اور ۱۳ اپریل کو یہاں جلیانوالہ باغ کا سانحہ (قتل عام کی صورت میں) رونما ہوا۔ پنجاب کے اکثر اضلاع میں مارشل لاء نافذ کرکے خوف و دہشت کا ماحول بنایا گیا۔ اسی دوران عثمانی ترکوں کی حمایت میں جنوبی ایشیا میں تحریک خلافت کا بھی آغاز ہوا۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء کے اجلاس بہ یک وقت ہوئے اور تحریک شدّومد سے آگے بڑھنے لگی اور اگلے سال ترکِ موالات، ہجرت وغیرہ کے سلسلے شروع ہوئے۔ اس طرح جنگ عظیم کے بعد ہندوستان کی ساکن فضا میں ایک طوفان برپا ہوا جس نے برطانوی استعمار کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔

اقبال کسی تحریک میں عملاً تو شریک نہیں ہوئے لیکن فکری رہنمائی میں وہ پیچھے بھی نہیں رہے۔ ۱۹۱۹ء اور اگلے برسوں میں ان کا ذہن اس ظاہری جوش و خروش کے اندر کارفرما احوال کا تجزیہ کرتا رہا جس کی مختصر کیفیت حسب موقع آگے آئے گی۔

نیاز الدین خاں کے نام مکتوب (محررہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء) میں اقبال کی یہ تحریر دلچسپ ہے:

"کیا خوب، آپ نے سُنا کہ اقبال نے وکالت چھوڑ دی۔ شاید یہ بھی کسی نے کہا ہو کہ کسی جنگل میں کُٹیا بنا لی ہے اور ہاؤ ہُو کے نعرے بلند کر رہا ہے! بہرحال روزی کے لئے سب ڈھنگ ہیں۔ بیرسٹری چھوڑے گا تو کوئی اور ڈھنگ اختیار کرنا ہو گا۔ کسی نے خوب گپ اُڑائی ہے۔ معلوم نہیں اس کا مقصد اس خرافات سے کیا تھا۔"

۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام خط میں اقبال لکھتے ہیں:

"... الحمدللہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی۔ کیف باطن میں بالخصوص آج کل "صحو" ہی کی ضرورت ہے۔ نبی کریمؐ نے صحابہؓ کی تربیت اسی حال میں کی

تھی۔ "سُکر" کی حالت عمل کی دشوار گذار منزل کو طے کر لینے کے بعد ہو تو مفید ہے۔ باقی حالات میں اس کا اثر روح پر ویسا ہی ہے جیسا جسم پر افیون کا۔ مولانا آزاد اب کہاں ہیں؟ پتہ لکھئے کہ ان کی خدمت میں عریضہ لکھوں۔"

اکبر الہ آبادی کے نام مکتوب (محررہ ۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء) میں اقبال لکھتے ہیں:

"لاہور کے حالات آپ نے اخباروں میں دیکھ لیے ہوں گے۔ گاندھی صاحب کا خاموش مقابلہ یہاں تک رنگ لایا ہے کہ حکام لاہور اور پنجاب کے دیگر مقامات میں مارشل لاء (آئین عسکری) کے اجراء پر مجبور ہو گئے... آپ سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے مگر یہ زمانہ گھر سے باہر نکلنے کا نہیں۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کے لوگوں کی حالت پر رحم کرے۔"

مولانا اسلم جیراجپوری کے نام مکتوب محررہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں اقبال لکھتے ہیں:

"آپ کا تبصرہ اسرار خودی پر "الناظر" میں دیکھا ہے جس کے لیے مَیں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں۔ خواجہ حافظ پر جو اشعار مَیں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔ خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن، حُسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں، خواہ مضر، تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔ بہرحال مَیں نے وہ اشعار حذف کر دئے ہیں اور ان کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو مَیں صحیح سمجھتا ہوں... تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرون اولیٰ میں اس کا لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے!"

شاد کے نام ۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء کو تحریر کردہ مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"پنجاب میں عید امسال بہت سی قربانیاں لے کے گئی۔ تاہم مبارک ہے کہ انشاء اللہ نتائج مبارک ہوں گے۔"

سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب (محررہ ۲۷ ستمبر ۱۹۱۹ء) کے ساتھ اقبال نے ایک نظم "دریوزۂ خلافت" "معارف" کے لیے ارسال کی جو بانگ درا میں معمولی سی ترمیم کے بعد متذکرہ عنوان سے شامل ہوئی:

بہت آزمایا ہے غیروں کو تُو نے
مگر آج ہے وقت خویش آزمائی
اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے
تُو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا؟
خلافت کی کرنے لگا تُو گدائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشائی
"مرا از شکستن چنیں عار ناید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی"

"نوازش نامہ ملا۔ عنوان جو آپ نے تجویز فرمایا ہے، ٹھیک ہے۔ (۱) تبصرہ کے متعلق میں بھی یہی مشورہ دوں گا کہ میرا مجموعہ شائع ہو لے تو لکھئے۔ (۲) فی الحال میں ایک مغربی شاعر کے دیوان کا جواب لکھ رہا ہوں جس کا تقریباً نصف حصہ لکھا جا چکا ہے (۳) کچھ نظمیں فارسی میں ہوں گی کچھ اُردو میں۔ کلام کا بہت سا حصہ نظرثانی کا محتاج ہے لیکن اور مشاغل اتنی فرصت نہیں چھوڑتے کہ ادھر توجہ کر سکوں۔ تاہم جو کچھ ممکن ہے کرتا ہوں۔ شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمح نظر نہیں رہا لہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لئے وقت نہیں۔ مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس۔ اس بات کو مدنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں۔ اس واسطے کہ آرٹ (فن) غایت درجہ کی جانکاہی چاہتا ہے اور یہ بات موجودہ حالات میں میرے لئے ممکن نہیں۔ جرمنی کے دو بڑے شاعر بیرسٹر تھے۔ یعنی گوئٹے اور اوہلنڈ۔ گوئٹے تھوڑے دن پریکٹس کے بعد ویمر کی ریاست کا تعلیمی مشیر بن گیا اور

اس طرح فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کا اسے پورا موقع مل گیا۔ اوہلنڈ تمام عمر مقدمات پر بحث کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت تھوڑی نظمیں لکھ سکا، اور وہ کمال پورے طور پر نشوونما نہ پا سکا جو اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ غرض یہ کہ موجودہ حالات میں میرے افکار اس قابل نہیں کہ ان کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دل و دماغ صرف ہو۔ لیکن اگر احباب تبصرہ پر مُصِر ہیں تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے۔ اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت بھی مختصر طور پر لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے دلوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہو گا۔"

۹ نومبر ۱۹۱۹ء کو نیاز الدین خان کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مسئلہ خلافت ایک خالص مذہبی مسئلہ ہے۔ اس خیال سے کہ اس مسئلے سے متعلق مسلمانوں کو امر بالمعروف کرنا میرا فرض ہے، جلسے میں چلا گیا۔ سیکرٹری شپ انجمن حمایت اسلام کے لئے مَیں کوئی کوشش نہیں کر رہا۔ مسلمان پبلک میرے سپرد یہ کام کرنا چاہتی ہے اور مَیں نے بعض معززین سے وعدہ کیا ہے کہ اگر عبدالعزیز صاحب مستعفی ہو جائیں تو مَیں یہ کام اپنے ذمے لے لوں گا۔"

۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء کو اقبال سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہو گا، بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچے میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں۔" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کیے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر، انگریزی و اردو موجود ہیں، جو غالبا مولوی صاحب کے پیش نظر نہ تھیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا۔ مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ اُن کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، تحریک الہلال نے اُسے مسلمان کیا۔ اُن کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں

مولانا ابوالکلام کی بڑی عزّت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی، مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اَوروں کی دل آزاری کی جائے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اقبال کے جو مذہبی خیالات اس سے پہلے سُنے گئے اُن میں اور مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے" معلوم نہیں انھوں نے کیا سُنا تھا اور سنی سنائی بات پر اعتبار کر کے ایسا جملہ لکھنا جس کے کئی معنی ہو سکتے ہوں، کسی طرح ان لوگوں کے شایان شان نہیں جو اصلاح کے علمبردار ہوں۔ مجھے معلوم نہیں مولوی فضل الدین صاحب کہاں ہیں ورنہ یہ موخر الذکر شکایت براہِ راست اُن سے کرتا۔ اگر آپ سے اُن کی ملاقات ہو تو میری شکایت اُن تک پہنچایئے۔"

شاد کے نام مکتوب محررہ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۹ء میں اقبال لکھتے ہیں :

"لاہور کے مسلمانوں نے ایک عام جلسے میں یہ قرار دیا ہے کہ جشن صلح میں شرکت نہ کی جائے۔ مَیں بھی اس جلسے میں شریک تھا۔ پولیٹیکل جلسوں میں کبھی شریک نہیں ہوا کرتا۔ اس جلسے میں اس واسطے شریک ہوا کہ ایک بہت بڑا مذہبی مسئلہ زیرِ بحث تھا۔"

۱۹ دسمبر کے مکتوب بنام نیاز الدین خان میں وضاحت کی گئی ہے:

"تقریر جو اس جلسے میں مَیں نے کی تھی وہ ایک ریزولیوشن کی تائید یا شاید تحریک میں تھی، مسئلہ خلافت پر نہ تھی۔ مذہبی پہلو اس (کا) حرمین کی حفاظت سے تعلق رکھتا ہے۔ اخباروں میں اس کا کچھ حصہ رپورٹ ہوا تھا۔"

۱۹۲۰ء

اقبال خلافت کمیٹی میں اس مسئلے کی مذہبی حیثیت کی وجہ سے شامل تھے۔ مگر جب خلافت کمیٹی نے قیادت کی باگ ڈور مسٹر ایم۔ کے گاندھی کے حوالے کر دی اور مسٹر گاندھی نے خلافت کمیٹی کو اپنے سیاسی مقاصد اور ایجی ٹیشن کی خاطر ایک سیڑھی بنا لیا تو اقبال کو خلافت کمیٹی سے لاتعلق ہو جانا پڑا۔ اسی اثناء میں خلافت کمیٹی کے ایک اہم رُکن مولانا ابو الکلام آزاد نے مسلمانوں کو ہند سے ہجرت کر جانے کا راستہ دکھایا۔ خلافت کمیٹی کا ایک وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں یورپی حکمرانوں سے اتمام حجت کے لیے روانہ ہوا۔ مسٹر گاندھی نے عدم تعاون اور حکومت کے خلاف اپنا پروگرام دیا،

جس پر یکم اگست ۱۹۲۰ء سے ملک گیر تحریک ترک موالات کا آغاز ہوگیا۔ خلافت کمیٹی کے بعد کانگرس کے اجلاس خصوصی کلکتہ (ستمبر ۱۹۲۰ء) میں بھی بحث و تمحیص کے بعد مسٹر گاندھی کا پروگرام منظور کر لیا گیا۔ اس طرح ہند ایک بڑی سیاسی تحریک کی زد میں آگیا۔ مسلمان، مسٹر گاندھی کی جاری کردہ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔

اقبال اس قسم کی عملی سیاست اور ایجی ٹیشن کو ناپسند کرتے تھے۔ وہ اس کے عواقب سے بھی باخبر تھے۔ تاہم ان کی ہمدردیاں قوم کے ساتھ تھیں۔ وہ بدلتے ہوئے ملکی اور بین الاقوامی حالات کا مطالعہ دقت نظر سے کرتے رہے۔ نیز اس سال بھی "پیام مشرق" کے کلام کی تخلیق کا سلسلہ جاری رہا۔ ہم اقبال کے اس نازک دور کے ذہنی رجحانات کو نیاز اور گرامی کے نام خطوط کے علاوہ ان کے اخباری بیانات میں دیکھ سکتے ہیں۔ نیاز الدین خان کے نام ۱۱ فروری ۱۹۲۰ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"... گرامی صاحب کی خدمت میں سلام علیکم عرض کیجئے۔ سنا ہے وہ مجھ پر ناراض ہیں کہ مَیں نے خلافت کمیٹی سے کیوں استعفا دے دیا۔ وہ لاہور آئیں تو ان کو حالات سے آگاہ کروں۔ جس طرح یہ کمیٹی قائم کی گئی اور جو کچھ اس کے بعض ممبروں کا مقصد تھا، اس کے اعتبار سے تو اس کمیٹی کا وجود میری رائے میں مسلمانوں کے لئے خطرناک تھا۔"

نیاز الدین خاں کے نام ایک دوسرے مکتوب مورخہ ۱۸ مئی ۱۹۲۰ء میں اقبال رقم طراز ہیں:

"مَیں نے نبی کریمؐ کو مخاطب کر کے ایک فارسی قصیدہ لکھنا شروع کیا ہے جس میں یہ سب مضامین انشاء اللہ آ جائیں گے۔ خدا کرے کہ یہ ختم ہو جائے۔ عرشی امرتسری نے چند شعر لکھ کر میرے زخم کو چھیڑ دیا۔ ان کا معمولی جواب تو مَیں نے "زمیندار" میں شائع کر دیا تھا جو آپ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ اصل جواب ابھی باقی ہے۔ ابھی چند اشعار ہی لکھے ہیں مگر ان کے لکھتے وقت قلب کی جو حالت ہوئی، اس سے پہلے عمر بھر کبھی نہ ہوئی تھی۔ دو شعر لکھتا ہوں:

بہر نذر آستانت از عجم آوردہ ام
سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من

تیغ لا در پنجہ ایں کافر دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ اِلّائے من"

اور پھر ۱۰ جون ۱۹۲۰ء کے تحریر کردہ مکتوب میں یہ لکھتے ہیں:

"افسوس یہ قصیدہ ابھی تک ختم نہ ہوا۔ البتہ کچھ شعر اور ہو گئے ہیں۔ کیا کیا جائے، یک سر و ہزار سودا۔ لیکن جو کچھ میرے دل میں ہے وہ کاغذ پر آگیا تو واقعی وہ قصیدہ ایسا ہی ہو گا کہ اسے وظیفہ میں داخل کیا جائے۔ اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ جو پروفیسر نکلسن نے کیا ہے تیار ہو کر پبلشر کے پاس چلا گیا ہے۔ امید ہے، دو چار ماہ میں شائع ہو جائے گا... گرمی کی شدت یہاں بھی ہے۔ اب تک صرف گیارہ روزے رکھ سکا ہوں۔ وسط ایشیا کی ہانڈی اُبل رہی ہے۔ خدا تعالیٰ اپنا فضل کرے:

تا بروید لالۂ آتش نژاد از خاکِ شام
باز سیرابش ز خوناب مسلماں کردہ اند

کونٹ ٹالسٹائی کا خیال تھا کہ "لالہ آتش نژاد" منگولین قوم سے پیدا ہو گا اور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ اس کا خروج یا ظہور کب ہو گا؟ اور وہ اس وقت روس میں ہے یا وسط ایشیا میں یا شام میں۔"

مولانا عبد القادر گرامی کو ۱۲ جولائی اور ۱۹ جولائی ۱۹۲۰ء کے مکتوبات میں اقبال لکھتے ہیں:

"سندھی مہاجرین کابل کا نظارہ بڑا رقت انگیز تھا۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں اسٹیشن پر ان کے استقبال کو حاضر تھے۔ اہل لاہور نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔"

"... آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ اسرار خودی کا انگلستان میں خوب چرچا ہو رہا ہے۔ کیمبرج یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے اس پر متعدد لیکچر دیئے ہیں اور اس کے مطالب پر مختلف ادبی سوسائٹیوں میں خوب بحث ہو رہی ہے۔ انگریزی ترجمہ موسم سرما میں شائع ہو گا۔ اس وقت پریس میں ہے۔ مسٹر محمد علی نے ایک پبلک ڈنر میں جس میں ایرانی و ترک و عرب تھے، تقریر کرتے ہوئے اس کے اشعار سنائے تو وہ لوگ محو حیرت و استعجاب ہو گئے۔ اس کی تفصیلی کیفیت اخبار بمبئی کرانیکل میں چھپی ہے۔ کل شوکت علی صاحب سے معلوم ہوا۔ مَیں نے خود وہ اخبار نہیں دیکھا۔"

محمد اکبر منیر کے نام ۴ اگست ۱۹۲۰ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ ہو گیا ہے۔ اس وقت پریس میں ہے۔ غالباً سردیوں میں شائع ہو گا۔ پروفیسر نکلسن کا خط آیا تھا۔ انھوں نے وہاں کی لٹریری سوسائٹیوں میں اس کتاب کے مضمون پر متعدد لیکچر دیئے ہیں جن کی وجہ سے اس نئے فلسفے کا وہاں بڑا چرچا ہے۔ اب میں گوئٹے کے "دیوان" کے جواب میں ایک دیوان فارسی لکھ رہا ہوں جس کا ایک تہائی حصہ لکھ چکا ہوں۔ اسرار خودی کا ترجمہ یورپ کی اور زبانوں میں بھی ہو جائے تو تعجب نہیں۔ میں نے سنا ہے فرانس میں بھی اس کا چرچا ہے۔ یہ غالباً پروفیسر نکلسن کے لیکچروں کی وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیوان کا ترجمہ بھی ضرور ہو گا۔ کیونکہ یورپ کی دماغی زندگی کے ہر پہلو پر اس میں نظر ڈالی گئی ہے اور مغرب کے سرد خیالات و افکار میں کسی قدر حرارت ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے... ہندوستان بالخصوص پنجاب سے بیشمار لوگ (مسلمان) افغانستان کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اس وقت تک پندرہ بیس ہزار آدمی (اور ممکن ہے کہ زیادہ) جا چکا ہو گا۔"

ترک موالات کے سلسلے میں مسلمانوں کی جوشیلی طبیعت جس راہ پر جا رہی تھی اور خلافت کے رُومانی انقلابی رہنماؤں نے جو مسلک اپنایا تھا، اقبال کو اس سے گہری تشویش تھی۔ ہجرت کا فیصلہ بھی اسی رومانی ترنگ کا نتیجہ تھا۔ علی گڑھ میں آزاد قومی یونیورسٹی (جامعہ ملیّہ) کا قیام عمل میں آیا، اور پھر اسلامیہ کالج لاہور اور دوسرے تعلیمی اداروں کے بائیکاٹ کا مسئلہ درپیش تھا۔ اقبال اس بارے میں قرآن حکیم کے حکم کے مطابق علماء کے کسی متفقہ فیصلے کو ضروری سمجھتے تھے۔ ان کی تحریر و تقریر و بیان میں اس مسئلے پر جوش جذبات کی بجائے ہوش مندی سے حق و صداقت کی راہ تلاش کرنے کا مشورہ ملتا ہے، اور فیصلہ وہ اجماعِ امّت پر چھوڑ دیتے ہیں۔

۲۸ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو نیاز الدین خان کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"علی گڑھ سے ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی۔ اسلامیہ کالج میں بھی وہی حالات پیدا ہو چلے ہیں۔ مگر طلبہ کو چھٹی دے دی گئی ہے اور الحاق کے بارے میں خود ان کی رائے میں بھی تبدیلی ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ اب اس بارے میں اراکین انجمن کو تردد نہ رہے گا۔ میری تو یہی رائے ہے کہ گرانٹ اور الحاق کے بارے میں جو فتویٰ علما کا ہو، اس پر عمل کرنا چاہیے۔ چونکہ واجب الطاعۃ امام اس وقت موجود نہیں، اس واسطے جمہور

مشاہیر علماء ہند کا فتویٰ ضروری ہو گا۔ صرف ایک عالم کا فتویٰ اس بارے میں کافی نہیں، خواہ وہ صحیح ہی کیوں نہ ہو۔ علماء کی غالب جماعت کا اس پر اتفاق ہونا چاہئے۔ ذاتی رائے میری خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اگر علماء کا فتویٰ میری ذاتی رائے کے خلاف ہو تو سر تسلیم خم ہے۔ جہاں تک مَیں اندازہ کرتا ہوں قرآن کے احکام اس بارے میں صاف و واضح ہیں۔ لیکن افسوس کہ بعض مشہور علماء فتویٰ دیتے ہوئے خائف ہیں۔ بعض کی خدمت میں مَیں نے خطوط لکھے ہیں، مگر اُمید نہیں کہ جواب ملے۔

"باقی رہا میرا ان لوگوں سے ہم خیال ہونا۔ ہم خیالی صرف اسی حد تک ہے جس حد تک قرآن کا حکم ہو اور بس۔ اخباروں میں انہوں نے شائع کیا ہے کہ اقبال نے قومی آزاد یونیورسٹی سے متعلق مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ یوں تو مسلمانوں کے معاملات میں اگر مجھ سے مدد طلب کی جائے تو مجھے تعمیل حکم میں کیونکر تامل ہو سکتا ہے۔ تاہم جو کچھ اخباروں میں لکھا گیا ہے بالکل غلط ہے۔ میرے ساتھ اُن کی کوئی گفتگو اس بارے میں نہیں ہوئی۔"

اس سلسلۂ بحث میں اقبال نے ایک طویل بیان بصورت مراسلہ روزنامہ "زمیندار" میں اشاعت کے لیے بھیجا۔ یہ بیان ۱۵ نومبر ۱۹۲۰ء کو لکھا گیا۔ اسی دن رونامہ "زمیندار" میں اسلامیہ کالج کے الحاق کے مسئلے پر انجمن حمایت اسلام کے اجلاس منعقدہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۰ء کی کارروائی شائع ہوئی تھی۔ اس مراسلے کے مندرجہ ذیل حصے مسئلہ زیر بحث کے بارے میں اقبال کے موقف کی وضاحت کرتے ہیں:

"اس وقت مسلمانوں کی بدنصیبی سے اس ملک میں یا اور اسلامی ممالک میں کوئی واجب الطاعۃ امام موجود نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے فرمایا تھا کہ واجب الطاعۃ امام نہ ہونے کی صورت میں خلافت کمیٹی کا فتویٰ واجب الطاعۃ ہے، مَیں نے ان کے دلائل نہیں سُنے۔ اس وقت تک مجھے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں۔ ممکن ہے ان کے دلائل سننے کے بعد میری رائے بدل جائے۔ فی الحال تو میرے نزدیک یہی راہ کُھلی ہے اور یہی راہ شریعت کی رُو سے بھی انسب و اولیٰ ہے کہ حضرات علماء ایک جگہ جمع ہو کر ہر قسم کا اعتراض سننے اور پورے بحث و مباحثہ کے بعد مسلمانوں کے لئے ترک موالات کا ایک پروگرام مرتب کریں۔ اس جمعیّت میں حضرات مشائخ، بڑے بڑے حنفی

علماء اور اگر ضروری ہو تو شیعہ اور اہل حدیث علماء بھی جن کے علم و تقویٰ پر قوم کو اعتماد ہو، طلب کیے جائیں۔ میرے خیال میں ایسے حضرات کا انتخاب کوئی مشکل امر نہیں۔ مسلمان وکلاء بھی اس بحث میں شریک ہو کر کم از کم سائل کی حیثیت سے مدد دیں۔ حضرات علماء کے لیے بھی یہ ایک نادر موقع ہے کہ وہ آپس کے اختلافات کو رفع کر کے اُمّتِ مرحومہ پر اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کریں۔ خدا تعالیٰ نے ایسے اسباب پیدا کر دیے ہیں کہ یہ بھٹکا ہوا آہو پھر خود بخود حرم کی طرف آ رہا ہے:

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز

ایسے حالات قوموں کی زندگی میں شاذ ہی پیدا ہوا کرتے ہیں اور اگر ان حالات سے حضرات مشائخ و علماء نے فائدہ نہ اٹھایا اور مسلمانوں کی رہنمائی کر کے ان کو اپنے بچھڑے ہوئے محبوب یعنی شریعت حقہ اسلامیہ سے نہ ملا دیا تو اس ملک میں مسلمانوں کا بحیثیت ایک مذہبی جماعت کے خاتمہ تصور کرنا چاہیے اور وہ مسلمانان ہند کی اس ہلاکت کے لیے قیامت کے دن نبی کریم (صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم) کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ اگر اس کانفرنس میں علماء کے انتخاب اور اس کے مجموعی عمل میں دیانت و امانت سے کام لیا گیا تو مسلمانان ہند کی زندگی میں وہ عظیم اخلاقی اور روحانی انقلاب پیدا ہو گا جس کے لئے شاہ ولی اللہ کی روح تڑپتی تھی۔"

"جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ حالات حاضرہ محض ایک سیاسی مفہوم رکھتے ہیں اور پختہ کاران سیاست ہی اس کے فیصلے کے اہل ہیں اور مسند نشینان پیغمبرؐ کو ان حالات سے کچھ سروکار نہیں، وہ میری رائے ناقص میں ایک خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں جو حقائق و تاریخ اسلامیہ اور شریعت حقہ کے مقاصد کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی کوئی حالت ایسی نہیں جس پر فقہائے اسلام نے حیرت انگیز چھان بین نہ کی ہو۔ اگر مسلمان اس خدا کے دیئے ہوئے قانون سے فائدہ نہ اٹھائیں تو ان کی بدنصیبی ہے۔ شارع امی (بابی انت و امی) نے تو وہ اصول بتائے ہیں کہ ان کی ہمہ گیری کے سامنے حال کے مغربی فقہا کا تفقہ جس پر ہمارے وکیلوں اور بیرسٹروں کو ناز ہے ایک طفل مکتب کی ابجد خوانی نظر آتا ہے۔"

"جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس وقت جو معاملات زیر بحث ہیں محض سیاسی

ہیں وہ جمعیّت اسلام کی ہیئت اور اس کے مقاصد سے بالکل بے خبر ہیں۔ اسلام کے نزدیک مسلمان کا کوئی فعل انفرادی ہو یا اجتماعی مذہب کی ہمہ گیری سے آزاد نہیں اور بر خلاف دیگر مذاہب کے اسلام نے زندگی کے ہر پہلو کے لئے احکام وضع کیے ہیں۔ ہم مسلمانوں کے عقیدے کی رُو سے انفرادی، ملّی اور بین الملی قانون کا اصل الاصول الہام الٰہی پر مبنی ہے اور اسلام کا ہر فعل اگر اس کا محرک اللہ اور رسول ؐ کی رضا جوئی ہے تو وہی فعل قربِ الٰہی کا باعث ہے، خواہ اس کا اثر فاعل کی اپنی ذات پر پڑتا ہو، خواہ دیگر اقوام پر۔ وہ سیاست جو مذہب سے معرّا ہو ضلالت و گمراہی ہے اور وہ مذہب جو اپنے احکام میں تمام ضروریات انسانی کو ملحوظ نہیں رکھتا ایک قسم کی ناقص رہبانیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض مغربی خیالات ایک نامحسوس زہر کی طرح ہمارے دماغوں میں سرایت کر گئے ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ نوجوان بے تحاشا اس خیال کا اظہار کرتے ہیں اور قوم کو بھی اس پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ اُن کو اس بات کا احساس تک نہیں کہ یہ خیال کم از کم اسلام کے لئے زہر قاتل ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود یورپ کے حکماء جو اس خیال کے بانی ہیں اور جن سے ہمارے نوجوانوں نے یہ سبق سیکھا ہے، اب اس ہیبت ناک جنگ کے بعد جو اسی شیطانی اُصول کا نتیجہ تھی، اس خیال کی صحت میں متامل نظر آتے ہیں۔"

۱۹۲۱ء

"اسرار خودی" کے انگریزی ترجمہ از ڈاکٹر نکلسن پر مغرب کے اخبارات میں تبصرے جاری تھے۔ بعض تبصرے اقبال کی نظر سے بھی گزرے۔ وہ اس پر مسرور بھی تھے اور متعجب بھی۔ نیاز الدین کے نام ۲۱ جنوری ۱۹۲۱ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اَسرارِ خودی کا ترجمہ انگریزی میں ہُوا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے اخباروں میں عجیب و غریب ریویو اس پر شائع ہو رہے ہیں۔ اس وقت تک تین ریویو میری نظر سے گزرے ہیں۔ مَیں نے سنا ہے کہ پچاس ریویو شائع ہو چکے ہیں۔ نکلسن نے جو دیباچہ لکھا ہے، وہ پڑھنے کے قابل ہے۔ یورپ کے پڑھے لکھے آدمیوں میں امید نہیں

کہ یہ کتاب مقبول ہو، کیونکہ زندگی کے اعتبار سے وہ ممالک خود پیری کی منزل تک پہنچنے کو ہیں۔ نوجوان ملکوں پر اس کا اثر یقینی ہے، یا ایسی اقوام پر جن کو خدا تعالیٰ نئی زندگی عطا کرے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کی اشاعت ایک اور کتاب کے لئے جو مَیں لکھ رہا ہوں (پیام مشرق) زمین تیار کر دے گی۔ اس کا "یورپ میں مقبول ہونا بہت ممکن ہے۔ گو ہندوستان میں شاید وہ بھی مقبول نہ ہو۔ بہرحال یہ محض قیاسات ہیں۔ قلوب کے حال سوائے خدا کے اور کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔"

اسرار خودی کے انگریزی مترجم ڈاکٹر نکلسن کے نام اقبال نے ایک مکتوب (مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۲۱ء) ارسال کیا جس میں متذکرہ بالا چند تبصروں کا محاکمہ کیا، اور بعض غلط فہمیوں کو دُور کرکے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کی۔ اس مکتوب کے ضروری حصوں کا ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے:

"مائی ڈیئر ڈاکٹر نکلسن، پروفیسر شفیع کے نام آپ کے مکتوب سے یہ جان کر مجھے ازحد مسرت ہوئی کہ "اسرار خودی" کے ترجمے کی انگلستان میں بہت پذیرائی ہوئی۔ تاہم، بعض انگریز تبصرہ نگاروں کو میرے اور نطشے کے بعض خیالات کی سطحی مشابہت سے غلط فہمی ہوئی ہے۔ ایتھنیم (Athenaeum) کے نامہ نگار کے خیالات بہت حد تک حقائق کی غلط فہمی پر مبنی ہیں جس کے لیے اسے بھی ذمے دار قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ اسے اگر میری ان اردو نظموں کی تاریخ اشاعت معلوم ہوتی جن کا اس نے اپنے تبصرے میں حوالہ دیا ہے، تو میری ادبی سرگرمیوں کے نشوو ارتقا سے متعلق اس کا زاویۂ نگاہ بالکل مختلف ہوتا۔ وہ انسان کامل کے بارے میں میرے نظریے کو صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ اور اس نے خلط مبحث کرکے اسے جرمن مفکر کے نظریہ فوق البشر سے ملا دیا ہے۔ بیس سال سے اوپر عرصہ ہوا جب مَیں نے انسان کامل کے صوفیانہ تصور پر ایک مضمون لکھا تھا اور یہ وہ زمانہ تھا کہ مَیں نے نطشے کے خیالات نہ ابھی پڑھے تھے، اور نہ سُنے تھے۔ یہ مضمون اس وقت "انڈین اینٹی کوری" میں شائع ہوا تھا اور بعدازاں ۱۹۰۸ء میں میری تالیف "پرشین میٹا فزکس" کا جزو بنا۔ انگریز قارئین کے لیے مناسب یہ ہے کہ وہ میرے خیالات کو جرمن مفکر کی وساطت سے دیکھنے کی بجائے اپنے ہم وطن ایک عظیم مفکر کے نظریات کو اپنا رہنما

بنائیں۔ میری مراد الیگزانڈر سے ہے جس کے گفرڈ لیکچرز، جو گلاسکو میں دیے گئے، گذشتہ برس شائع ہوئے۔ ان خطبات میں اس نے خدا اور الوہیت کے عنوان سے جو باب لکھا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے (بحوالہ صفحہ ۳۴۷)

مگر مسٹر ڈکنسن کا ریویو مجھے سب سے زیادہ دلچسپ نظر آیا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے متعلق چند باتیں عرض کروں۔

(۱) مسٹر ڈکنسن کے نزدیک مَیں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے آمال قرار دیا ہے۔ انہوں نے مجھے مکتوب لکھا ہے جس میں یہی خیال ظاہر کیا ہے۔ مگر انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ مَیں روحانی قوت کا تو قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا۔ جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوت پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رُو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ لیکن مَیں ان تمام جنگوں کی مذمّت کرتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو۔ تاہم، مسٹر ڈکنسن نے یہ صحیح کہا ہے کہ جنگ خواہ حق و صداقت کی حمایت میں ہو، خواہ ملک گیری اور فتح مندی کی خاطر، تباہی اور بربادی اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ اس لیے بہرصورت اس کے استیصال کی سعی کرنی چاہیے۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ معاہدے، لیگیں، ثالثیاں، کانفرنسیں جنگ وجدل کا استیصال نہیں کرسکتیں۔ اگر اس سعی و کاوش میں، ہمیں پہلے سے مؤثر طور پر کامیابی بھی ہو جائے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ استعمار پسند اقوام جن قوموں کو تہذیب و تمدّن میں اپنا ہمسر نہیں سمجھتیں، انہیں اپنے جَور و جبر اور استحصال کا شکار بنانے کے لیے زیادہ پُرامن وسائل اختیار کرلیں گی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسی زندہ شخصیت کی ضرورت ہے جو ہمارے معاشرتی مسائل کی پیچیدگیاں سلجھائے، ہمارے تنازعات کا فیصلہ کرے اور بین الاقوامی اخلاق کی بنیاد مستحکم طور پر استوار کردے---!

(۲) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے "فلسفہ سخت کوشی" کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے میرے ان خیالات کو بنیاد بنایا ہے جو مَیں نے حقیقت کے متعلق اپنی مثنوی میں ظاہر کیے ہیں۔ میرے عقیدے کے مطابق حقیقت ایسے اجزا کا مرکب ہے جو تصادم کے واسطے سے ربط و امتزاج پیدا کر کے "کُل" کی صورت میں

تبدیلی کی سعی کر رہے ہیں، اور یہ تصادم لامحالہ اُن کی شیرازہ بندی اور ارتباط پر منتج ہوگا۔ دراصل بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقا کے لیے تصادم نہایت ضروری ہے۔ نطشے بقائے شخصی کا منکر ہے۔ جو لوگ حصول بقا کے آرزو مند ہیں، وہ ان سے کہتا ہے "کیا تم ہمیشہ کے لیے زمانے کے کندھوں پر بوجھ بنے رہنا چاہتے ہو۔" وہ یہ کہنے پر اس لیے مجبور ہوا کہ زمانے کے متعلق اس کا تصور غلط تھا۔ اس نے کبھی مسئلہ زمان کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ بخلاف اس کے میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام تر قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں عمل کی تمام صورتوں اور اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے، ضروری سمجھتا ہوں۔ اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام و استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر مَیں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک اور بے عملی پر محدود ہو، مردود قرار دیا ہے۔ تصادم سے میری دلچسپی سیاسی حیثیت سے نہیں بلکہ مَیں اسے اخلاقی حیثیت سے ضروری سمجھتا ہوں، جبکہ اس بارے میں نطشے کے خیالات کا مدار غالباً سیاست ہے۔ جدید طبیعیات (فزکس) سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مادی قوت کے جزو لاتجزیٰ نے ہزارہا سال تک ارتقائی مدارج طے کرنے کے بعد موجودہ صورت اختیار کی ہے، پھر بھی وہ فانی ہے اور اسے مٹا دیا جاسکتا ہے۔ قوت ذہنی یا یوں کہہ لیجئے کہ جسم انسانی کے ذرہ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ صدہا برس کی مسلسل جدوجہد اور تصادم و پیکار کے بعد وہ موجودہ صورت تک پہنچا ہے، پھر بھی عوارض ذہنی کے مظاہر مختلفہ سے اس کی بے ثباتی اور عدم استحکام ظاہر ہے۔ اگر وہ بدستور قائم و باقی رہنا چاہتا ہے تو یقیناً وہ ماضی کے درس عبرت کو فراموش نہیں کرسکتا۔ اسے لامحالہ ان قوتوں سے اپنے قیام کی خاطر استمداد کرنی پڑے گی جو آج تک اس کے استحکام کی ضامن رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ فطرت کا ارتقا ان قوتوں میں اصلاح کر دے۔ یا ان میں سے بعض کو (مثلاً تصادم اور جنگ و پیکار کو جو استحکام کے قوی عوامل میں سے ہیں) جو اس کے ارتقا کی کفیل بنی رہی ہیں، بالکل مٹا دے، اور اس کے استحکام و بقا کی خاطر بعض ایسی قوتیں عرصۂ شہود میں لے آئے جن سے انسان آج تک نا آشنا رہا ہے۔

لیکن مَیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ مَیں اس باب میں کسی نصب العین کا پرستار نہیں ہوں۔ اس لیے میرے نزدیک اس نوع کے انقلاب کا زمانہ ابھی بہت دُور ہے اور مجھے اندیشہ ہے کہ یورپ کی جنگ عظیم میں انسان کی بصیرت و موعظت کا جو سرمایہ پنہاں ہے وہ اس سے عرصہ دراز تک متمتع نہ ہوسکے گا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مَیں نے محض اخلاقی زاویۂ نظر سے تصادم و پیکار کو ضروری قرار دیا ہے۔ افسوس کہ مسٹر ڈکنسن نے "فلسفۂ سخت کوشی" کے اس پہلو کو نظرانداز کر دیا ہے۔

(۳) مسٹر ڈکنسن نے آگے چل کر میرے فلسفے کے متعلق فرمایا ہے کہ وہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے۔ لیکن باعتبار اطلاق و انطباق مخصوص و محدود ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا یہ ارشاد صحیح ہے۔ انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں ہمیشہ عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو اپنا مخاطب اوّلین نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کر دیں گے جو ایک مستقل عقیدہ اور معیّن راہ عمل رکھتی ہو، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے۔ اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا، جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے، نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ رینان کا یہ خیال غلط تھا کہ سائنس اسلام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ دراصل، اسلام بلکہ کُل عالم انسانی کا سب سے بڑا دشمن رنگ و نسل کا عقیدہ ہے۔ اور جو لوگ نوع انسان سے محبت رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ ابلیس کی اس خوفناک اختراع کے خلاف علم جہاد بلند کر دیں۔ جب سے مَیں یہ دیکھ رہا ہوں کہ قومیت کا یہ عقیدہ جس کی بنیاد نسل یا جغرافیائی حدود ملک پر ہے، دنیائے اسلام میں قبولیت حاصل کر رہا ہے اس وقت سے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مسلمان اپنے عالمگیر اخوت کے نصب العین کو نظرانداز کرکے اس عقیدے کے فریب میں مبتلا ہو رہے ہیں جو قومیت کو ملک و وطن کی حدود میں مقیّد رکھنے کی تعلیم دیتا ہے۔ اس لیے مَیں ایک مسلمان اور ہمدرد نوع انسانی کی حیثیت سے انہیں یہ یاد دلانا اپنا فرض عین سمجھتا ہوں کہ ان کا حقیقی فریضہ کُل بنی آدم کی نشوو ارتقا ہے۔

نسل اور حدود ملک کی بنیاد پر قبائل اور اقوام کی تنظیم حیات اجتماعی کی ترقی اور تربیت کا ایک وقتی اور عارضی پہلو ہے۔ اگر اسے یہی حیثیت دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن مَیں اس بات کا شدت سے مخالف ہوں کہ اسے انسانی قوت عمل کا مظہر اتم قرار دیا جائے۔ مجھے اسلام سے اس لیے بھی ازبس اُنس ہے کہ یہی جماعت میرے مقاصد کے لیے موزوں واقع ہوئی ہے۔ مسٹر ڈکنسن کا یہ خیال بھی مغالطے سے خالی نہیں کہ اسلامی تعلیمات کی روح کسی خاص گروہ سے مختص ہے۔ اسلام تو کُل انسانیت کے اتحاد عمومی کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کے تمام جزوی اختلافات سے قطع نظر کر لیتا ہے اور کہتا ہے:

تعالوا الیٰ کلمۃٍ سوآءٍ بیننا و بینکم (آل عمران : ۶۴)

[(اے اہل کتاب!) آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں اور تم میں برابر ہے]

میرے خیال میں مسٹر ڈکنسن کا ذہن ابھی تک یورپ والوں کے اس قدیم عقیدے سے آزاد نہیں ہوا کہ اسلام سفاکی اور خونریزی کا درس دیتا ہے۔ دراصل خدا کی ارضی بادشاہت صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص نہیں، بلکہ تمام انسان اس میں داخل ہوسکتے ہیں، بشرطیکہ وہ نسل اور قومیت کے بتوں کی پرستش ترک کر دیں اور ایک دوسرے کی شخصیت کو تسلیم کر لیں۔ انجمنیں، حکم برداریاں (انتداب) اور اس قسم کے عہد نامے جن کا ذکر مسٹر کینز نے کیا ہے، ملکیت خواہ وہ جمہوریت کی قبا ہی میں پوشیدہ کیوں نہ ہو، انسان کو فوز و فلاح سے آشنا نہیں کر سکتی۔ بلکہ انسانی فلاح تمام انسانوں کی حُریّت اور مساوات میں پنہاں ہے۔ آج ہمیں اس چیز کی ضرورت ہے کہ سائنس جو انسانیت کے لیے بے پناہ مصائب لائی اس کے مقاصد اور محل استعمال کو قطعی طور پر بدل دیا جائے۔ ان خفیہ سیاسی منصوبوں سے کامل احتراز کیا جائے جن کا مقصد ہی یہ ہے کہ کمزور و زبوں حال اقوام، یا ایسی اقوام جو عیاری اور مکاری و حیلہ گری (ڈپلومیسی) کے فن میں چنداں مہارت نہیں رکھتیں، صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو جائیں۔

مجھے اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمان بھی دوسری قوموں کی طرح جنگ

کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے بھی فتوحات کی ہیں۔ مجھے اس امر کا بھی اعتراف ہے کہ ان کے بعض قافلہ سالار ذاتی خواہشات کو دین و مذہب کے لباس میں جلوہ گر کرتے رہے ہیں۔ لیکن مجھے پوری طرح یقین ہے کہ کشور کشائی اور ملک گیری ابتدا اسلام کے حقیقی مقاصد میں داخل نہیں تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو کشور کشائی میں جو کامیابی ہوئی، میرے نزدیک وہ اسلام کے مقاصد کے حق میں بے حد نقصان دہ تھی۔ اس طرح وہ جمہوری اور اقتصادی اصول نشوونما نہ پاسکے جن کا ذکر قرآن کریم اور احادیث نبوی ؐ میں جا بہ جا آیا ہے۔ بیشک مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت تو قائم کر لی، لیکن ساتھ ہی ان کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا، اور انہوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے۔ اسلام کا مقصد یقیناً یہ ہے کہ دوسری قوموں کی جُداگانہ حیثیت مٹا کر انہیں اپنے اندر جذب کر لے۔ تاہم، یہ انجذاب علاقائی فتوحات سے نہیں بلکہ اسلام کی سیدھی سادی تعلیم و تبلیغ سے، جو الٰہیات کے دقیق اور پیچیدہ مسائل سے پاک اور عقل انسانی کے عین مطابق واقع ہوئی ہے، اس عقدہ کی گرہ کشائی کر سکتی ہے۔ اسلام کی فطرت میں ایسے اوصاف پنہاں ہیں جن کی بدولت وہ کامیابی کے بام بلند پر پہنچ سکتا ہے۔ ذرا چین کے حالات پر نظر ڈالیے، جہاں کسی سیاسی قوت کی پشت پناہی کے بغیر اسلام کے تبلیغی مشن نے غیر معمولی کامیابی حاصل کر لی اور لاکھوں انسان اسلام کے دائرے میں داخل ہوگئے۔ مَیں بیس سال سے دنیا کے احوال و افکار کا مطالعہ کر رہا ہوں، اور اس طویل عرصے نے مجھ مَیں اس قدر صلاحیت پیدا کر دی ہے کہ حالات و واقعات پر غیر جانبدارانہ حیثیت سے غور کر سکوں۔

میری فارسی نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں، بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکوز رہی ہے کہ ایک جدید عالمی معاشرتی نظام تلاش کیا جائے، اور اس سعی و کاوش میں عقلاً یہ ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔ اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ بھی ہے، اور پھر انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے ایثار کا جذبہ

بھی پیدا کرتا ہے۔ اور حسن معاملات کا تقاضا یہی ہے کہ اپنے ہمسایوں کے بارے میں اسی قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس نعمت گراں مایہ سے محروم ہے، اور یہ متاع اسے ہماری ہی فیض صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

مَیں اس بارے میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ مَیں نے اسرار خودی پر چند تشریحی شذرے لکھے تھے جنہیں آپ نے دیباچہ اسرار میں شامل کر لیا ہے۔ ان تشریحی حواشی میں، مَیں نے مغربی مفکرین کے افکار و عقائد کی روشنی میں اپنی حیثیت واضح کی ہے۔ یہ طریق محض اس لیے اختیار کیا گیا تھا، تاکہ انگلستان کے لوگ میرے خیالات بآسانی سمجھ لیں۔ ورنہ قرآن حکیم، صوفیائے کرام اور مسلمان فلسفیوں مثلاً ابن عربی اور عراقی (وحدت الوجود)، واحد محمود (حقیقت بطور ثنویت) الجیلی (انسان کامل کا نظریہ) اور مجدد سرہندی (انسانی شخصیت کا رشتہ الٰہی شخصیت سے) کے افکار سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مَیں نے اسرار کے پہلے اڈیشن میں بزبان اردو جو دیباچہ لکھا ہے اس میں یہی طریق استدلال اختیار کیا گیا ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ "اسرار" کا فلسفہ قدیم مسلمان صوفیا اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ براہ راست ارتقا پذیر ہے۔ اور تو اور قوت کے متعلق برگساں کا تصور زماں بھی ہمارے صوفیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ قرآن حکیم یقیناً مابعد الطبیعیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی معاش اور معاد کے متعلق واضح ہدایت کا حامل ہے جو بالآخر مابعدالطبیعی مسائل پر ضرور انحصار کرتا ہے۔ فلسفے کے ان مسائل کے بارے میں ایک جدید مسلم طالب علم کا بیان، علی الخصوص جبکہ وہ ان مسائل کو مذہبی تجربات اور افکار کی روشنی میں بیان کرتا ہے، جن کا مبداء اور سرچشمہ قرآن حکیم ہے، تو اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ جدید افکار کو قدیم لباس میں پیش کیا جا رہا ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پرانے حقائق کو جدید افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے۔ بدقسمتی سے اہل مغرب اسلامی فلسفے کی تعلیم سے نا آشنائے محض ہیں۔ اے کاش، مجھے اس قدر فرصت ہوتی کہ مَیں اس موضوع پر ایک مبسوط کتاب لکھ کر مغربی فلسفیوں کو اس حقیقت سے روشناس کر دیتا کہ دنیا کی مختلف قوموں کے خیالات ایک دوسرے سے کس قدر مشابہ ہیں۔"

۳۰ اگست ۱۹۲۱ء کو اقبال نے وحید احمد مدیر "نقیب" کے نام مندرجہ ذیل مکتوب میں لکھا (بحوالہ "انوار اقبال" صفحہ ۱۱۵)

"آپ کا حسن ظن میری نسبت بہت بڑھ گیا ہے۔ حقیقت میں، مَیں نے جو کچھ لکھا ہے اس کی نسبت دنیائے شاعری سے کچھ بھی نہیں، اور نہ کبھی مَیں نے Seriously اس طرف توجہ کی ہے۔ بہرحال آپ کی عنایت کا شکر گزار ہوں۔ باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر پر ہے یا ہونا چاہیے، اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ مقصود تو بیداری سے تھا۔ اگر بیداری ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں۔ لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا، کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابو الکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں محمد علی، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہو گئی ہے۔ لیکن اگر کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملے میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔"

اہل اللہ سے اقبال کی ارادتمندی شروع ہی سے تھی اور آخر عمر تک قائم رہی۔ اس سال مولانا تاج الدین (ناگپوری) سے اشتیاق ملاقات ہوا۔ حکیم اجمل خاں دہلوی اور بعض دیگر احباب سے ان کی تعریف سُنی۔ مہاراجہ شاد کے نام ۲۷ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے تحریر کردہ مکتوب میں شاد کو لکھتے ہیں:

"میرا قصد بھی ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا ہے۔ بعض وجوہ سے تجدید بیعت کی ضرورت پیش آئی ہے۔ سنتا ہوں کہ وہ مجذوب ہیں، مگر آج کل زمانہ بھی مجاذیب کا ہے۔ بہرحال اگر مقدر میں ہے تو انشاء اللہ ان سے مشکل کا حل ہو گا۔"

نقرس کی شکایت کا آغاز اسی زمانے میں ہوا۔ اس بارے میں ۱۱ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے مکتوب میں شاد کو لکھتے ہیں:

"سال گذشتہ نقرس نے بہت پریشان و مضمحل رکھا۔ امسال اگست میں ایک [redacted]
اب خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں، گو طبیعت میں وہ چستی باقی نہیں رہی جو پہلے

تھی۔"

اس دوران "پیام مشرق" کی تخلیق کا سلسلہ جاری رہا، اور اس بارے میں مولانا گرامی سے مشورۂ سخن بھی بذریعہ خط و کتابت ہوتا رہا۔

۱۹۲۲ء

"پیام مشرق" کا تخلیقی سلسلہ جاری رہا۔ مقامات مقدسہ (فلسطین و شام) کے بارے میں ایک کمیشن کا قیام حکومت برطانیہ کے زیر غور تھا جس کی رکنیت کے لیے اقبال سے استفسار کیا گیا۔ اس سلسلے میں وہ مولانا گرامی کو ایک مکتوب مورخہ ۹ فروری میں لکھتے ہیں:

"اس کمیشن کے اجلاس مقام یروشلم میں ہوں گے اور دو تین سال میں متعدد بار یہاں سے یروشلم جانا پڑے گا۔ بعد کامل غور آج مَیں نے فیصلہ کر دیا ہے کہ مَیں اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔"

مگر بعد میں کمیشن کے قیام کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا۔

نیاز الدین خاں کے یہ لکھنے پر کہ انہیں خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی، اقبال ۴ جنوری ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں یہ بڑی سعادت کی بات ہے... میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریمؐ زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی ان کی صحبت سے اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہؓ ہوا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہو گا۔"

(دس روز بعد اگلے مکتوب محررہ ۱۴ جنوری میں وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ "زندگی" سے مراد بہ جسد عنصری نہیں۔")

مارچ، اپریل میں تقریباً دو ماہ تک اقبال درد نقرس میں مبتلا رہے (خطوط بنام سید سلیمان ندوی، ۲۰ اپریل، بنام محمد اکبر شاہ نجیب آبادی، ۱۷ مئی ۱۹۲۲ء کو لکھتے ہیں:

"درد نقرس کی وجہ سے دو ماہ صاحب فراش رہا اور اب بھی اس درد کے کچھ اثرات باقی ہیں۔ صحت پر اعتماد نہیں رہا۔ مشاغل کم کر رہا

ہوں۔"

۱۶ اپریل ۱۹۲۲ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں اقبال نے اپنی نظم "خضر راہ" پیش کی، جس میں جنگ عظیم اوّل کے بعد پیدا ہونے والے حالات و مسائل کا خضر کی زبانی حقیقت افروز تجزیہ کیا گیا تھا۔ اس نظم میں بعض دانشوروں نے جوش بیان کی کچھ کمی محسوس کی اور اس پر نکتہ چینی کی جس کا جواب اقبال نے سید سلیمان ندوی اور گرامی کے نام مکتوبات میں دیا۔ سید سلیمان ندوی کو ۲۹ مئی ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"جوش بیان کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا صحیح ہے۔ مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا (کم از کم میرے خیال میں) جناب خضرؑ کی پختہ کاری، اُن کا تجربہ اور واقعات و حوادث عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا انداز طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیّل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو۔ اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیئے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوش بیان بہت بڑھا ہوا تھا اور جناب خضرؑ کے انداز طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا۔ یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بن جائیں گے۔"

محمد اکبر منیر کے نام ایک مکتوب میں (جس پر تاریخ درج نہیں لیکن قیاساً یہ خط اپریل یا مئی ۱۹۲۲ء میں لکھا گیا) اقبال نے وسط ایشیا اور ہندوستان کے متغیّر حالات پر اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا:

"مغربی اور وسطی ایشیا کی مسلمان قومیں اگر متحد ہو گئیں تو بچ جائیں گی اور اگر ان کے اختلافات کا تصفیہ نہ ہو سکا تو اللہ حافظ ہے۔ مضامین اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔ میرا مذہبی عقیدہ یہی ہے کہ اتحاد ہو گا اور دنیا پھر ایک دفعہ جلال اسلام کا نظارہ دیکھے گی۔ ہندوستان میں بظاہر مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد امن و سکون ہے مگر قلوب کا ہیجان حیرت انگیز ہے۔ اتنے عرصے میں اتنا انقلاب تاریخ امم میں بے نظیر ہے۔ ہم لوگ جو انقلاب سے خود متاثر ہونے والے ہیں، اس کی عظمت اور اہمیت کو اس قدر محسوس نہیں کرتے۔ آئندہ نسلیں اس کی تاریخ پڑھ کر حیرت میں ڈوب جائیں گی۔ ایشیا کی مسلمان اقوام کی حرکت بھی کم حیرت انگیز نہیں۔ کیا عجب کہ اس نئی

بیداری کو ایک نظر دیکھنے کے لئے مَیں جولائی یا اگست کے مہینے میں ایران جا نکلوں۔"

اگست ۱۹۲۲ء میں ترکوں نے یونانیوں کو شکست دے کر سمرنا (ازمیر) پر قبضہ کرلیا۔ اقبال نے اس فتح کا مادۂ تاریخ مندرجہ ذیل نکالا (اسی واقعہ سے متاثر ہو کر چند ماہ بعد "طلوعِ اسلام" کے عنوان سے نظم لکھی):

شاخ ابراہیم را نم مصطفیٰ
سال فتحش اسم اعظم مصطفیٰ

(۱۳۴۱ھ)

سید محمد سعید الدین جعفری کے نام ۱۳ اگست ۱۹۲۲ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"آج کل کچہری بند ہے۔ مَیں ایک مفصل مضمون انگریزی میں لکھ رہا ہوں جس کا عنوان ہے: "The Idea of Ijtehad in the law of Islam" امید ہے آپ اسے پڑھ کر خوش ہوں گے۔" (انوار اقبال، صفحہ ۲۸۵)

یہ مضمون حبیبیہ ہال (اسلامیہ کالج) کے ایک جلسے میں پڑھا گیا، اور اس پر بعض حلقوں کی طرف سے سخت نکتہ چینی کی گئی (بعد میں یہ مضمون خطبات اقبال کا حصّہ بنا)

اقبال نے اس عرصے میں انار کلی کی رہائش گاہ چھوڑ کر میکلوڈ روڈ پر اقامت اختیار کرلی۔ مولانا گرامی کو اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا: (مکتوب محررہ ۴ اکتوبر)

"مَیں نے مکان بھی تبدیل کر لیا ہے۔ مرزا جلال الدین صاحب کے قریب ہے۔ ایک کوٹھی ایک سو ستر روپیہ ماہوار کرایہ پر لے لی ہے۔ اب آپ تشریف لائیں گے تو آپ کو زیادہ آسائش رہے گی۔"

۱۹۲۳ء

سالِ نَو پر اقبال کو نائٹ ہڈ (سر) کا خطاب ملا۔ بعض احباب نے اس پر خوشی کا اظہار کیا۔ بعض نے قدرے تشویش ظاہر کی اور کچھ لوگوں (سالک وغیرہ) نے اس امر کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا۔ خطاب یافتگی پر خود اقبال کا احساس اور ردعمل احباب کے نام خطوط سے واضح ہے:

میر غلام بھیک نیرنگ کے نام مکتوب (محررہ ۴ جنوری ۱۹۲۳ء) میں اقبال لکھتے

ہیں، (ان ایام کے اکثر خطوط میں سنہ ۱۹۲۲ء لکھا ہے جس کی تصحیح کر دی گئی ہے):

"میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا، مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے ہیں اور آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضے میں میری جان اور آبرو ہے، اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی، انشاء اللہ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں لیکن اس کا دل مومن ہے۔"

مولانا عبد الماجد دریا بادی کے نام مکتوب (محررہ ٦ جنوری ۱۹۲۳ء) میں لکھتے ہیں:

"آپ کے مختصر الفاظ نے اس موقع پر میرے جذبات کی نہایت صحیح ترجمانی کی ہے۔ حالات مختلف ہوتے تو میرا طریق عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا۔ لیکن یہ بات دنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمہ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھُلی کھُلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔"

غلام قادر گرامی کے نام مکتوب (۷ جنوری ۱۹۲۳ء) میں اقبال رقمطراز ہیں:

"آپ نے سُن لیا ہوگا کہ امسال اقبال خلاف توقع خطاب یافتہ ہو گیا۔ اس اعزاز کی اطلاع مَیں آپ کو خود دیتا، مگر جس دنیا کے مَیں اور آپ رہنے والے ہیں، وہاں اس قسم کے واقعات احساس انسانی سے بہت نیچے ہیں:

نہ من بر مرکب مختلی سوارم
نہ از وابستگان شہر یارم
مرا اے ہم نفس دولت ہمیں بس
چو کاوم سینہ را، لعلے بر آرم"

(یہ رباعی "پیام مشرق" میں شامل ہے (ص ۵۷) تیسرے مصرع میں "ہم نفس" کی بجائے "ہم نشین" کر دیا گیا ہے)

انجمن حمایت اسلام کے ۳۸ ویں سالانہ اجلاس میں ۳۱ مارچ کو اقبال نے اپنی

نظم "طلوع اسلام" پیش کی جو ان کی حریّتِ فکر اور آزادی خیال کی آئینہ دار ہے، اور ان کے متذکرہ بالا خیالات کی تصدیق کرتی ہے۔

اس سے قبل انہوں نے مولانا غلام قادر گرامی کے نام مکتوب (محررہ ۲۳ فروری ۱۹۲۳ء) میں اس نظم کی تخلیق کے بارے میں لکھا تھا:

"تمام اراکین انجمن کے اصرار سے یہ خط لکھتا ہوں کہ آپ اس موقع پر ضرور تشریف لا کر لاہور کے لوگوں کو کچھ پڑھ کر سنائیں۔ مَیں بھی انشاء اللہ ایک نظم پڑھوں گا جس کا نام "طلوع اسلام" ہو گا۔ خدا کرے اس وقت تک ختم ہو جائے۔"

"پیام مشرق" اپریل ۱۹۲۳ء کے آخر میں شائع ہوئی جیساکہ عبدالماجد دریا بادی کے نام اگلے مکتوب سے ظاہر ہوتا ہے۔ تاہم اقبال انہی ایام میں مولانا گرامی کے نام مکتوب (محررہ ۲۴ اپریل) میں یہ اطلاع دیتے ہیں:

"پیام مشرق خدمت والا میں پہنچے گا۔ مَیں آٹھ روز سے یہاں (لدھیانہ میں) ہوں۔ لاہور ہوتا تو کتاب آپ کی خدمت میں پہنچ جاتی۔ اس کی اشاعت کو دو ہفتے سے زیادہ نہیں گزرے۔ اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ انشاء اللہ شائع ہونے پر آپ کی خدمت میں مرسل ہو گی۔"

عبدالماجد دریا بادی کے نام مکتوب محررہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۳ء میں لکھتے ہیں:

"پیام مشرق، اپریل کے آخر تک شائع ہو جائے گا۔ چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں لیکن افسوس ہے انہیں ختم نہ کر سکا۔ فکر روزی قاتل روح ہے۔ یکسوئی نصیب نہیں۔ ان باتوں کے علاوہ والد مکرم کا اصرار تھا کہ جتنا ہو چکا ہے اسے شائع کر دیا جائے۔"

"پیام مشرق" پر سید سلیمان ندوی کے تنقیدی شذرہ (معارف جون ۱۹۲۳ء) کے حوالے سے اقبال ۵ جولائی ۱۹۲۳ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں:

"پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ پروفیسر نکلسن کا خط بھی آیا ہے۔ انہوں نے اسے بہت پسند کیا ہے، اور غالباً اس کا ترجمہ بھی کریں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ کتاب جدید اور بجنل خیالات سے مملو ہے اور گوئٹے کے دیوان مغربی کا قابل تحسین جواب ہے۔ مگر میرے لیے آپ کی

رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے۔"

ترک موالات کے اختلال کے فوراً بعد ہندوؤں کی طرف سے شدھی اور سنگھٹن کی دل آزار تحریکیں شروع ہوئیں۔ پنجاب، آریہ سماجیوں کے ان فتنوں سے زیادہ متاثر تھا۔ عارضی ہندو مسلم اتحاد کے بعد افتراق کی یہ صورت حال کچھ غیر متوقع نہیں تھی۔ اقبال کو اس سے تشویش تھی۔ ۱۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو وہ مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آئندہ نہیں سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔"

مانٹفورڈ اصلاحات کے تحت کونسلوں کے انتخابات دوسری بار ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں صوبائی کونسل کی رکنیت کے لیے اہل لاہور کی درخواست پر اقبال نے سیاست کے میدان میں عملی طور پر شریک ہونے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔

اسی زمانے میں اشتراکی تحریک کے سلسلے میں لاہور میں کچھ "کامریڈوں" کی گرفتاریاں ہوئیں۔ ۲۳ جون کو شمس الدین حسن کا ایک مضمون ان لوگوں کی حمایت میں شائع ہوا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ "اگر بالشویک خیالات کا حامی ہونا جرم ہے تو پھر ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بالشویک نظام حکومت کارل مارکس کے فلسفہ سیاسیات کا لب لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی "خضر راہ" اور "پیام مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقیناً ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ اشتراکیت کے مبلغ اعلیٰ ہیں۔" ("زمیندار": ۲۳ جون ۱۹۲۳ء)

یہ آغاز تھا اشتراکی حضرات کے اس پروپیگنڈے کا جس میں اقبال کے اشعار کو سیاق و سباق سے الگ کرکے اپنا من پسند مفہوم پہنایا گیا تھا (اور یہ سلسلہ مختلف اشکال میں اب تک جاری ہے) اقبال اس بہتان عظیم پر اتنے مضطرب ہوئے کہ اسی روز اس کا مفصل جواب "زمیندار" کو ارسال کیا جو اگلے روز کے اخبار میں شائع ہوا۔ یہ

وضاحتی بیان جو اقبال کی بنیادی فکر سے ہم آہنگ ہے، من و عن درج ذیل ہے:

"مَیں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرہ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے، اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

مَیں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل و براہین پر مبنی ہے کہ اقتصادی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حد اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریقہ یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث، حرمت ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بولشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست رد عمل ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا مَیں نے اوپر اشارۃ " ذکر کیا ہے۔ شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے، اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رُو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ اسلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ داری کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے "فاصبحتم بنعمتہ اخوانا" (آل عمران، ترجمہ: اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے) میں

اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں، جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوع انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجودہ نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے کسی ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصول اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو، ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی پولیٹیکل ایکانومی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں، ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظر غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوص اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مگر مجھے امید ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق عمل یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔"

اقبال نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء کو ایک طویل مکتوب محمد سعید الدین جعفری کو لکھ کر ایک متشکک نوجوان (منظر علی) کے بعض استفسارات کا جواب دیتے ہوئے اسلام کی تشکیل نو کے مسئلہ اور متحدہ قومیت، وطنیت اور اسلامی عالمگیریت کے بارے میں اپنا موقف واضح کیا۔ فکر اقبال کے مطالعہ کے سلسلے میں یہ تحریر ازبس اہم ہے:

(۱) "ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانہ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرین قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے مگر ان کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔

میری رائے میں بہ حیثیت مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجتہ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ حکماء میں ابن رشد اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہذالقیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمتہ۔ مفسرین میں معتزلی نقطۂ خیال سے زمخشری، اشعری نقطہ خیال سے رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کر لیں تو اسلام کے Re-interpretation میں بڑی مدد دے سکیں گے۔ مَیں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشاء اللہ اس پر نثر میں بھی لکھوں گا۔

(۲) الفاظ کے انتخاب میں لکھنے والا (شاعر) اپنی حس موسیقیت سے کام لیتا ہے اور مضامین کے انتخاب میں اپنے فطری جذبات کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے۔ اس امر میں کسی دوسرے شخص کے مشورے پر خواہ وہ کتنا ہی نیک مشورہ کیوں نہ ہو، عمل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے اعتراض کے متعلق یہ بھی عرض ہے کہ میرے نزدیک اسلام نوع انسان کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالا تر کرنے اور نسل و قومیت کے مصنوعی مگر ارتقاء انسانی کے ابتدائی مراحل مَیں مقیّد امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے، اسی وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے، اس واسطے بنی نوع انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیش نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں مَیں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے مَیں نے دیکھا تھا، لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔ آپ Pan-Islam کو ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک تصور کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک طریق چند اقوام انسانی کو جمع کرنے

اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔ اس غرض سے ایک مرکز شہودی پر مجتمع ہو جانے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی اور قومی اور ملکی امتیازات و تعصبات کی لعنت سے آزاد ہو جائیں۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوع انسانی کے اتحاد کی طرف، یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریّت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ مَیں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمت بنی نوع ہے اور کچھ نہیں۔ اور میرے نزدیک عملی نقطہ خیال سے صرف اسلام ہی Humanitarian Ideal کو Achieve کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں۔ خوشنما ضرور ہیں مگر ناقابل عمل۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خالص اسلامی حقائق پر لکھنے اور ان کو نمایاں کرنے سے ہندوستان کی اقوام میں باہمی عناد بڑھتا ہے۔ اس بات میں مَیں آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ نبی کریمؐ کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لیے سراپا شفقت ہے، مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لیے بھی یہی ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصلی روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریق یہی ہے کہ مَیں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھ سکتا جس کی بنا دیانت پر ہو اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔ غرض کہ میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوام انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے، اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے، تاکہ نوع انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے۔ مسلمانوں کو تو سیاسیات سے پہلے اشاعت اسلام کا کام ضروری ہے، تاہم دونوں کام ساتھ ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔ منظر علی صاحب کے مذہبی عقاید کا حال سن کر مجھے کچھ تعجب نہیں ہوا کیونکہ Nationalism نے قریباً ہر ملک میں مذہب کو Displace کیا ہے لیکن الحمدللہ ان کے خیالات نے اس طرف پلٹا کھایا اور ان کو تحقیق کا شوق پیدا

ہوا۔ چند مصنفین کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام اس بارے میں بہتر مشورہ دے سکیں گے۔

مجموعہ شائع کرنے کی فکر میں ہوں۔ انشاء اللہ ۲۴ء میں ضرور شائع ہو جائے گا۔ معلوم نہیں آپ کی سب باتوں کا جواب اس خط میں آیا ہے یا نہیں۔ مَیں نے آج تک اتنا طویل خط کسی کو نہیں لکھا اور نہ حقیقت میں ایسا کرنے کی فرصت ہے۔"

۱۹۲۴ء

"پیامِ مشرق" طبع ثانی مع اضافوں کے تیار ہو کر مارچ ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اقبال ۲ فروری کو محمد اکبر منیر کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"دنیا کے دل میں انقلاب ہے۔ اس واسطے قلوب انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلام کی عظمت کا زمانہ قریب آ رہا ہے۔"

کلام اقبال کا خود مرتب کردہ مجموعہ اردو "بانگ درا" اسی دوران میں مکمل ہو کر فروری ۱۹۲۴ء میں کاتب کے حوالے کیا گیا اور ستمبر ۱۹۲۴ء میں اس کا پہلا اڈیشن منظر عام پر آیا، اس کے ساتھ ہی یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ اگلے فارسی مجموعہ کلام "زبور عجم" کا سلسلہ تخلیق شروع ہوچکا ہے۔ نیاز الدین خاں کے نام مکتوب محررہ ۱۳ جولائی ۱۹۲۴ء میں اقبال رقم طرز ہیں:

"اردو مجموعہ چھپ گیا ہے۔ قریباً دو ہفتے تک بالکل تیار ہو جائے گا۔ شیخ عبدالقادر صاحب اس کا دیباچہ لکھ رہے ہیں جو کل انشاء اللہ ختم ہو جائے گا۔ مَیں بھی اگست میں شملہ جانے کا قصد کر رہا ہوں۔ آج کل گرمی سخت ہے۔ بارش مطلق نہیں ہوئی۔ فکر سخن کے لیے یہ موسم نہایت خراب ہے۔ تاہم کبھی کبھی شبنم کی کوئی بوند برس جاتی ہے۔ ایک چھوٹی سی کتاب لکھ رہا ہوں، جس کا نام غالباً یہ ہو گا:

"Songs of a Modern David"

(یہ اطلاع اس کتاب کے آغاز کے بارے میں ہے جو تین سال بعد "زبور عجم" کے نام سے شائع ہوئی۔)

اقبال، سید سلیمان ندوی کے نام ۷ ستمبر ۱۹۲۴ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"دنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے۔ اس پیکار و انقلاب کا رخ متعین کرنے والے قلوب و اذہان پر شک و ناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر۔ آپ اس حالت سے جلد نکل جائیں گے، یا صوفیا کی اصطلاح میں یوں کہئے کہ اس مقام کو جلد طے کرلیں گے۔ آپ قلندر ہیں مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے کہا ہے:

قلندراں کہ براہ تو سخت می کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
دریں جہاں کہ جمال تو جلوہ ہا دارد
ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروز بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروز رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں۔ اس جماعت کا دنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ باقی جس راہ پر آپ اس سے پہلے قدم زن تھے اس کے متعلق انشاء اللہ بوقت ملاقات گفتگو ہو گی۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی جو آپ کے مشاہدے میں آ گئی۔"

(زبور عجم: پہلا مصرع "قلندراں کہ بہ تسخیر آب و گل کوشند"۔ تیسرا شعر حذف کر دیا گیا۔ صفحہ ۱۲۱)

۵ اکتوبر کو اقبال کی لاہور والی اہلیہ کے ہاں جاوید اقبال تولد ہوئے۔ ۲۱ اکتوبر کو لدھیانہ والی بیوی کا زچگی کے دوران انتقال ہوگیا۔

حجاز پر سلطان نجد عبدالعزیز ابن سعود کے قبضے کے بعد کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اقبال نے "مسلم آؤٹ لک" کے نمائندے سے کہا:

"میں حجاز کی موجودہ صورت حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور ابن سعود پر بدون تذبذب اعتماد رکھتا ہوں۔ میری رائے میں سلطان نجد ایک روشن خیال

آدمی ہے اور جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا انہوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اس رائے کے موئید ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب "الاسلام" میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حکمران اور سرزمین نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کی صاف اور پاک ترین جگہ بتاتا ہے۔" (زمیندار: ۲ نومبر ۱۹۲۴ء)

۱۹۲۵ء

"زبور عجم" کے کلام کا سلسلہ تخلیق جاری رہا۔ عالم اسلامی کے سیاسی مسائل پر غور و فکر کے علاوہ اسلامی فقہ کی تدوین نو اور اجتہاد کے بارے میں علماء سے مشورہ اور مطالعہ جاری رہا۔

۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو نیاز الدین خان کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مسلمانان ہند کے دل و دماغ پر عجمی تصوف غالب ہے۔ وہ عربیت کے تخیلات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ مَیں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر نبی کریمؐ بھی دوبارہ پیدا ہو کر اس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات و اثرات کے ہوتے ہوئے حقائق اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں۔ اسلام نہایت سادہ مذہب ہے۔ لیکن اس کی بدیہات کے اندر ایسی ایسی مشکلات ہیں جن کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جن کو عجمی "بلند خیالی" کے افسوں نے محسوس فراموش کر دیا ہے۔"

۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو اکبر منیر کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"زندگی کا راز یہی ہے، جہاں رہو، جس حالت میں رہو، خوش اور مطمئن رہو۔ دنیا میں بہت کم آدمی ہیں جو اپنی زندگی کے مختلف احوال و مقاصد سے آگاہ ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہم سب لوگ اپنی زندگی کا محض ایک خارجی مشاہدہ کر سکتے ہیں، اندرونی علل و اسباب و نتائج ہماری نظر سے مخفی رہتے ہیں۔ ہاں، لاہور میں بہار کا آغاز ہے۔ مگر:

دلم بہ ہیچ تسلّی نمے شود حاذق!
بہار دیدم و گل دیدم و خزاں دیدم

.. "زبور عجم" کے لیے ایک مدت درکار ہے۔ بہت سے اور مشاغل ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اگر اسی کام میں سراپا محو ہو سکتا تو اب تک ختم ہو گیا ہوتا۔"

ذیل کا طویل مکتوب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے نام ہے، محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۵ء، اور ان کے ذریعے مولوی خواجہ احمد الدین (امرتسری) سے مسائل فقہ پر گفتگو:

"میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں مَیں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے، نہ تعلیم و تعلم کی غرض سے۔ کچھ مدت ہوئی مَیں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا مگر دوران تحریر میں اس کا احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسے مَیں نے اسے ابتدا میں تصور کیا تھا۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں وہ مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت ہے، اس مضمون میں نہایت مختصر طور پر محض اشارۃ " بیان کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اب مَیں انشاء اللہ اسے ایک کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا جس کا عنوان یہ ہو گا: "Islam As I Understand" اس عنوان سے مقصود یہ ہے کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصور کیا جائے جو ممکن ہے، غلط ہو۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعہ میں گزری ہے اور یہ نقطہ خیال ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ مَیں اسی نقطہ نگاہ سے حقائق اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اردو میں گفتگو کرتے ہوئے مَیں اپنے مافی الضمیر کو اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ مذکورہ بالا حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلۂ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادہ سے امرتسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بہت مہربانی ہے جس کے لیے مَیں ان کا نہایت

شکرگزار ہوں۔ مجھ کو ان کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ وہ شریعت محمدیہ پر ایک مبسوط کتاب تحریر فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو۔ "معاملات" کے متعلق خاص طور پر۔ اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لیے مدت درکار ہے۔ ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیر غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ اس میں زیادہ تر زمانۂ حال کے مغربی اصول فقہ کو ملحوظ رکھ کے فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو "چرچ" اور "سٹیٹ" میں امتیاز کر کے ان کو الگ الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دُور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوام اسلامیہ کے لیے باعث برکت ہو گا یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رفقاء کو جو کلام الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں، اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ مَیں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ ایک مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے، اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ "بلاغ" امرتسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ "اشاعت القرآن" کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادت انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور اس میں فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، ان پر قرآنی نقطہ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوع انسانی کبھی سیادت سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نظر ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت

مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں، یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے، مگر افسوس ہے کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلان طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاء اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکام قرآنی کا ہی منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ مَیں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے سنا کہ حضرت امام ابو حنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے۔ کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہب اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

۱۹۲۶ء

اسلام کے فقہی مسائل و معاملات پر غور و فکر اور علماء سے مشورہ جاری رہا۔ جدید دور کے عمرانی تقاضوں کے حوالے سے اسلامی ممالک کے بارے میں اقبال کا اضطراب بڑھتا جاتا ہے۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۶ء کو سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصّل تاریخ لکھی جائے۔ اس مبحث پر مصر میں ایک چھوٹی سی کتاب شائع ہوئی تھی جو میری نظر سے گزری ہے۔ مگر افسوس ہے کہ بہت مختصر ہے، اور جن مسائل پر بحث کی ضرورت ہے، مصنف نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو مَیں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا۔ مَیں نے ایک رسالہ اجتہاد پر لکھا تھا، مگر چونکہ میرا دل بعض امور کے متعلق خود مطمئن نہیں، اس واسطے اس کو اب تک شائع نہیں کیا۔ آپ کو یاد ہو گا مَیں نے آپ سے بھی کئی امور کے متعلق استفسار کیا تھا۔ مسلمانوں پر اس وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آ رہا ہے جس کی ابتداء یورپ کی تاریخ میں لُوتھر کے عہد سے

ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت رہنما نہیں ہے اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں۔ نہ عامتہ المسلمین کو یہ معلوم ہے کہ اصلاح لُوتھر نے مسیحیت کے لیے کیا کیا نتائج پیدا کیے۔ ہندوستان کی جمعیتہ العلماء کی توجہ اس طرف ضروری ہے۔ آپ چونکہ اس جمعیت کے صدر ہیں، اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ اس کام کو مستقل طور پر اپنے ہاتھ میں لیجئے۔ ندوہ کے دیگر ارکان یا فارغ التحصیل طلبہ کو بھی اپنے ساتھ ملایئے تاکہ اقوام اسلامیہ کو فقہ اسلامی کی اصل حقیقت معلوم ہو... غرضیکہ اس وقت مذہبی اعتبار سے دنیائے اسلام کو رہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علماء اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے تو ہم باقی اقوام اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے، ہاں دماغی اعتبار سے ان کے لیے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے...

بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطہ نظر کا نتیجہ ہیں۔ ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوب بیان سے مدد نہیں ملتی۔ بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے۔ اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضرور ہے کہ اہل زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔"

پھر ۷ اپریل ۱۹۲۶ء کو سید سلیمان ندوی کو ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میرا مقصود یہ ہے کہ زمانۂ حال کے جورس پروڈنس کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کیا جائے، مگر غلامانہ انداز میں نہیں بلکہ ناقدانہ انداز میں۔ اس سے پہلے مسلمانوں نے عقائد کے متعلق ایسا ہی کیا ہے۔ یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا۔ مگر جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اِس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔ قاعدۂ میراث کے حصص کے متعلق مَیں نے مضمون اجتہاد میں یہی طریق اختیار کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصہ ملنا عین انصاف ہے۔ مساوی حصہ ملنے سے انصاف قائم نہیں رہتا۔ بحث کا محرک ترکی شاعر ضیابک (گوکالپ) کی بعض تحریریں تھیں جن میں وہ اسلامی طلاق اور میراث کا

ذکر کرتا ہے۔ مَیں نے جو حصص کے متعلق آپ سے دریافت کیا تھا، اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ مَیں ان حصص میں ترمیم چاہتا ہوں۔ بلکہ یہ خیال تھا کہ شاید ان حصص کی ازلیت و ابدیت پر آپ کوئی روشنی ڈالیں گے۔ میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں "قدیم" ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ "جدید" بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ اسلامی ممالک میں عوام اور تعلیم یافتہ لوگ دونوں طبقے علوم اسلامیہ سے بے خبر ہیں۔ اس بے خبری سے آپ کی اصطلاح میں یورپ کے "معنوی استیلا" کا اندیشہ ہے جس کا سدباب ضروری ہے۔ میرا ایک مدت سے یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان جو سیاسی اعتبار سے دیگر ممالک اسلامیہ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے دماغی اعتبار سے ان کی بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آئندہ نسلوں کی نگاہوں میں "ندوہ" علی گڑھ سے زیادہ کار آمد ثابت ہو۔"

اقبال بار بار اس مسئلے پر زور دے کر اپنا موقف واضح کرتے ہیں۔ چنانچہ سید سلیمان کو ۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء کے مکتوب میں اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مَیں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ میرے دل میں ممالک اسلامیہ کے موجودہ حالات دیکھ کر بے انتہا اضطراب پیدا ہو رہا ہے۔ ذاتی لحاظ سے خدا کے فضل و کرم سے میرا دل پورا مطمئن ہے۔ یہ بے چینی اور اضطراب محض اس وجہ سے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔ حال ہی میں ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا، مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ اس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے۔"

انڈین ریویو میں اقبال کا مقالہ Inner synthesis of Life شائع ہوا۔ ملکی مفادات سے اقبال کی گہری دلچسپی قائم رہی مگر عملی سیاست میں شرکت سے وہ اجتناب کرتے رہے۔ ایک بیان میں وہ کہتے ہیں (روزنامہ "زمیندار" ۶ اپریل ۱۹۲۶ء):

"مَیں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں۔ البتہ میری خواہش یہ رہی ہے اور ہے کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعث ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ کسی

سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں، اہل ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کے ساتھ ہوں۔"

اقبال نے ۱۹۲۶ء کے انتخابات میں پنجاب کونسل کی رکنیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو ایک بیان میں کہا (روزنامہ "زمیندار" ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ء)

"مسلمانوں کو معلوم ہے کہ مَیں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے، اور مَیں نے اپنے لیے دوسرا دائرۂ کار منتخب کر لیا تھا۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ مَیں اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کروں۔ شاید میرا ناچیز وجود اسی طرح اس ملّت کے لیے زیادہ مفید ہوسکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گزرے ہیں۔ میرے خیالات و جذبات ہر مسلمان پر روز روشن کی طرح آشکارا ہیں اور مجھے کامل امید ہے کہ وہ کونسل میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے میری ذات پر اعتماد کرنے میں ایک لحظہ کے لیے بھی متامل نہ ہوں گے۔ مَیں اپنے طول و طویل دعاوی کو شائستہ توجہ نہیں سمجھتا۔ عمل دلی جذبات کے ملفوظ اظہارات کا بہترین معیار ہے۔ خدا کرے کہ مَیں اس معیار پر پورا اُتر سکوں۔"

۱۱ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو ایک انتخابی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اقبال نے کہا (روزنامہ "زمیندار" ۱۴ اکتوبر):

"مَیں انگریزی، اردو، فارسی میں برنگ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کرسکتا تھا، لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں، لہٰذا مَیں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقش قدم پر چلانے اور ناامیدی، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ مَیں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اب مَیں ان کی بطرز خاص عملی خدمت کے لیے اپنے کو پیش کر رہا ہوں۔"

۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء کو اقبال حلقہ شہر لاہور سے بھاری اکثریت کے ساتھ صوبائی مجلس قانون ساز کے رُکن منتخب ہوئے۔

۱۹۲۷ء

"زبور عجم" مکمل ہو کر شائع ہوئی۔ مسائل فقہ اسلامی کا مطالعہ جاری رہا۔ مولانا گرامی کو مکتوب محررہ ۱۳ جنوری ۱۹۲۷ء میں لکھتے ہیں:

".... اس کے علاوہ گلشن راز جدید بھی سناؤں گا۔ محمود شبستری نے جن سوالات کا جواب گلشن راز میں دیا ہے، انہیں سوالات پر مَیں نے زمانۂ حال کے مشاہدات و تجربات کے لحاظ سے نظر ڈالی ہے۔ امید ہے کہ آپ اس سے محظوظ ہوں گے۔"

۳۱ جنوری ۱۹۲۷ء کو مولانا گرامی کے نام یہ مکتوب لکھا گیا:

"زندگی کا کوئی اعتبار نہیں☆ دیرینہ ہم خیالوں کی صحبت میں جو دم گزر جائے غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ عرض ہے کہ میری کتاب "زبور عجم" ختم ہو گئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دن کے اندر اندر شائع ہو جائے گی۔ اس کے چار حصے ہیں۔ پہلے حصے میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ، دوسرے حصے میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق۔ طرز دونوں کی غزلیات کے موافق یعنی الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہیں۔ تیسرے حصے میں مثنوی گلشن راز (محمود شبستری) کے سوالوں کے جواب ہیں۔ اس کا نام مَیں نے مثنوی گلشن راز جدید تجویز کیا ہے۔ چوتھے حصے میں ایک مثنوی ہے، جس کا نام مَیں نے بندگی نامہ تجویز کیا ہے۔ مثنوی کا مضمون یہ ہے کہ غلامی کا اثر فنون لطیفہ مثلاً موسیقی و مصوری وغیرہ پر کیا ہوتا ہے۔ کُل مجموعہ کا نام "زبور عجم" ہے۔"

[☆ اور چار ماہ بعد ۲۷ مئی ۱۹۲۷ء کو اقبال کے دیرینہ بے تکلف دوست مولانا غلام قادر گرامی وفات پا گئے، انا للہ وانا الیہ راجعون]

۱۶ اپریل ۱۹۲۷ء کو انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں اقبال نے اس موضوع پر لیکچر دیا: "The Spirit of Islamic Culture"

انجمن حمایت اسلام کے اس اجلاس میں سید سلیمان ندوی پہلی بار شریک ہوئے۔ لاہور کی اکثر ثقافتی محفلوں میں اقبال کے ساتھ انہیں مدعو کیا گیا۔ دعوت طعام کے ساتھ ساتھ علمی مسائل پر تبادلۂ خیال ہوا۔ واپسی پر سید سلیمان ندوی نے "معارف" (مئی ۱۹۲۷ء) میں اپنے سفر و قیام لاہور کے تاثرات رقم کیے اور لاہور کی ان محفلوں کے حوالے سے اقبال کے بارے میں یہ مرقع پیش کیا:

"ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمع محفل تھے۔ انہوں نے تو "شمع اور شاعر" لکھا ہے۔ لیکن مَیں نے لاہور میں خود "شاعر کو شمع" دیکھا اور قدرشناسوں کو اس کا پروانہ پایا۔ ان کی صحبت، لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بلند کر رہی ہے۔ ان کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار، شاعرانہ خیالات ان کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ ان کی "زمزمہ پردازیوں" کا نیا مجموعہ "زبور عجم" کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ مَیں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر ان کے خیالی فلسفے کو مزامیر داؤد کی دعاؤں سے بدل دے، اور ان کے کانوں کو زبور کا "پردہ" رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔"

مکتوبات اقبال کی خودنوشت فضا سے تھوڑی دیر کے لیے نکل کر، آیئے، بزم اقبال کا رخ کریں اور وہاں کے ماحول میں شاعر، فلسفی اور حکیم الامت کی مجلسی زندگی کا رنگ ڈھنگ دیکھیں۔

درویش منش، فلسفی شاعر اقبال کی قیام گاہ (برلب میکلوڈ روڈ) پر شام کی محفلیں خصوصی اہمیت رکھتی تھیں۔ ان محفلوں کا آنکھوں دیکھا حال ڈاکٹر ممتاز حسن (جو اس وقت ایف۔ سی کالج کے طالب علم تھے) کی زبان قلم سے سنیے:

"وہ (اقبال) بہت کم گھر سے باہر جاتے تھے۔ لاہور میں یہ بات واقعی ایک سنسنی خیز واقعہ ہوتی اگر انہیں سڑک پر چلتے یا کسی دوکان سے کچھ خریدتے دیکھ لیا جاتا۔ بعض دفعہ وہ پبلک جلسوں اور سوشل تقریبات میں ضرور جاتے تھے، مگر یہ مواقع شاذ و نادر ہی آتے تھے۔ ان کی اس جسمانی عدم حرکت کا بہت حد تک مداوا ان کے سیلانی ذہن اور روح کے مسلسل تحرک سے ہو جاتا تھا۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور متنوع تھا۔ اگرچہ کوئی بھی یہ نہیں جان سکتا تھا کہ وہ اس مطالعے کے لیے کونسا وقت نکالتے ہیں،

اور پھر اس مطالعے اور گفتگو اور فلسفے کے درمیان شعری القا و الہام کا ظہور اس طرح ہوتا جسے سیاہ بادلوں کو چیرتے ہوئے آفتابی شعاعیں نمودار ہو جائیں۔

اس مکان پر روزانہ شام کی محفلیں ایک خاص معمول تھیں۔ مَیں نے آج تک اقبال کے سوا کسی ایسے شخص کو نہیں دیکھا جو اس طرح کی متنوع محفل میں اتنا بے تکلف ہو۔ سائنس دان، ادیب، سیاستدان، سرکاری افسر، دوکاندار، کالج کے طالب علم، مسافر، بلند سے بلند اور پست سے پست، سب یہاں آتے اور سب کے لیے خندہ پیشانی سے خوش آمدید! یہاں آنے اور ملنے والوں کے رنگ، مسلک اور ذات پات وغیرہ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ وہ لوگ آتے، بیٹھتے اور متفرق امور پر گفتگو کرتے۔۔ شاعری، فلسفہ، مذہب، سیاست، سائنس، جنس، ہر چیز پر گفتگو ہوتی۔ یہاں کوئی ایسی بات نہ تھی جسے شے ممنوعہ قرار دیا جاسکے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی کہ تہذیبوں کے عروج و زوال پر گفتگو ہوتے ہوتے اس بزم میں ملکوں ملکوں میں پلاؤ پکانے کے مختلف طور طریقے موضوع گفتگو بن جاتے۔ مجھے یاد ہے جب ایک دفعہ ساری سہ پہر سوائے کُشتی رانی کے داؤ پیچ کے کسی اور مسئلے پر بات نہ ہوئی۔

ان گفتگوؤں میں ہمیشہ وہ خود بولنے کی بجائے دوسروں کی باتیں سننے کے مشتاق نظر آتے، تاہم، کئی ایسے امور ہوتے جن کے بارے میں لوگ ان سے استفسار کرتے اور اس بارے میں انہیں کافی باتیں کرنی پڑتیں۔ مثلاً یہاں کئی نوجوان طالب علم ہوتے جو ان سے سوال پوچھنے ہی کے لیے آتے۔ خود ان کے ذہن میں بھی جاننے کا طالب علمانہ تجسّس ہوتا اور انہیں اس بات سے ازحد مسرت ہوتی جب انہیں کوئی ایسی بات بتائی جاتی جسے وہ پہلے نہ جانتے ہوں۔ وہ روح انسانی کی تمام کیفیتوں اور حالتوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ درحقیقت، زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا رخ ہوگا جس سے انہیں دلچسپی نہ ہو۔ وہ اُن چیدہ لوگوں میں سے ہیں جو زندگی کو ایک ابدی حقیقت جاننے اور اس سے پیار کرنے والے ہیں۔ انہوں نے اپنے لباس پر کبھی زیادہ توجہ نہیں دی۔ کبھی کبھی انہیں صاف ستھرے یورپین لباس پہنے ہوئے دیکھا جاتا، جبکہ اکثر اوقات (خصوصاً گھر میں) وہ اپنے ملاقاتیوں کے درمیان بنیان پہنے، پنجابی تہہ بند لپیٹے جس کی ڈھیلی ڈھالی گرہ کمر کے ساتھ لپٹی ہوتی، بے تکلفی سے حقہ پیتے۔ جب حقے کا کش

لگاتے تو ان کی نگاہوں میں ایک خواب آلود سی کیفیت نظر آتی۔ حقہ گفتگو کے دوران ان کا رفیق ہوتا اور یہ امر ہمیشہ علی بخش کے اہم فرائض میں داخل تھا کہ وہ حقے کو ہر لحظہ تازہ دم رکھے۔ ان کی خوش طبعی مخصوص نوعیت کی تھی جو ان کی گفتگو میں زندہ دلی کا کیف پیدا کرتی۔ ان سے گفتگو کرکے کبھی بے لطفی اور افسردگی کا احساس نہ ہوتا۔ وہ لوگوں سے ان کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کرتے اور کسی کو نظرانداز نہیں کرتے تھے۔ وہ اکثر شاعری پر گفتگو کرتے مگر شاید ہی کبھی انہوں نے اپنی کاوش سخن کا حوالہ دیا ہو۔ اس کا بہت ہی کم اتفاق ہوتا اور وہ بھی زیادہ تر محدود حلقے میں کبھی اپنے شعر پڑھتے۔ یہ میری خوش بختی تھی کہ مَیں نے ایسے کئی موقعوں پر ان کا کلام انہیں کی زبانی سنا۔ ایک دفعہ ہم میں سے کچھ لوگوں نے شام کو ایک محفل کا انتظام کیا تاکہ ان سے ان کی نظمیں سنی جائیں، مگر یہ تجربہ بہت کم عرصے تک جاری رہ سکا۔

اقبال انسان کی انفرادیت میں پختہ یقین رکھتے تھے۔ مجھے یاد ہے جب کسی نے عوام الناس کے بارے میں نازیبا کلمات کہے تو انہوں نے اس پر احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا: "اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو کوئی نہ کوئی ایسا وصف دیا ہے جو کسی دوسرے کو نہیں دیا۔ اگر کوئی اپنے کسی بنی نوع کو حقارت سے دیکھتا ہے تو وہ لاعلمی کی وجہ سے ایسا کرتا ہے۔"

کیا یہ شخص نوع انسانی سے پیار کرنے والا نہیں؟"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اقبال کے صحبت نشینوں میں فقیر سید وحید الدین بھی اپنے مشاہدات، تخلیق شعر اور شعری القا و الہام کے سلسلے میں ایک مکالمے کی صورت میں بیان کرتے ہیں:

"ایک روز مَیں نے اقبال کو ہشاش بشاش اور گفتگو کے موڈ میں دیکھا۔ مَیں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور تخلیق شعر کے موضوع پر ان کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی اور پوچھا: "ڈاکٹر صاحب! آپ شعر کس طرح کہتے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا: "ایک دفعہ مجھے فارمن کرسچین کالج لاہور کی سالانہ تقریب میں کالج کے پرنسپل ڈاکٹر لوقا نے مدعو کیا۔ تقریب کے آخر میں چائے پیش کی گئی۔ ڈاکٹر لوقا نے مجھ سے کہا کہ چائے کے بعد آپ نہ جائیں کیونکہ وہ ایک اہم معاملے پر

مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ جب چائے کا دور ختم ہوگیا تو ڈاکٹر لوقا میرے پاس آئے اور مجھے ایک کونے میں لے گئے، اور پوچھا: "اقبال! مجھے یہ بتایئے، کیا وہ قرآن کا مفہوم تھا جو آپ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر القا ہوا، اور چونکہ وہ عربی دان تھے، اس لیے انہوں نے اس مفہوم کو عربی زبان کے لبادے میں پیش کر دیا؟ یا وہ زبان بھی، جیسی کہ وہ قرآن میں ہے، اسی صورت میں اُن پر نازل ہوئی؟"--- مَیں نے کہا: "قرآن کے الفاظ بھی جیسے کہ وہ ہیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔" ڈاکٹر لوقا حیرت زدہ ہوئے اور کہنے لگے: "اقبال! آپ ایک پڑھے لکھے اور مہذب انسان ہیں۔ کیا واقعی آپ کو یقین ہے کہ قرآن کی زبان بھی، جیسی کہ یہ ہمارے سامنے ہے، پیغمبر پر نازل ہوئی؟" مَیں نے کہا: "ڈاکٹر لوقا! میرے لیے یہ اعتقاد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ ذاتی تجربے کا معاملہ ہے۔ مَیں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ جب مَیں شعر لکھتا ہوں تو ایک ایک شعر مکمل الفاظ کے ساتھ مجھ پر وارد ہوتا ہے۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی زبان کا نزول کیوں نہیں ہو سکتا؟"

یہ واقعہ یا قصہ بیان کرنے کے بعد اقبال نے مزید یہ فرمایا: "جب مجھ پر شعری القا کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ایسے نظر آتا ہے جیسے ایک ماہی گیر نے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جال پھینکا ہو اور مچھلیاں جال میں اس کثرت سے کھچی چلی آتی ہیں کہ ماہی گیر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے کہ کونسی مچھلی پکڑوں اور کونسی چھوڑ دوں؟" مَیں نے پوچھا: "کیا یہ کیفیت آپ پر ہمیشہ طاری ہوتی ہے؟" انہوں نے کہا: "نہیں؟ ایسی کیفیت مجھ پر سال میں زیادہ سے زیادہ دو مرتبہ طاری ہوتی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ مگر جب یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو یہ گھنٹوں تک مسلسل جاری رہتی ہے اور مَیں کسی قسم کی کاوش کے بغیر شعر لکھتا چلا جاتا ہوں۔ ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ جب کبھی لمبے وقفے کے بعد یہ موڈ دوبارہ طاری ہوتا ہے تو آخری شعر جو پہلے عرصے میں لکھا گیا ہو، بعد میں آنے والے کلام کے پہلے شعر سے معنوی لحاظ سے مربوط ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ ان کیفیات میں ایک اندرونی ربط و تسلسل بھی قائم رہتا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیفیات کے یہ مختلف لمحات ایک ہی زنجیر میں گندھے ہوتے ہیں اور جب شعری موڈ تمام ہو جاتا ہے تو مجھے ایک خاص قسم کی تھکن کا احساس ہوتا

ہے اور اعصابی بے چینی اور دباؤ (Depression) بڑھ جاتا ہے۔"

چند لمحے توقف کے بعد سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: "ایک وقت ایسا بھی آیا جب مَیں چھ یا سات سال تک اس شعری القا سے محروم رہا۔ مَیں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ عطیہ مجھ سے واپس لے لیا ہے، اور پھر مَیں نثر لکھنے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ مگر ایک دن، بغیر کسی پیشگی اطلاع کے، اچانک یہ کیفیت پھر طاری ہوگئی۔ اس نے مجھے ایک غیر معمولی احساس سے دوچار کر دیا--- ارفع ترین مسرت کا احساس! مجھے یوں محسوس ہوا کہ اشعار کا ایک بحر موجزن ہے، اور پھر یہ کیفیت اتنے عرصے تک طاری رہی کہ اس نے چھ سات سال کے عرصے کے خلا کو پُر کر دیا۔"

اقبال رک گئے۔ وہ خیالات میں کھوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ اچانک وہ دوبارہ بولے "مَیں نے مشہور جرمن شاعر گوئٹے کے بارے میں پڑھا ہے کہ جب اس نے جرمن زبان کے ترجمے میں قرآن کا مطالعہ کیا تو اس نے اپنے ایک دوست سے کہا کہ "جب کبھی وہ اس کتاب کو پڑھتا ہے اس کی روح لرزہ براندام ہو جاتی ہے۔" آپ دیکھیے، سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے اقبال نے کہا "کہ شاعر بھی ایک قسم کے القا و الہام کے نزول کے تجربے سے گزرتا ہے، اس لیے جب کبھی اس کا سابقہ کسی الہامی طور پر نازل شدہ کتاب سے ہوتا ہے تو وہ اس کتاب کے اندرونی مطالب کو اپنی روح سے ہم آہنگ پاتا ہے اور ایک خاص قسم کے ترفّع کی کیفیت وہ محسوس کرتا ہے۔ اس طرح کا تجربہ کسی دوسرے شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔"

☆ ☆ ☆ ☆ ☆ ☆

تقریباً اسی قسم کی بات اقبال کی محفل خاص کے ایک رکن ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپنے بیان میں کہی ہے، مگر اس فرق کے ساتھ کہ شعری القا و الہام میں تاخیر یا وقفے کا عرصہ چھ سات سال کی بجائے ایک سال سے کچھ اوپر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"شعری القا و الہام (Inspiration) کے بارے میں اقبال کا نظریہ بھی خاص قسم کا ہے۔ مَیں نے ایک بار اُن سے پوچھا کہ "وہ کیسا محسوس کرتے ہیں جب ان پر شعر کا القا ہوتا ہے؟" انہوں نے فرمایا کہ "کئی دفعہ جب شعری تجربے اور تخلیق کے دوران وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ محاسبۂ نفس کو اپنی گرفت میں لائیں، اور جونہی وہ

اپنی حالت کا تجزیہ کرنا شروع کرتے ہیں تو القا و الہام کا سلسلہ بند ہو جاتا ہے۔" انہوں نے اپنی زندگی کے ایک دور کے بارے میں بتایا: "ایک سال سے زائد عرصے تک شعر کا نزول نہ ہوا"۔ یوں تو وہ بڑی سہولت اور آرام سے شعر کمپوز کرسکتے تھے مگر یہ شاعری القائی و الہامی الفاظ میں نہیں ہوتی تھی۔ اُس وقت انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ عطیہ جو انہیں عطا ہوا تھا، واپس لے لیا گیا ہے۔ تب انہوں نے یہ منصوبہ بنایا کہ اردو نثر میں علوم مفیدہ پر کتابیں لکھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انہوں نے علم الاقتصاد پر کتاب لکھی۔ اور پھر ایک تاروں بھری رات میں اچانک، جب وہ بستر پر لیٹے لیٹے ستاروں پر نگاہ ڈال رہے تھے، شعری القا و الہام کا نزول ہونے لگا۔ یہ کیفیت ایک تیز دھار آبشار کی صورت میں آئی، اور اس وقت کے بعد پھر یہ عطیہ ربانی کبھی واپس نہیں لیا گیا، اور پھر یہ عمل بلاطلب اور بلا پیش بینی وقفوں کے ساتھ مسلسل جاری رہا۔"

.....

سال رواں (۱۹۲۷ء) میں اقبال نے "آئینہ عجم" کے عنوان سے میٹرکولیشن کے طلبہ کے لیے فارسی نظم و نثر کا انتخاب کیا۔ اس درسی کتاب کو میسرز عطر چند کپور نے شائع کیا۔

اس دوران میں آریہ سماجیوں نے دریدہ دہنی سے توہین رسول کرکے مسلمانوں کے جذبات مجروح کیے۔ سائمن کمیشن کی آمد آمد کے ساتھ سیاست ہند میں تیزی آئی۔ لیکن مسلمان رہنما مخلوط انتخاب اور جداگانہ انتخاب کے مسئلے پر آپس ہی میں الجھ رہے تھے اور انتشار ملّی میں مبتلا ہو رہے تھے۔ اسلامیان ہند کے سامنے کوئی واضح نصب العین نہیں تھا۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۲۷ء کو موچی دروازہ کے جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے یہ کہا:

"اس وقت مسلمانوں کے سامنے دو مسائل پیش ہیں، ایک حصول سوراج کا معاملہ اور دوسرا فرقہ وار نیابت کے قیام کا معاملہ---- بدقسمتی سے ملک کی اکثریت (ہندو جاتی) کے طرز عمل نے مسلمانوں کو حصول سوراج کے مسئلہ کی طرف سے بددل کر رکھا ہے۔ اب انہیں اپنے حقوق ملّی کے تحفظ کی فکر لاحق ہو رہی ہے اور مسلمانان ہند کی ترقی کا انحصار اسی مسئلہ پر ہے۔" (بحوالہ، گفتار اقبال)

۱۹۲۸ء

اس سال کے دوران اقبال اس دُور کے سیاسی مسائل اور صوبائی قانون ساز اسمبلی کے معاملات میں خاصے مصروف رہے۔ تاہم اپنے فارغ اوقات میں وہ فکر اسلام کی تشکیل نو کے سلسلے میں خطبات کی تصنیف و تالیف میں مگن رہے۔ سر جان سائمن کی سربراہی میں رائل کمیشن مارچ اور اکتوبر ۱۹۲۸ء میں دو بار ہندوستان آیا۔ اقبال اور سر محمد شفیع کمیشن کو پیش کرنے کے لیے محضر نامہ (میمورنڈم) بھی تیار کرتے رہے۔ ۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو اقبال، نیاز الدین خاں کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"پنجاب مسلم لیگ کی طرف سے میمورنڈا سائمن کمیشن کو بھیجا جائے گا جس میں مفصل حالات اور مسلمانوں کے مطالبات درج ہوں گے۔"

سید سلیمان ندوی سے خطبات کے سلسلے میں خط و کتابت جاری تھی۔ ہندوستانی مسلمانوں کا سیاسی انتشار ناگفتنی تھا۔ اقبال کو اس کا بھی شدید احساس تھا۔ ۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء کو سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"بزم اغیار، کی رونق ضروری تھی۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہل خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دُور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔"

۶ اپریل کو اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں "علم اور مذہب کا تجربہ" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ (خطبات تشکیل نو کا پہلا خطبہ)۔ اورینٹل کانفرنس منعقدہ لاہور کے عربی، فارسی سیکشن کا صدارتی خطبہ بھی دیا، جو تشکیل نو کے تیسرے خطبے کا موضوع تھا۔ اسی دوران درد گردہ کی شکایت پیدا ہوئی۔ جون کے مہینے میں حکیم نابینا کا علاج کروانے کے لیے دہلی گئے۔ سال کے اختتام تک تین خطبات کا مسودہ تیار ہو چکا تھا۔ میر غلام بھیک نیرنگ کو ۷ دسمبر ۱۹۲۸ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاست سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور

حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے "قوم پرستوں" کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے بہت تجربے کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرہ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے.... باقی رہا لیکچروں کے ترجمے کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں، اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفہ اسلام کو فلسفہ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے، اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں مَیں نے فلسفہ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ مگر مَیں خیال کرتا ہوں کہ اُردو خواں دنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے۔ کیونکہ بہت سی باتوں کا علم مَیں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے یا سننے والے کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ تین لیکچر امسال لکھے ہیں، تین آئندہ سال لکھوں گا۔"

دسمبر ۲۸ء کے آخر میں اقبال خطبات کے سلسلے میں مدراس روانہ ہوئے۔ دہلی میں سفر کا انقطاع کیا جہاں سر آغا خاں کی صدارت میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ اقبال، اس کانفرنس میں شریک ہوئے اور مسلم مطالبات پر سر محمد شفیع کی قرارداد کی تائید میں تقریر کی۔ اس کانفرنس کی منظور کردہ اکثر قراردادوں کو چند ماہ بعد مسٹر محمد علی جناح نے اپنے چودہ نکات میں سمو کر پیش کیا۔ کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے اقبال نے کہا:

"گذشتہ تین چار سال سے ہم کو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہو رہے ہیں، وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں۔ ہم کو جو باتیں اپنے برادران وطن کے متعلق قیاسی طور پر معلوم تھیں، اب وہ یقینی طور پر ہمارے علم میں آگئیں۔ مَیں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت

محسوس ہو رہی ہے۔ حضرات! آج مَیں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کاوش کرنی چاہیے اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمّت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا۔"

(بحوالہ گفتار اقبال)

۱۹۲۹ء

کُل جماعتی مسلم کانفرنس کے اجلاس سے فارغ ہو کر اقبال مدراس روانہ ہوئے۔ مسلم ایسوسی ایشن کی دعوت پر خطبات کے سلسلے میں یہ اُن کا طویل سفر تھا۔ جنوری ۱۹۲۹ء کے شروع میں وہ مدراس پہنچے جہاں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ ۵ تا ۸ جنوری تک وہاں انہوں نے تین خطبات دیے۔ بعض مقامی انجمنوں نے بھی ان کے اعزاز میں تقریبات کا اہتمام کیا اور وہاں اقبال نے تقریریں کیں۔ ۷ جنوری کو انجمن خواتین اسلام مدراس کے سپاسنامے کے جواب میں انہوں نے ایک طویل تقریر کی اور شریعت اسلام میں عورت اور مرد کے حقوق و مرتبے پر روشنی ڈالی۔۔ مدراس سے واپسی پر بنگلور اور میسور میں ایک، ایک اور حیدر آباد میں مدراس والے تینوں خطبات دیے۔ سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو شہید کے مزار کی زیارت کے لیے وہ خصوصی طور پر گئے اور مرقد کی زیارت کے موقع پر ایک والہانہ کیفیت اُن پر طاری ہوئی۔ لاہور واپس آ کر محمد جمیل بنگلوری کو لکھتے ہیں (مکتوب محررہ ۱۸ فروری):

☆ "آپ تک یہ اطلاع پہنچانا میرے لیے باعث مسرت ہے کہ مَیں آزمائش میں ثابت قدم نکلا اور اب باوجود مالی مشکلات کے ایران و ترکی کے سفر کی تیاری میں مصروف ہوں۔ خداوند تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسا ہے اور مَیں امید رکھتا ہوں کہ اس سفر کے لیے جو مَیں اسلام اور مسلمانوں کی بہتری و سربلندی کے لیے اختیار کر رہا ہوں، زاد راہ میسر آ جائے گا۔ مجھے اس اطلاع سے بیحد مسرت ہوئی کہ میرا سفر میسور، مسلم نوجوانوں میں تاریخی تحقیق کے ذوق و شوق کا باعث ہوا۔"☆

۱۴ اپریل ۱۹۲۹ء کو اقبال نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں "قرآن کا مطالعہ" کے موضوع پر لیکچر دیا۔ بقیہ تین خطبات بسلسلہ "تشکیل جدید، فکر اسلامی" کی تکمیل کا کام بھی جاری تھا اور غالباً "جاوید نامہ" کی تخلیق کا آغاز بھی ہو چکا تھا۔ محمد جمیل بنگلوری کے نام مکتوب محررہ ۴ اگست میں لکھتے ہیں:

☆ "آج کل عدالتیں تعطیلات گرما کے سلسلے میں بند ہیں اور مَیں اپنے آخری تین خطبات مرتب کر رہا ہوں، جو امید ہے اواخر اکتوبر تک مکمل ہو جائیں گے۔ ابھی تک اسلامی ممالک کی سیاحت کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ مالی مشکلات ہنوز سدِّ راہ ہیں۔ سلطان شہید پر میری نظم اُس کتاب کا حصہ ہوگی جسے مَیں اپنی زندگی کا ماحصل بنانا چاہتا ہوں، لیکن نہیں سمجھتا ہوں، اس کے لیے آپ کو کافی انتظار کرنا پڑے گا۔ مَیں نے اس کا ایک حصہ کچھ عرصہ ہوا مرتب کیا تھا لیکن پھر ضروری مشاغل کی بنا پر اس کو نامکمل چھوڑ دینا پڑا (اشارہ "جاوید نامہ" کی طرف ہے لیکن نام غالباً ابھی طے نہیں کیا گیا تھا)۔

مجھے سلطان کے کسی روزنامچے کا علم نہیں ہے۔ اگر ایسا روزنامچہ ہے تو مَیں اس کی نقل حاصل کرنا خوش بختی سمجھوں گا۔ کیا آپ کے پاس اس کی کوئی کاپی ہے؟ اگر ہے، تو اسے کچھ عرصے کے لیے مجھے عنایت فرمائیں۔ اپنے کام کے سلسلے میں ضروری باتیں نقل کرکے فوراً واپس ارسال کر دیا جائے گا۔

مجھے اس اطلاع سے ازحد مسرت ہوئی کہ جنوبی ہند میں یوم میلاد النبیؐ کی تقریب کے لیے ایک ولولہ پیدا ہوگیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ہند میں ملّت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کے لیے رسول اکرم ﷺ کی ذات اقدس ہی ہماری سب سے بڑی اور

کارگر قوت ہو سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں جو حالات پیدا ہونے والے ہیں، ان کے پیش نظر مسلمانان ہند کی تنظیم اشد لازمی ہے۔ آج صبح اس تحریک کے بانی یہاں تھے اور مَیں نے انہیں بتایا تھا کہ اس تحریک کو اسلام کے مقاصد کے لیے کس طرح کام میں لایا جاسکتا ہے۔ اس کی تفصیلات صرف زبانی گفتگو میں دی جاسکتی ہیں، لکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"☆

اگلے مکتوب مورخہ ۴ نومبر ۱۹۲۹ء میں اقبال اسی مکتوب الیہ کو لکھتے ہیں:

☆ "دس روپے کی رقم کے لیے شکریہ، جو آپ نے ہلال احمر کے لیے بنک میں جمع کرانے کے لیے بھیجی۔ مجھے امید ہے کہ بنگلور کے شرفا جن سے مَیں نے چندے کی اپیل کی ہے میری پکار پر لبیک کہیں گے۔ میں نے سیٹھ حاجی اسماعیل اور الکلام کے مدیر کو تار ارسال کیے ہیں، عبدالغفور صاحب کو بھی۔ از راہ کرم مت بھولیے انہیں یہ یاد دلانا کہ ٹرانس انڈس کے بھائیوں کے بارے میں ہمارے کیا فرائض ہیں۔ افغانستان کی آزادی اور استحکام ہند اور وسطی ایشیا کے لیے ایک بہت بڑا اثاثہ ہے۔ بچہ سقہ اپنے گیارہ ساتھیوں سمیت قتل ہوچکا ہے اور نادر خاں بادشاہ بتدریج استحکام حاصل کر رہا ہے۔ (۱۹۲۹ء کے شروع میں افغانستان میں شورش ہوئی اور بچہ سقہ نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ شاہ امان اللہ خان ملک بدر ہوگئے۔ جنرل نادر خاں نے فرانس سے آکر بغاوت فرو کی اور ملک میں امن وامان قائم کیا۔ لاہور کے مسلمان اکابر نے اکتوبر میں نادر خاں ہلال احمر سوسائٹی قائم کر کے اس نازک موقع پر اپنے افغان بھائیوں کی امداد کے لیے فنڈ کھولا۔ اقبال اس سوسائٹی کے صدر بنائے گئے تھے۔ مرّتب)

میرے خطبات اب مکمّل ہوچکے ہیں اور غالبا اسی ماہ علی گڑھ میں انہیں پیش کرنے کے لیے جاؤں گا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی طرف سے بھی اوآخر جون ۱۹۳۰ء میں اسی سلسلہ میں حاضری کی دعوت موصول ہوئی ہے۔ مدراس کی طرف سے بھی دعوت نامہ آیا ہے، لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ حاضر نہ ہوسکوں گا۔

سلطان شہید کے روزنامچہ کے حصول کے لیے آپ کی سعی کا ممنوں ہوں۔ اگر آپ مجھے اس کی ایک کاپی ارسال کرسکیں تو مَیں اسے بہت بڑا خزینہ سمجھوں گا۔ یہ

روزنامچہ مجھے سلطان کے بارے میں لکھنے یا اپنی موعود نظم میں مرّقع کشی کرنے میں بہت مدد دے گا۔ مہربانی فرما کر مجھے بتایئے کہ جن صاحب کے پاس یہ کتاب ہے کیا وہ اس کی قیمت طلب کرتے ہیں؟ اگر ایسا ہے تو مجھے رقم سے آگاہ کریں۔ اگر قیمت مناسب ہوگی تو مجھے اس کے ادا کرنے میں مسرت ہوگی۔"☆

اقبال نومبر ۱۹۲۹ء کے تیسرے ہفتے میں علی گڑھ گئے اور وہاں یونیورسٹی میں بقیہ تین خطبات پیش کیے۔ پہلا خطبہ ۲۰ نومبر ۱۹۲۹ء کی شام کو اسٹریچی ہال میں دیا گیا۔

۱۹۳۰ء

علی گڑھ سے واپس آ کر اقبال اپنے وہاں کے تاثرات عبدالماجد دریا بادی کے نام مکتوب محررہ ۵ جنوری ۱۹۳۰ء میں لکھتے ہیں:

"مَیں بھی ایک ہفتہ کے لیے علی گڑھ گیا تھا۔ وہاں ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے۔ سید راس مسعود بہت مستعد آدمی معلوم ہوتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کی مساعی سے یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی ہو گی۔ آپ بھی کبھی کبھی وہاں جایا کریں اور مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں تو نتائج بہت اچھے ہوں گے۔ باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں، مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام کے لیے تڑپ ہے لیکن افسوس کہ کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر مؤثر ہو۔"

۴ مارچ ۱۹۳۰ء کو محمد جمیل بنگلوری کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

☆ "آپ کے خوبصورت عید کارڈ کا شکریہ، جو مَیں نے چند لمحے قبل وصول کیا۔ مَیں بھی آپ کے لیے ایسی ہی پُرمسرت عید کا خواہاں ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہند کے علاوہ دیگر ممالک کے مسلم نوجوانوں پر اپنی بے پایاں رحمتیں نازل فرمائے، آمین۔

میرے خطبات زیر طباعت ہیں، اور امید ہے دو ماہ تک شائع ہو جائیں گے۔ مَیں ناشر سے کہوں گا کہ جونہی ان کی اشاعت ہو، ایک جلد آپ کو ارسال کر دے۔ لیکن اگر مَیں بھول جاؤں تو اپریل کے آخر میں مجھے یاددہانی کرا دیجیے۔ جہاں تک مجھے

معلوم ہے گولڈ زہیر کی کوئی انگریزی تصنیف نہیں۔ وہ جرمن یہودی ہے اور انگریزی میں نہیں لکھتا۔ اس کی معروف کتب جرمن میں ہیں اور ان میں مجھے کوئی زیادہ معلومات نہیں ملیں۔ مجھے یورپین مستشرقین پر بہت کم اعتماد ہے جن کی تصنیفات زیادہ تر سیاسی پراپیگنڈہ یا مشنری مقاصد پر مبنی ہوتی ہیں۔

افغانستان میں دوبارہ امن قائم ہوتا جاتا ہے۔ ہند میں معدودے چند افراد کو اس ملک کے انقلاب کے حقیقی اسباب سے واقفیت ہے۔ میری رائے میں امیر امان اللہ کی واپسی کے کوئی امکانات نہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں افغان اسے نہیں چاہتے۔ اعلیٰ حضرت نادر خاں ملک کو شاہراہ ترقی پر ڈالنے کی ازحد کوشش فرما رہے ہیں۔ وہ افغانوں کے محبوب رہنما ہیں۔ وہ نیم پنجابی بھی ہیں۔ ان کی والدہ لاہور میں پیدا ہوئیں اور یہیں پرورش پائی۔" ☆

ہند کے دستوری ارتقا کے سلسلے میں سیاسی لحاظ سے یہ سال بہت اہم تھا۔ شاہی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ مسٹر ایم۔ اے جناح نے برطانوی وزیراعظم کو دستوری مسئلے کے سلسلے میں لندن میں گول میز کانفرنس بلانے کا مشورہ دیا، جسے قبول کرلیا گیا اور اس سال کے آخر میں لندن میں گول میز کانفرنس طلب کرلی گئی۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ زیادہ تر مسلم مطالبات کے خلاف تھی۔ بنگال اور پنجاب میں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو قانونی اکثریت کے حق سے انکار کر دیا گیا۔ سائمن کمیشن کی منطق یہ تھی کہ اگر پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اُن کا یہ جائز حق دیا جائے تو یہاں فرقہ وارانہ حکومتیں قائم ہو جائیں گی، مگر اس منطق میں یہ عجیب مغالطہ تھا کہ یہی بات دوسرے چھ ہندو اکثریتی صوبوں کے بارے میں بھی کہی جاسکتی تھی جہاں بدترین قسم کی ہندو فرقہ وارانہ حکومتیں قائم ہوتیں۔ بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی پر بھی مخالفانہ تنقید کی گئی تھی۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کو مساوی اصلاحات دینے سے بھی انکار کیا گیا۔ یہ ان علاقوں کے مسلمانوں سے صریحاً بے انصافی تھی۔ اقبال کو اس بے انصافی پر ازحد تشویش تھی۔ چنانچہ انہوں نے ۲۴ جون کو سر ذوالفقار علی کے ساتھ ایک مشترکہ بیان میں کہا:

"حیرت ہے کہ سر جان سائمن اور ان کے رفقا نے یہ کہہ کر کہ پنجاب اور

بنگال میں فرقہ وار حکومت قائم ہو جائے گی، عجیب نامطابقت کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ کمیشن نے نہایت آسانی سے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا ہے کہ اسی قسم کی فرقہ وار حکومت باقی چھ ہندو صوبوں میں بھی تو قائم ہو جائے گی۔ پس یہ واضح ہے کہ کمیشن مسلمانوں کے معاملے میں اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں، جس کی ہندوؤں کے معاملے میں پورے طور پر حمایت کی گئی ہے--- سندھ کی علیحدگی کے مسئلے سے عملی طور پر بے پروائی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ متنازع فیہ مسئلہ ہندی مسلمانوں کو اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دے گا جب تک نئے دستور کے نفاذ سے قبل اس کا کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے بارے میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس ضمن میں کمیشن کی سفارشات نہ ہندی مسلمانوں کی تسلّی کر سکیں گی اور نہ ان دو صوبوں کے مسلمانوں کو مطمئن کر سکیں گی۔ ان دو صوبوں کے ساتھ دوسرے صوبوں سے مختلف سلوک کرنا کسی طرح بھی قرین انصاف نہیں۔

رپورٹ کی سفارشات کی تہہ میں جو پالیسی کارفرما ہے، اس کا مطلب ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے۔ اس وقت جو فوری مسئلہ مسلمانوں کے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ آیا ان حالات میں وہ اقلیّت کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ ہماری رائے صاف طور پر یہ ہے کہ جب تک حالات ایسی صورت اختیار نہ کر لیں، جو مسلمانوں کے مطالبات کے لیے مفید ہو، کانفرنس میں ہماری شرکت سے قوم کو بجائے فائدے کے نقصان ہوگا۔ ہم مسلمانان ہند سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فی الفور ایک جُداگانہ طریق عمل پر گامزن ہونے کے لیے اپنی طاقتوں کو مرتکز کریں۔"

سیاسی مسائل کی نزاکت سے دوچار ہونے کے ساتھ ساتھ "جاوید نامہ" کی تخلیق کا عمل بھی جاری تھا اور اس کے لیے ضروری مواد کی فراہمی کا مسئلہ درپیش تھا۔ ۲۵ جولائی کو اقبال مولوی صالح محمد کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مَیں نے شاید آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ میرا مقصود "سیرالسما" کے

مطالعہ سے علمی تحقیقات نہیں ہے۔ علمی سے میری مراد وہ تحقیق ہے جس کا دارومدار علم ریاضی پر ہو اور جس کے مشاہدات کے لیے دُوربینوں کی ضرورت ہو۔ میرا مقصود اس تحقیق سے ہے جس کی بنا مکاشفات قلبی پر ہو۔ چونکہ آپ کے والد ماجد "سیرالسما" کو دیکھ چکے ہیں اور اس واسطے مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے گوہر مقصود ہاتھ آئے گا۔ حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیجئے، جب میری کتاب ختم ہو گئی تو انشاء اللہ اس کی ایک جلد حاضر خدمت کروں گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ بے انتہا خوش ہوں گے۔ جہاں تک میرا علم ہے کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ کتاب نظم میں ہے۔ زبان فارسی، مثنوی مولانا روم کی بحر میں ہے۔"

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ نے ہند کے سیاسی منظر کو بہت نازک بنا دیا تھا۔ اندریں حالات ملکی رہنماؤں کو ہندوستانی مسئلے کے حل کے لیے لندن کی گول میز کانفرس میں مدعو کیا گیا۔ نومبر ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔ لندن سے آمدہ اطلاعات کے مطابق کانفرنس میں ہندو رہنماؤں کا رویہ مسلم مطالبات (خصوصاً پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو آبادی کے تناسب سے نیابت کا حق دینے) کے بارے میں سخت معاندانہ تھا۔ اس سے ہند کے اسلامی حلقے بہت مضطرب تھے۔ ان اضطراب انگیز حالات میں اقبال اور ان کے رفقا مسلم اکثریتی صوبوں (پنجاب، سرحد، سندھ، بلوچستان) کے نمائندوں کی ایک اپر انڈیا مسلم کانفرنس کے انعقاد کے خواہاں تھے۔ اس سلسلے میں "مسلم آؤٹ لک" کے نمائندے کو بیان دیتے ہوئے اقبال نے کہا:

"یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کرکے بیان کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پُرزور طریق پر اظہار کریں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کو بہ اعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے، ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ مَیں کسی طرح کی زائد از استحقاق نیابت کا حامی نہیں ہوں۔" (۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء، بحوالہ گفتار اقبال)

ہند میں مسلمانوں کے جائز حقوق اور مفادات کا مسئلہ اقبال کے ذہن میں خصوصی اہمیت حاصل کر چکا تھا اور وہ اپنی حیات مستعار کی آخری سانسوں تک اس

مسئلے کے حل کے لیے کوشاں رہے۔ گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ ہونے سے چند ماہ قبل مسٹر ایم۔ اے جناح نے ۱۹۳۰ء میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کے لیے لیگ کونسل میں اقبال کا نام تجویز کیا، اور یہ تجویز متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے اقبال نے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو الٰہ آباد میں اپنا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں ہند کے درپیش مسائل کا معروضی جائزہ لینے کے علاوہ مسلم قومیّت اور ہندی قومیّت کے تصورات کا عالمانہ تجزیہ کیا اور ہند میں ایک آزاد اسلامی مملکت کا تصوّر پیش کیا۔ یہ خطبہ اقبال کی سیاسی بصیرت و تدبر اور ان کی فکر و نظر کا آئینہ دار ہے۔ موجودہ مطالعے کے لحاظ سے اس خطبے کے اہم حصے درج ذیل ہیں:

خطبہ الٰہ آباد (ملخّص)

☆ "حضرات! مَیں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جبکہ مسلمانان ہند کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں اُن حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملات فہمی کا مَیں دل سے قائل ہوں، لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر مَیں ان مسائل میں جن کے فیصلے کے لیے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی راہنمائی کا دعویٰ کروں۔ مَیں کسی جماعت کا رہنما نہیں، نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ مَیں نے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت، جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے جیساکہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، رہا ہے، مَیں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے، لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہند بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مُصِر ہیں، مَیں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں، خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو، آپ

کے دل میں اسی بنیادی اصول کا احساس پیدا کردوں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس آخری لفظ سے میرا مطلب ایک ایسی جماعت ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی۔ اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارو مدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کی ترکیب صرف اسلام ہی کی رہین منت ہے، کیونکہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین و ادارات کی شرمندۂ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں ایک انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشوونما پایا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا۔ اس کو دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی کیونکہ اس قسم کا نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس

کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کے عالمگیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں. ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے اور لہٰذا ان کا حلقہ اثر بالکل محدود ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسو کی ذات سے ہوا اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمح نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسانی سے متعلق تھا، اقوام کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لیے انہیں ایک سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی احساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنہوں نے جذبہ قومیت کے ماتحت پرورش پائی، یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدۂ وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے اور انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ اسلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہوچکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجاطور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے، اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے، وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رُو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کُل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا ہے۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مُصِرّ ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل

یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جن سے یورپ کی مسیحائی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہ" علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہوگئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہوچکا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ اسلام کے دل میں موجود تھا، انہوں نے لوتھر کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہرحال دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں جو ازمنہ متوسط کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو؛ اور لہٰذا جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی و تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں، لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لیے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ مَیں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہوگا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اس طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا۔ یا یہ کہ خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ویننسنک (Wensinck) نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت بھی نازک دَور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تنزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کرسکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا؟

اسلام کے متعلق کوئی پیشینگوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے اور اس طرح اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے، ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان اصول و قواعد کے محرک ہوں جو تعلیمات اسلامی کے بالکل مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہوں۔

مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لیے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لیے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہوگیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کراسکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ جس مسئلہ کی طرف مَیں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہوسکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز اور متمیّز تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا، جیساکہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ مَیں نہیں چاہتا کہ جس انداز سے مَیں نے اس مسئلہ پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے مَیں اُن سے بے کار مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزو مند ہیں۔ میرا مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق مَیں

نے جو رائے قائم کی ہے اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کردوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ مَیں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منوّر کر سکوں۔

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے؟ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیّل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کے بجائے اُن قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا امکان باقی نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ باعتبار آبادی ہم لوگ یہاں اقلیّت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی واردات محض انفرادی اور ذاتی واردات ہے، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیات سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مرتب ہو سکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آں حضرتؐ کے واردات مذہب کی حیثیت، جیساکہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں جن کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گردو پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اوّلین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی تاسیس ہوئی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر تھے اور جن کی اہمیت کو محض اس لیے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بنیاد وحی و الہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے، الگ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ مَیں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لیے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لیے آمادہ ہوگا،

جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر مبنی ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کے منافی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہند کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کرسکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کرسکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہیں کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ "قوم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب و اجتماع سے انکار نہیں، اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے۔ اس لیے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی۔ لیکن تجربہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہیئت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لیے کسی قوم کی تخلیق کے لیے ناگزیر ہے، ایک ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لیے ہندوستان میں کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا، خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں، اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہ" موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہوسکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی قسمت صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب و تمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ

ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک اور تعاون کی کوئی مؤثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم ملک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی جغرافیائی حیثیت کے باعث ایک عرصہ دراز سے مصائب و فتن کا تختہ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطنا" ہم تغلب و اقتدار کے خواہش مند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد و تعاون کے مقاصد عالیہ کے لیے اتنا ایثار بھی نہیں کرسکتے کہ اب تک جو اختیارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہوگئے ہیں، ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا ادعا ہے، لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ہر جماعت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہرکیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں اگر فرقہ وارانہ امور کے بارے میں مستقل اور پائیدار تصفیہ کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہند کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ وہ فرقہ واری جو دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے، اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ

نہیں۔ مُیں دوسری قوموں کے رسوم و قوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی ادارات کی دل سے عزت کرتا ہوں، بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضائیں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع و اطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرنو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے واضعین تک نے بھی فرقہ واری کے اسی پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

"یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں، بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم سے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر (اور یاد رکھئے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں) ایک ہم آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا ناممکن ہے۔"

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کے نشوونما کی طرح مختلف ملتوں کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہو سکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں مغربی طرز کی جمہوریت کا نفاذ کیا جائے۔ لہٰذا مسلمانوں کا مطالبہ کہ ہندوستان میں ایک اسلامی ہند قائم کیا جائے، بالکل حق بجانب

ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف ملتوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنے ان ممکنات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں، عمل میں لا سکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں نہایت شد و مد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ :

پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔

اس تجویز کو نہرو کمیٹی میں بھی پیش کیا گیا تھا۔ لیکن اراکین مجلس نے اسے اس بنا پر رد کر دیا کہ اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو اراکین مجلس کا یہ خیال صحیح ہے۔ لیکن آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی، غالباً قسمت انبالہ یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی، پھر ان اضلاع کی علیحدگی سے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق کہیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔ اس تجویز کو سن کر نہ انگریزوں کو پریشان ہونا چاہیے، نہ ہندوؤں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے، اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس زندہ اور جاندار طبقے کی بدولت، جس نے دولت برطانیہ کی ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس ملک پر اپنی حکومت قائم رکھیں، ہندوستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بلکہ اس سے خود مسلمانوں کے احساسات ذمہ داری قوی ہو جائیں گے اور ان کا جذبہ حب

الوطنی بڑھ جائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو اس امر کا موقع دیا گیا کہ وہ ہندوستان کے حد سیاسی کے اندر رہ کر اپنے نشو و ارتقاء میں آزادانہ قدم اٹھا سکیں تو وہ تمام بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فی صد ہے لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ہمارا حصہ ۵۴ فی صد ہے، اور اگر عساکر ہند کی کُل تعداد میں سے ان ۱۹ ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو مسلمانوں کی کُل تعداد ۶۱ فیصد ہو جائے گی، حالانکہ اس اندازے میں وہ ۶ ہزار جنگجو شامل نہیں جو بلوچستان اور صوبہ سرحد سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام صلاحیتوں کا بہ آسانی اندازہ کرسکیں گے جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی میں موجود ہیں اور جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ملکی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون رکھ سکتے ہیں۔ رائٹ آنریبل مسٹر سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ مسلمانوں کا مطالبہ کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار اسلامی ریاستیں قائم کی جائیں، ان کی اس خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر دباؤ ڈالا جاسکے۔ مَیں یہ عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ موجود نہیں۔ ان کا مدعا صرف اس قدر ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں لیکن یہ اس مرکزی حکومت کے ماتحت ممکن نہ ہوگا جسے قوم پسند ہندو ارباب سیاست محض اس لیے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کو دوسری ملّتوں پر ہمیشہ کے لیے غلبہ حاصل ہو جائے۔

بہرحال ہندوؤں کے دل میں اس قسم کا خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ آزاد اسلامی ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومت قائم ہو جائے گی۔ مَیں ابھی عرض کرچکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں، بلکہ ایک ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی کہیں پیشتر ایک ایسے وجود میں ہوا جو عقد اجتماعی کا پابند ہے۔ ریاست اسلامی کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان شجر و حجر کی طرح کسی خاص زمین سے وابستہ نہیں، بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتا ہے اور اس کے ایک

زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کا مالک ہے۔ اسلامی ریاست کی نوعیت کا اندازہ "ٹائمز آف انڈیا" کے اس افتتاحیہ سے کیا جاسکتا ہے جس میں لکھا ہے کہ قدیم ہند میں ریاست کا یہ فرض تھا کہ سُود کے متعلق قوانین بنائے لیکن باوجود اس کے کہ اسلام میں سُود لینا حرام ہے، اسلامی حکومت نے شرح سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں۔ مُیں صرف ہندوستان اور اسلام کی فلاح اور بہبود کے خیال سے ایک منظّم اسلامی ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو اس امر کا موقع ملے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو کر جو عربی شہنشاہیت کی وجہ سے اب تک اس پر قائم ہیں، اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب و تمدن، شریعت اور تعلیم پر صدیوں سے طاری ہے۔ اس سے نہ صرف ان کے صحیح معانی کی تجدید ہوسکے گی بلکہ وہ زمانہ حال کی روح سے بھی قریب تر ہو جائیں گے۔

میرے خیال میں اب یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہوگئی ہے کہ ہندوستان کے لسانی اور عقائد و معاشرت کے بے شمار اختلافات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مستقل حکومت قائم کرنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں ایسی آزاد ریاستیں قائم کر دی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر مبنی ہوں۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ (گول میز کانفرنس میں) ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی رہنما کو اس طعن آمیز لفظ (یعنی فرقہ واری) کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیے جسے ہندو محض پروپیگنڈے کی خاطر استعمال کر رہے ہیں، تاکہ بقول وزیراعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھا سکیں، اور انگریز ہندوستان میں ایک ایسی صورت حالات فرض کر لیں جو واقعتہ" موجود نہیں۔ اس وقت بڑے بڑے مفاد خطرے میں پڑے ہیں۔ ہماری تعداد سات کروڑ ہے اور ہم ہند میں کسی اور گروہ کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر

ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ صرف مسلمان ہی ہے۔ اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں، لیکن اب بھی ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لیے ناگزیر ہے، جو اسلام نے ایک نعمت کے طور پر آپ کو عطا کی ہے۔ بیشک ہندو اس امر کے لیے مضطرب ہیں کہ وہ ایک ہی قوم بن جائیں، مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے۔ اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان رہنماؤں و ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر نہیں ہونا چاہیے کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ممالک قوم پسندی کے جدید اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانان ہند کی حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق، باصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھو لے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رُو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحاد نوع انسان کی خاطر اٹھایا۔ اس سے ان لوگوں کو جن کا سیاسی نصب العین تقریباً ایک سا تھا باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

یاھل الکتب تعالو الیٰ کلمۃٍ سوآء بیننا و بینکُم (۳ : ۶۴)

[ترجمہ : اے اہل کتاب آؤ ایک ایسے کلمے (توحید) کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے] یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ وجدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقع نہیں دیا کہ دنیائے اسلام اس آیت کے لا انتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہرحال آج بلاد اسلامیہ میں یہ مقصد اسلامی قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس امر سے کرسکتے کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرار داد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہوگا۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ ہند کے مسلمان ایک ہو کر کوئی

آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے سر برآوردہ لوگوں نے کافی غور و خوض سے کام لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہیں کے غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوموں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہند کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ قسمتوں کی تشکیل میں کارفرما ہیں۔ لیکن مَیں آپ سے اس قدر پوچھتا ہوں کہ کیا اسی غور و فکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت پیش آئے تو ہم اپنے آپ کو اس قسم کے عمل کے لیے تیار پائیں جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلا تکلّف کہہ دینا چاہئے کہ ہند کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملّتِ اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے؟ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے، یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ اور اجتماعی احساس باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ جو طرز عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا ہے، اب وہی سیاسیات میں ہوگیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا کیونکہ ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دل چسپی ہے جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقے کو اس قدر جرأت نہیں ہوسکتی کہ وہ اسلام کی حدود ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا بالخصوص اس وقت جب مفاد ملت کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور

کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے؟ اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفعیہ کرسکتے ہیں۔ مَیں نے اسی موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے، لیکن بہتر ہوگا کہ مَیں اس وقت تک اس کا ظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حالات پیدا نہ ہو جائے، جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں، فرض ہوگا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں، اور صرف مسلمانوں کے لیے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ مَیں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لیے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا، آخر میں، مَیں صرف اتنا عرض کروں گا کہ مسلمانان ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دَور میں سے گزر رہے ہیں، اس کے لیے کامل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملّی وجود کی بقا اور ہند کا مفاد صرف اسی امر سے وابستہ ہے۔ ہند کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے، جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شان دار تمدّن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہند کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے اور ایک فرض ایشیا بالخصوص اسلامی ایشیا کی جانب سے، اور چونکہ ایشیا کے دوسرے اسلامی ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لیے ایک بیش بہا سرمایہ ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ہند کے مسئلے پر محض اسلامی زاویہ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بھی غور کریں۔ ایشیا اور ہند کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہیں کر لیں گے، اگر آپ ہند کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لیے ناگزیر ہیں، دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ مَیں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیے سے مایوس نہیں ہوں

لیکن مُیں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لیے ہماری ملّت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنی پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرز عمل کے لیے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو، اور اس کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرتکز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا ازخود نشوونما ہوتا ہے؟ ہاں، کیوں نہیں۔ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیودؔ سے آزاد ہو جائیں اور اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے، اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدرو قیمت کا اندازہ کیجئے، خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نوُر ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو مَیں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں ازسر نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملّت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس واحد کا، پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجاطور پر دعویٰ کرسکتے ہیں کہ یہ ہمیں تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے، ایک نفس واحد کی طرح زندہ رہیں۔ جب مَیں یہ کہتا ہوں کہ ہند کی حالت وہ نہیں جیسی کہ نظر آتی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مَیں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہرحال اس کے صحیح معنے آپ پر اس وقت آشکار ہوسکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لیے ایک صحیح اجتماعی اَنا پیدا کرلیں گے۔ قرآن کے لفظوں میں:

یایھا الذین امنو علیکم انفسکم لایضرکم من ضل اذا اھتدیتم (۵:۵-۱)

ترجمہ: (اے ایمان والو! اپنی فکر کرو، جب تم راہ پر چل رہے ہو تو جو شخص

گمراہ رہے تو اس سے تمہارا کوئی نقصان نہیں۔)

۱۹۳۱ء

پہلی گول میز کانفرس دسمبر ۱۹۳۰ء میں اختتام کو پہنچی۔ ہند میں گاندھی، اروِن معاہدے کے ساتھ کانگرس کی نمک سازی تحریک اور سول نافرمانی بھی ختم ہوگئی، اور لندن میں دوسری گول میز کانفرنس کی تیاری ہونے لگی۔ اقبال کی سیاسی مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ مجوزہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس الٰہ آباد کی وجہ سے جنوری ۱۹۳۱ء کے آخری ہفتے پر ملتوی ہوئی تھی، لیکن پھر اس کا انعقاد نہ ہوسکا۔ حالات بڑی تیزی سے بدل رہے تھے۔ سری نگر کے سانحہ (۱۳ جولائی) کے بعد تحریک کشمیر شروع ہوگئی۔ لاہور میں مغلپورہ انجینئرنگ کالج کے انگریز پرنسپل کی دریدہ دہنی کی وجہ سے پنجاب کے مرکز میں ایجی ٹیشن ہوئی۔ کانپور اور کئی دوسرے شہروں میں ہندو مسلم فسادات نے سر اٹھایا۔ تحریک خلافت کے زوال کے بعد مسلم رہنماؤں کے اختلافات اور اس کے نتیجے میں اسلامیان ہند کا انتشار عروج پر پہنچ رہا تھا۔ اقبال اس دلخراش منظر کو دیکھ دیکھ کر مضطرب ہو رہے تھے۔

"مَیں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو ابھی تک اس کا احساس نہیں کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس ملک ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے، اور اگر وقت پر موجودہ حالت کی اصلاح کی طرف توجہ نہ کی گئی تو مسلمانوں اور اسلام کا مستقبل اس ملک میں کیا ہو جائے گا۔ ہم تو اپنا زمانہ حقیقت میں ختم کر چکے۔ آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک سے فنا ہو جائے۔"

اس مایوس کُن تاریک فضا میں بھی اقبال اُمیدوں کے چراغ جلائے چلے جا رہے تھے۔ ان کی شعری تخلیقات کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ کلکتہ کے مولانا راغب احسن "جمعیتہ الشبان المسلمین" کے نام سے ایک تنظیم قائم کر رہے تھے۔ اقبال ۲۸ مئی ۱۹۳۱ء کو ان کے نام مکتوب میں تحریر کرتے ہیں۔

"آپ کا خط مع "میثاق" ابھی ملا ہے۔ آپ کی تحریک مبارک ہے۔ کچھ عجب

نہیں کہ عالم گیر ہو جائے۔ انگریزی ترجمے کی فی الحال کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت تک انتظار کیجئے جب کہ انگریز خود آپ کی تحریک کا مطالعہ کرنے کے لیے انگلستان سے ہندوستان آئے۔ فی الحال اس کا ترجمہ جدید فارسی، عربی، ترکی اور پشتو میں کرائیے، اور ممکن ہو تو اہل زبان سے، پھر ایک خبر کی صورت میں ممالک اسلامیہ میں اس میثاق و قواعد و مقاصد وغیرہ کو شائع کرائیے تاکہ ان ممالک میں اس کی تخم ریزی ہو جائے۔ غالبا آپ کی تقلید وہاں بھی ہوگی یا ممکن ہے ان ممالک میں یہ تحریک کوئی اور صورت اختیار کر لے۔۔

مدت ہوئی مَیں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج عربی گھوڑوں پر سوار ہے۔ مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں۔ میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالک اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑوں سے مراد روح اسلاف ہے۔ کیا عجب کہ یہی وہ تحریک ہو جس کا آغاز آپ نے کیا ہے۔ ابھی اور بھی امور ہیں جن پر آپ کو غور کرنا ہو گا اور ان کو اپنی تحریک کے اور مقاصد کے اجزا بنانا ہو گا۔ مگر ان کا وقت ابھی نہیں آیا۔ قومی سرمائے کی سخت ضرورت ہے۔ افسوس مسلمان امراء پر حب مال غالب ہے۔"

"جاوید نامہ" کی تکمیل کے بارے میں مولوی صالح محمد کو ۲۲ اپریل ۱۹۳۱ء کے تحریر کردہ مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کتاب جاویدنامہ جو مَیں لکھ رہا تھا، ختم ہو گئی ہے۔ آج کل میں کاتب کے حوالے کر دی جائے گی۔ "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" جو مَیں نے انگریزی زبان میں لکھی تھی، اس کا اردو ترجمہ بھی ہو گیا ہے۔ عنقریب شائع ہو جائے گا۔"

جامعہ ملیہ دہلی اقبال کے خطبات "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" طبع و شائع کرنا چاہتا تھا۔ جامعہ کے رکن سید نذیر نیازی اس کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر رہے تھے۔ مگر ترجمے کا یہ کام ابھی ادھورا تھا اور اقبال کو اس بارے میں غلط اطلاع دی گئی تھی۔ اسی اثنا میں اقبال کو دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت ملی۔ ۱۹ اگست ۱۹۳۱ء کو سید نذیر نیازی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مَیں غالبا یکم ستمبر کی شام کو یہاں سے روانہ ہوں گا اور ۵ ستمبر کو بمبئی (پہنچوں

گا۔) ممالک اسلامیہ کی سیاحت کی بڑی آرزو ہے مگر یہ سب کچھ روپیہ پر منحصر ہے۔ خطبات کے ترجمے کی اشاعت کا التوا ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امید ہے دسمبر کے آخر تک واپس آ جاؤں گا۔ جاوید نامہ ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ کل اس کی کتابت ختم ہو گی۔ غالباً اکتوبر کے آخر میں شائع ہو جائے گا۔"

گول میز کانفرنس کے لیے دعوت نامے اگست کے شروع میں شملہ سے جاری ہوئے اور مندوبین کو ۲۶ ستمبر تک لندن پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اقبال یکم ستمبر کو بوجہ علالت نہ روانہ ہو سکے۔ ۸ ستمبر کو لاہور سے روانہ ہو کر ۹ ستمبر کی صبح کو دہلی پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کی خدمت میں بہت سی انجمنوں کی طرف سے سپاس نامے پیش کیے گئے۔ ۱۰ ستمبر کو اقبال بمبئی پہنچے اور خلافت ہاؤس میں قیام کیا۔ ۱۲ ستمبر کو "ملوجا" نامی بحری جہاز پر عازم انگلستان ہوئے اور ۲۷ ستمبر کو لندن پہنچے۔ وہ تقریباً ۲۳ سال بعد دوسری بار انگلستان آئے تھے۔ سینٹ جیمز کورٹ میں ان کا قیام ہوا۔ گول میز کانفرنس اکتوبر میں شروع ہوئی۔ کانفرنس میں شرکت کے علاوہ اقبال کیمبرج بھی گئے اور لندن کی مختلف ادبی انجمنوں نے بھی انہیں دعوت دی جن میں لندن انڈیا سوسائٹی، نیشنل لیگ آف انگلینڈ قابل ذکر ہیں۔ ان انجمنوں میں اقبال نے اپنے بعض نظریات اور خیالات بھی پیش کیے۔ لندن میں اقبال اسلامی ملکوں کے کئی اکابر سے بھی ملے اور ان سے تبادلۂ خیال کیا۔ ان اکابر میں سید ضیاء الدین طباطبائی (ایران کے سابق وزیراعظم)، حلیمی پاشا (مصر کے سابق وائسرائے)، رؤف بے (مشہور بحری جنگی جہاز "حمیدیہ" کے کپتان، سعید شامل (کاکیشیا، داغستان کے مشہور امیر المجاہدین امام شامل کے پوتے) اور افغانستان، عراق اور البانیہ کے سفیر شامل تھے۔

اقبال لٹریری ایسوسی ایشن کی طرف سے اقبال کے اعزاز میں جو استقبالیہ دیا گیا اس میں گول میز کانفرنس کے تقریباً تمام مندوبین اور بہت سے اکابر علم و فن شریک ہوئے۔ اقبال نے سپاسنامے اور تقاریر کے جواب میں جو کچھ فرمایا اسے غلام رسول مہر کی رپورٹ (بحوالہ انقلاب) کے مطابق یہاں پیش کیا جاتا ہے:

"۱۹۰۵ء میں جب مَیں انگلستان آیا تھا تو مَیں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں، جو انسان کے

لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے، جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی تو وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے کے لیے سائنس تھی جو اُن کو افسردہ بنا رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں جب مَیں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات سے میرے دل میں کشمکش پیدا ہوئی کہ ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ مَیں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی، اور مَیں اس درجے منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا، اور مَیں نے فیصلہ کیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہئیں، لیکن اندیشہ تھا کہ ان سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہرحال مَیں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدنظر رکھ کر اپنی مثنوی "اسرار خودی" لکھنی شروع کی۔ اردو کو چھوڑ کر فارسی میں شعر کہنے شروع کرنے کے متعلق اب تک مختلف لوگوں نے مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج مَیں یہ راز بھی بتا دوں کہ مَیں نے کیوں فارسی میں شعر کہنے شروع کیے۔ بعض اصحاب خیال کرتے ہیں کہ فارسی زبان مَیں نے اس لیے اختیار کی کہ میرے خیالات زیادہ وسیع حلقے میں پہنچ جائیں۔ حالانکہ میرا مقصد اس کے بالکل برعکس تھا۔ مَیں نے اپنی مثنوی "اسرار خودی" ابتداء میں صرف ہندوستان کے لیے لکھی تھی اور ہندوستان میں فارسی سمجھنے والے بہت کم تھے۔ میری غرض یہ تھی کہ جو خیالات مَیں باہر پہنچانا چاہتا ہوں وہ کم از کم حلقے تک پہنچیں۔ اس وقت مجھے خیال بھی (نہ) تھا کہ یہ مثنوی ہندوستان کی سرحدوں سے باہر جائے گی یا سمندر کا سینہ چیر کر یہ یورپ پہنچ جائے گی۔ بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ اس کے بعد فارسی کی دل کشی نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اور مَیں اسی زبان میں شعر کہتا رہا۔

مَیں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے ان پر ابتدا میں بہت سے اعتراض ہوئے۔ حتیٰ کہ میری نسبت کہا گیا کہ مَیں دہریت کی تبلیغ کر رہا ہوں اور یہ اعتراض مسیحی کلیسا کے ایک رئیس کی طرف سے پیش ہوا۔ سائنس کے مقابلے میں یورپی ادبیات کی

کمزوری اور انحطاط کا مجھے جو احساس ہوا، اسے مَیں نے مختلف اشعار کے روپ میں پیش کیا ہے، مثلاً

عشق ناپید و خرد مے گزدش صورت مار
گرچہ در کاسۂ زر لعل روانے دارد

مَیں مکرر آپ حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور خوش ہوں کہ اگرچہ میرے ساتھ رفقا کی کوئی فوج نہیں ہے، تاہم رفقا کی ایک کثیر جماعت میرے سامنے ہے۔ آپ اپنی تعداد بڑھایئے، مَیں آپ کو وہی نصیحت کرتا ہوں جو مَیں نے اپنے فرزند (جاوید اقبال) کو کی ہے، یعنی:

کم خور و کم خواب و کم گفتار باش .
گرد خود گردندہ چوں پرکاز باش

اور آپ کے سامنے وہی بات دہراتا ہوں جو مَیں نے صوفیوں سے کہی ہے:

زمن گو صوفیان باصفا را
خدا جویان معنی آشنا را
غلام ہمت آن خود پرستم
کہ با نور خودی بیند خدا را"

۴ نومبر کو اقبال نے لنڈیا سوسائٹی میں خطاب کیا:

"بے شک میرے اشعار میں مختلف مسائل کے متعلق فلسفیانہ خیالات موجود ہیں لیکن میرا کوئی منظم و مرتب فلسفہ نہیں۔ البتہ فلسفے کے ایک مسئلے یعنی حیات بعد الموت کے ساتھ مجھے خاص دلچسپی رہی ہے۔ مَیں انسان کے شاندار اور درخشاں مستقبل کا پختہ یقین رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظام کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔ یہ عقیدہ میرے خیالات و افکار میں آپ کو عموماً جاری و ساری نظر آئے گا۔"

اس کے بعد اقبال نے اپنی بعض نظمیں مع انگریزی ترجمہ سنائیں۔ اپنی فارسی تصانیف کا تعارف کرایا اور آخر میں اپنی زیر طبع تصنیف "جاوید نامہ" کا تعارف کراتے ہوئے اپنے ذہنی و روحانی سفر کی ڈرامائی کیفیات کو بیان کیا:

"کتاب کا آغاز مناجات سے ہوتا ہے۔ شام کا وقت ہے اور شاعر ساحل سمندر پر کھڑا رومیؒ کے کچھ اشعار پڑھ رہا ہے۔ اس عالم میں رومیؒ کی روح نمودار ہوتی ہے۔ شاعر رومیؒ کی روح سے کئی طرح کے سوالات پوچھتا ہے۔ اہم ترین سوال یہ ہے کہ انسان کی روح کس طرح زمان و مکاں کی حدود سے پار جاسکتی ہے۔ مقصد واقعہ معراج کو فلسفیانہ جہت دینا ہے۔ تب زمان و مکان کی روح (زروان) نمودار ہوتی ہے، جسے شاعر نے دو چہروں والے فرشتے کی صورت دی ہے۔ ایک چہرہ تاریک اور خواب آلود ہے، دوسرا روشن اور بیدار۔ یہ روح شاعر پر ایک طرح کا سحر کر دیتی ہے اور اسے بلندیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ رومیؒ اور شاعر (زندہ رود) کی روحیں خلا میں تیرتی نظر آتی ہیں، حتیٰ کہ مہتاب کے پہاڑ نظر آنے لگتے ہیں۔ یہاں وہ ستاروں سے زمزمہ انجم سنتے ہیں--- یہ ایک طرح سے اُن انسانوں کا خیر مقدم ہے جنہوں نے خلا سے آگے گزرنے کا حوصلہ کیا۔ فلک قمر پر پہنچ کر وہ چاند پر اُترتے ہیں اور چند غاروں میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک غار میں عارف ہندی وشوامتر سے ملتے ہیں جسے شاعر جہاں دوست کے نام سے یاد کرتا ہے۔ یہ عارف مراقبے میں بیٹھا عبادت کر رہا ہے۔ ایک سفید سانپ اس کے سر کے گرد لپٹا ہے۔ رومیؒ کو پہچان کر عارف پوچھتا ہے، آپ کے ساتھ نووارد کون ہے؟ رومی زندہ رود کے نام سے اپنے ساتھی کا مختصر تعارف کراتے ہیں۔ اس پر عارف ہندی نووارد سے کچھ استفسارات کرتا ہے تاکہ اس کے روحانی ارتقا کا اندازہ لگا سکے۔ مثلاً ایک یہ سوال "کس بات میں انسان کو اللہ پر فوقیت حاصل ہے؟" جواب دیا گیا: "موت کے بارے میں اپنے تجربے کی بدولت!" اسی طرح وہ کچھ اور سوالات پوچھتا ہے اور زندہ رود سے ان کے تسلّی بخش جوابات پا کر وہ مختلف اشیاء کے بارے میں حقیقتوں کا انکشاف کرتا ہے جو نظم کا موضوع ہیں--- عارف ہندی سے رخصت ہو کر وہ غار سے باہر نکلتے اور چاند کی وادی میں سے گزرتے ہیں۔ یہاں وہ ایک بڑی چٹان پر چار نقش کندہ دیکھتے ہیں جنہیں طاسین گوتم بدھ، طاسین یسوع مسیح، طاسین زرتشت، طاسین محمد کہا جاتا ہے۔ نظم میں ان طواسین کی توضیح کی گئی ہے۔ اس طرح وہ کئی ستاروں سے گزرتے ہیں۔ مریخ میں ایک خاتون منیہ دکھائی گئی ہے جسے شیطان نے بچپن میں یورپ سے اغوا کیا تھا۔ وہ مریخ کی خواتین کو ارتقا کے ایک نئے

نظریے کا درس دیتی ہے جس کا مقصد مردوں کی نسل کا خاتمہ کرنا ہے۔ اس خاتون نبیہ کا پیغام یہ ہے کہ دنیا میں آخر کار عورت حکمرانی کرے گی۔ اپنی بہنوں کو اس کا عملی مشورہ یہ ہے کہ اول تو وہ شادی ہی نہ کریں اور اگر شادی کریں اور بچے ہوں تو نر بچوں کو ہلاک کر دیں اور مادہ بچوں کو زندہ رکھیں--- یہاں رومی" کو موقع ملتا ہے کہ وہ جدید تہذیب کے بعض پہلوؤں پر تنقید کریں۔

فلک عطارد پر انہیں سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا، ترکی میں تحریک اصلاح دینی کے سربراہ، کی روحیں نظر آتی ہیں۔ افغانی روس کے عوام کو پیغام بھیجتے ہیں جس میں اسلام کی روح اور بالشوزم کی روح کا موازنہ کیا گیا ہے اور کارل مارکس کو پیغمبر بے جبریل قرار دیا گیا ہے۔

ایک اور ستارے (فلک مشتری) سے گزرتے ہوئے انہیں تین روحوں، منصور حلاج، مرزا غالب اور قرۃ العین (طاہرہ) سے واسطہ پڑتا ہے، جنہیں فردوس میں گھروں کی پیشکش کی گئی مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کیا اور انہوں نے وسعت کائنات میں آزادانہ گھومنے پھرنے کو ترجیح دی۔ حلاج نے ایک مسلم صوفی کی حیثیت سے اپنی پوزیشن واضح کی۔ مرزا غالب سے اس کی شاعری کے حوالے سے کچھ ادبی اور مذہبی نوعیت کے سوالات پوچھے گئے۔ قرۃ العین نے اپنی ایک غزل سنائی--- اس منظر کے برعکس ایک اور سیارے (زہرہ) میں ایک مقام (قلزم خون) پر دو روحیں دکھائی گئی ہیں جو جہنم کے شعلوں میں اپنے گھر کے حصول کے لیے گئیں مگر جہنم نے بھی انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بدروحیں بنگال کے میر جعفر اور میسور کے میر صادق کی ہیں۔

ایک اور سیارے میں شفاف سمندر کی تہہ میں فرعون اور کچنر کی روحیں دکھائی گئی ہیں۔ ان کی گفتگو سن کر جنت الفردوس سے مہدی سوڈانی کی توجہ ادھر مبذول ہوتی ہے اور وہ نیچے اُتر کر سمندر کے اندر داخل ہوئی اور اس نے کچنر سے خطاب کیا۔ پھر مہدی کی روح سمندر کی تہہ سے اوپر آئی اور اس نے آخر میں پوری عرب دنیا سے خطاب کیا اور اسے بیداری کا پیغام دیا۔

تمام سیاروں کی سیاحت کے بعد شاعر جنت الفردوس میں داخل ہوتا ہے اور

یہاں وہ اولیائے کرام اور شاہان عظام سے ملتا ہے۔ پہلے وہ شرف النساء کے قصر بلند کی زیارت کرتا ہے، یہ شہزادی عبدالصمد گورنر لاہور کی دختر نیک اختر تھی (جس کے ساتھی قرآن اور شمشیر تھے)۔ پھر فردوس کے ایک محل میں شاعر کشمیر کے بزرگ دین (سید علی ہمدانی) شاہ ہمدان سے ملاقات کرتے ہیں جو کشمیر کی تاریخ اور لوگوں سے متعلق کچھ سوالات پوچھتے ہیں (اور شاعر ان کے جواب دیتا ہے)۔ اس کے بعد شاعر ایران کے بادشاہ نادر شاہ، افغانستان کے (بانی) احمد شاہ ابدالی اور سلطان ٹیپو (شہید) سے ملاقات کرتا ہے (اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کرتا ہے)۔

جنت الفردوس سے رخصت ہوتے وقت، فردوس کی حوریں شاعر کو گھیر لیتی ہیں اور بہ اصرار تقاضا کرتی ہیں کہ وہ ان کے ساتھ وہاں قیام کرے۔ شاعر وہاں ٹھہرنے سے انکار کرتا ہے۔ مسلم عقیدے کے مطابق فردوس جو بذات خود آخری منزل نہیں، درحقیقت راہ طلب میں انسان کے روحانی ارتقا کی ایک منزل ہے، اسے واضح کیا گیا ہے--- بہرکیف، یہاں مفاہمت کی ایک صورت یوں پیدا ہو جاتی ہے کہ حوریں اس شرط پر اسے رخصت کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں کہ وہ انہیں ایک گیت سنائے۔ شاعر اپنی غزل گاتا ہے اور پھر وہ فردوس سے رخصت ہوتا ہے اور بتدریج اس مقام پر پہنچتا ہے جہاں سوئے افلاک جاتے ہوئے رومیؒ نے اسے چھوڑا تھا، کیونکہ حضور حق میں انسان تنہا ہی داخل ہو سکتا ہے۔ حضور حق میں باریاب ہو کر شاعر بہت ہی اہم سوالات اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے اور اپنی اس حتمی خواہش کا اظہار کرتا ہے کہ اسے اپنے لوگوں کی منزل مقصود کے بارے میں مکمل طور پر القا کیا جائے، جو اسے عطا کر دی جاتی ہے--- اور پھر کتاب (اس سفر روحانی) کا اختتام ضمیر عالم کی نوائے پُرسوز سے ہوتا ہے--- کتاب کے خاتمے پر شاعر اپنے فرزند (جاوید) سے خطاب کرتا ہے جو درحقیقت آنے والی نسلوں سے خطاب ہے!"

گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کا مسئلہ لاینحل رہا، خصوصاً ہندی مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کی مخالفت میں ہندو اور سکھ متحد تھے۔ کسی نتیجے پر پہنچنے کی توقع نہ تھی۔ اقبال ۳ نومبر ۱۹۳۱ء کو عبداللہ چغتائی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"یہ دن بہت مصروف گزرے۔ مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں

دفعہ پرائیویٹ گفتگوئے مصالحت کے لیے ملتوی ہو گئی۔ پرائیویٹ گفتگو بہت ہوئی مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں۔ اب مینارٹی کمیٹی کی میٹنگ جس کا میں ممبر ہوں، شاید ۱۱ نومبر کو ہو۔ اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ مینارٹی کمیٹی کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے۔ یہ کوشش کی گئی جس کا نتیجہ اس وقت تک کچھ نہیں ہوا۔

شاید ۲۰ نومبر تک ہم لوگ یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ روما جانے کا بھی قصد ہے۔ اس کے بعد وقت ہوا تو مصر اور فلسطین بھی۔"

اقلیتی کمیٹی کے مباحث کا نتیجہ حسب توقع صفر نکلا۔ اقبال ۱۹ نومبر کو مسلمانوں کے وفد سے علیحدہ ہوگئے اور ۲۱ نومبر کو غلام رسول مہر کے ساتھ روم کے لیے روانہ ہوگئے۔ ۲۲ نومبر کو روم پہنچے، روما کے آثار قدیمہ کی سیرو سیاحت کی۔ ۲۵ نومبر کو سابق شاہ امان اللہ خاں سے ملاقات کی جو تین گھنٹے رہی۔۲۶ نومبر کو رائل اکیڈمی میں، جس کی دعوت پر اقبال اٹلی پہنچے تھے، لیکچر دیا۔ ۲۷ نومبر کو شاہ امان اللہ خان بازدید کے لیے آئے اور دو گھنٹے تک اقبال کے ساتھ رہے۔ ۲۷ نومبر ہی کو اقبال کی مسولینی سے ملاقات ہوئی۔ ۲۹ نومبر کو اقبال اطالیہ سے مصر کے لیے روانہ ہوئے، اور یکم دسمبر کو سکندریہ پہنچے۔ جمعیتہ شبان المسلمین اور دیگر اکابر استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ شام کے وقت اقبال قاہرہ پہنچے اور ۵ دسمبر تک یہاں مختلف انجمنوں کی دعوتوں میں شریک ہوتے اور مشاہیر مصر سے ملتے رہے۔ ۵ دسمبر کی شام کو قاہرہ سے روانہ ہو کر ۶ دسمبر کی صبح کو فلسطین پہنچے۔ مفتی اعظم امین الحسینی اور دیگر زعما نے ان کا استقبال کیا۔ ۷ دسمبر سے المو تمر العالم الاسلامی کا باقاعدہ اجلاس شروع ہوا جو کئی روز تک جاری رہا۔ اقبال نے ۱۴ دسمبر کو اپنے الوداعی خطاب میں فرمایا:

"افسوس میں موتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقامات مقدسہ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں جو انبیا کی سرزمین ہے۔ میں آپ لوگوں کو اس روح اخوت و مودت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا۔ ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی

کی راہ پر چلائیں۔

اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے۔ ایک الحاد مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں، اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بُری چیز نہیں۔ لیکن اگر اس میں خاص اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط ہو جائے، تو اس میں دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں۔ مَیں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں۔ مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں، لیکن خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے۔ آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے۔ آپ فرماتے ہیں: "انا خطکم من الانبیاء وانتم خطی من الامم" مَیں تو جب کبھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر فخر کریں؟ ہاں! جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تھا، تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں۔

موتمر کی ذمے داریاں بہت بڑی ہیں۔ اس کے سامنے اہم کام ہیں، خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعہ اسلامیہ کا قیام۔ لیکن اگر ہم اسلام و اخوت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے۔ اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روح اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو، اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو۔ ہمارا مستقبل خاص انہی کی مساعی پر موقوف ہے۔ مَیں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب کے نوجوانوں میں، مَیں نے وہ روح دیکھی ہے جو اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی۔ عربی نوجوان بلندی مرتبت کی روح صادق سے معمور ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کریں۔ اللہ ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔"

۱۵ دسمبر کو اقبال بیت المقدس سے روانہ ہو کر پورٹ سعید آئے اور ۱۷ دسمبر کو بحری جہاز پر سوار ہو کر ۲۸ دسمبر کو بمبئی پہنچے اور وہاں سے ٹرین پر روانہ ہو کر ۳۰ دسمبر کو لاہور پہنچ گئے۔

اقبال کی مشہور طویل نظم "ذوق و شوق" انبیا علیہ السلام کی مقدس سرزمین فلسطین، کی اسی سیاحت کے دوران تخلیق ہوئی۔

۱۹۳۲ء

فلسطین کی سیاحت اور سرزمین انبیا علیہم السلام کی زیارت اقبال کی زندگی کا قابل ذکر واقعہ ہے۔ وہاں ان کا عرب نوجوانوں سے براہ راست رابطہ ہوا۔ اپنے اس تاریخی سفر کے تاثرات بیان کرتے ہوئے اقبال سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے کو بتاتے ہیں:

"سفر فلسطین میری زندگی کا نہایت دلچسپ واقعہ ثابت ہوا ہے۔ فلسطین کے زمانہ قیام میں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، فرانس اور جاوا کے نمائندوں سے ملاقات ہوئی۔ شام کے نوجوان عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔"

فروری ۱۹۳۲ء میں اقبال کی شہرہ آفاق تخلیق "جاوید نامہ" شائع ہوئی۔ ۲۱ مارچ کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا سالانہ اجلاس بیرون دہلی دروازہ لاہور میں منعقد ہوا۔ اقبال نے طویل و بسیط صدارتی خطبہ دیا جس میں گول میز کانفرنس کے مباحث پر بھی روشنی ڈالی، رواں سیاسی مسائل کا جائزہ لیا اور مستقبل کے بارے میں اپنے خدشات و تاثرات بیان کیے۔ یہ خطبہ افکار سے آگے عمل کی تجاویز کا حامل تھا جس کی مختصر سی کیفیت درج ذیل ہے:

خطبہ الٰہ آباد کے سوا سال بعد اقبال نے خطبہ لاہور دیا تو اُن کے سیاسی افکار میں اس دوران عملی سیاست کے مشاہدات و تجربات کی بدولت مزید پختگی اور سیاسی تدبر و فراست کا رنگ آ چکا تھا۔ گول میز کانفرنس کے صبر آزما مشاہدات ایک طرف، اور دوسری طرف ہند میں برطانوی استعمار کا دوہرا اور پُرفریب کردار--- خصوصاً پنجاب و

بنگال اور صوبہ سرحد و کشمیر کے حوالے سے ازحد افسوسناک اور اضطراب انگیز تھا۔ برطانیہ کی دو رخی پالیسی اور روایتی بندر بانٹ کی بدولت ہند کی سیاسی کشمکش اب برطانوی استعمار اور باشندگان ہند کے مابین نہیں تھی بلکہ ہند کی اکثریتی قوم (کاسٹ ہندو) اور اقلیتوں کے درمیان تھی جو پارلیمانی جمہوریت کے برطانوی انداز کو من و عن قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ تھیں جو ان پر ایک قوم (ہندو) کے استبداد کو مستقلاً" مسلط کر دیتا۔ تاہم مسئلہ ابھی اس مغربی جمہوریت کو ہند کے حقیقی حالات کے مطابق مناسب طور پر ڈھالنے اور اقلیتوں کو تحفظات دینے تک محدود تھا۔۔۔ اور یہی مسئلہ لاینحل بنا ہوا تھا۔ جبکہ تحریک خلافت کے زوال کے بعد اسلامیان ہند کا افتراق و انتشار کسی تشویشناک صورت اختیار کر چکا تھا۔ اقبال کے سامنے یہ سارا منظر تھا جب وہ خطبہ لاہور میں یہ ارشاد فرما رہے تھے:

"موجودہ منظر نامہ بہرحال، آنے والے طوفان کا صرف پیش خیمہ ہے جو شاید پورے ہند اور بقیہ ایشیا کو بہا کر لے جائے گا۔ یہ اُس سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ہے جو انسان کو محض ایک استحصالی شے سمجھتا ہے، اسے گوشت پوست کی ایک ایسی شخصیت نہیں سمجھتا جس کی تعمیر و ترقی خالص تہذیب و ثقافت کی قوتوں کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ ایشیا کے لوگ لازماً اس استحصالی اقتصادی نظام کے خلاف ہیں جسے مغرب نے ترقی دے کر مشرقی اقوام پر مسلط کیا ہے۔ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کا اس کی بے ہنگم انفرادیت کے ساتھ ایشیا پوری طرح درک نہیں کرسکتا۔ جس دین (اسلام) کی نمائندگی آپ کرتے ہیں، وہ فرد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہے، اور اس کی تربیت اس طرح کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ اللہ اور اس کے بندوں کی فلاح و بہبود کی راہ میں قربان کر دے۔ اس نظام کے ممکنات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ یہ اب بھی ایک نئی دنیا تخلیق کر سکتا ہے جہاں انسان کا معاشرتی رتبہ اس کے رنگ و نسل سے، یا اس منفعت سے جو وہ کماتا ہے، طے نہ کیا جائے بلکہ اس طرز حیات سے متعین کیا جائے جو وہ گزر بسر کرتا ہے۔ جہاں غریب امیر پر ٹیکس لگا سکتا ہے۔ جس انسانی معاشرے کی بنیاد معدوں کی مساوات سے نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہوتی ہے۔ جہاں ایک اچھوت بادشاہ کی دختر سے شادی کر سکتا ہے۔ جہاں ذاتی ملکیت ایک امانت ہے، اور جہاں اس قدر

سرمایہ جمع کرنے کی اجازت نہیں کہ دولت پیدا کرنے والے حقیقی شخص (کاشتکار، محنت کش، مزدور) کو محکوم بنا لیا جائے۔ آپ کے دین کا یہ ارفع نظریہ، بہرصورت، قدامت پسند ملاؤں اور فقیہوں کی موشگافیوں سے نجات کا طالب ہے۔ روحانی طور پر ہم خیالات و جذبات کے ان زندانوں میں رہ رہے ہیں جن کا تانا بانا گذشتہ صدیوں کے دوران ہم نے اپنے اردگرد بُنا ہے اور یہ امر ہم سب پرانی نسل کے لوگوں کے لیے باعث شرم و ندامت ہے کہ ہم نوجوان نسل کو اس اقتصادی، سیاسی، حتیٰ کہ مذہبی بحران کے لیے بھی تیار کرنے میں ناکام رہے ہیں جو عصر حاضر ہمارے سامنے لا رہا ہے۔ پوری قوم کو اس کی موجودہ ذہنیت اور حالت سے مکمل طور پر نجات دلانے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اس قابل ہوسکے کہ نئے نظریات کا سامنا اور نئی آرزوؤں کے لیے جذبہ محسوس کرسکے۔ ہندی مسلمان ایک عرصے سے اپنی داخلی زندگی کی گہرائیوں کی باز آفرینی سے غافل ہوچکا ہے۔ اس کا انجام یہ ہے کہ وہ زندگی بسر کرنے کے بھرپور رنگ و آہنگ سے محروم ہوگیا ہے، اور نتیجتہً یہ خطرہ ہے کہ وہ اُن طاقتوں سے کوئی ناروا سمجھوتہ نہ کر لے جن کے بارے میں اسے باور کرایا جا رہا ہے کہ وہ کھُلے مقابلے میں اُن پر غالب نہیں آ سکتا۔ اندریں حالات، وہ شخص جو ناموافق حالات کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے اسے پہلے مکمل طور پر اپنی داخلی شخصیت کو بدلنا ہوگا۔ ارشاد ربّانی بھی یہی ہے: "خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس نے آپ اپنی حالت کو نہیں بدلا۔"

یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب کسی واضح نصب العین کی روشنی میں مسلسل اپنے معمولات زندگی کو ڈھالیں۔ جب تک کسی کو اپنی آزادی ضمیر پر یقین محکم نہ ہو کچھ بھی حاصل نہیں ہوسکتا۔ صرف یقین ہی لوگوں کی نگاہ کو اپنے مقصد پر قائم رکھ سکتا ہے اور انہیں مسلسل تذبذب سے محفوظ رکھتا ہے۔ ماضی کے تجربے نے جو سبق آپ کو دیا ہے اسے دل سے قبول کیجئے۔ کسی طرف سے کوئی توقع نہ رکھیے۔ اپنے آپ پر مکمل بھروسا کیجئے، اور اپنی خاک کو حقیقی مردانگی میں بدل ڈالیے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کی آرزوئیں حقیقت بن جائیں۔ مسولینی کا مقولہ تھا "جس کے پاس فولاد، اس کی روٹی" میں اس میں تھوڑی سے ترمیم کر کے کہوں گا "وہ جو فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے" فولاد بن جایئے اور سخت محنت کیجئے۔ انفرادی اور اجتماعی

زندگی کا سارا راز اسی میں ہے۔ ہمارا مقصد پوری طرح واضح ہے۔ آنے والے دستور میں اسلام کے لیے وہ مقام حاصل کرنا جس کی برکات سے اس ملک میں مسلمانوں کا مقدّر جاگ اُٹھے۔ یہ ضروری ہے کہ اس مقصد (آئیڈیل) کی روشنی میں قوم کی ترقی پسند قوتوں کو بیدار کیا جائے اور ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار اور منظّم کیا جائے۔ زندگی کا شعلہ کسی دوسرے سے مستعار نہیں لیا جاسکتا، اسے اپنی روح کے معبد میں ہی روشن کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے پُرخلوص تیاری اور علاوہ ازیں مستقل پروگرام کی ضرورت ہے۔ مستقبل کے لیے ہمارا آئیڈیل کیا ہونا چاہیے؟ اس بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ کچھ تو سیاسی ہونا چاہیے اور کچھ ثقافتی، معاشرتی نوعیت کا ہونا چاہیے۔ مَیں آپ کے سامنے سوچ بچار کے لیے چند تجاویز پیش کرنا چاہتا ہوں:

پہلے تو بلاتکلّف اس حقیقت کو تسلیم کرلینا چاہیے کہ موجودہ سیاسی جدوجہد میں پریشانی افکار کا باعث وہ رہنما ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت فرما رہے ہیں۔ ملّت کو اس انتشار و افتراق میں مورد الزام قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ملک میں اپنے مستقبل کی بقا کے لیے مسلم عوام میں جذبۂ ایثار و قربانی کی کوئی کمی نہیں۔ حالیہ تاریخ میری اس بات کی شاہد ہے۔ قصور قیادت کا ہے، عوام کا نہیں۔ ملّت کو جو رہنمائی ملتی ہے وہ اکثر و بیشتر آزادانہ سوچ کا نتیجہ نہیں ہوتی جس کا نتیجہ بعض نازک موقعوں پر ہماری سیاسی جماعتوں میں نااتفاقی اور انتشار کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ان حالات میں یہ جماعتیں ایسا نظم و ضبط پیدا نہیں کرسکتیں جو سیاسی تنظیموں کی بقا اور قوت کے لیے ازبس ضروری ہے۔ اس قباحت کا علاج مُیں یہ تجویز کرتا ہوں کہ:

اول: ہندی مسلمانوں کی صرف ایک سیاسی تنظیم ہونی چاہیے جس کی صوبائی اور ضلعی شاخیں پورے ملک میں موجود ہوں۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں۔ جو بات ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اس کا دستورالعمل ایسا ہونا چاہیے کہ یہ تنظیم ہر سیاسی مدرسۂ فکر کے لیے اقتدار میں آنے اور ملّت کی رہنمائی اپنے افکار اور طریق کے مطابق کرنے کا ذریعہ بن سکے۔ میری رائے میں صرف یہی ایک راہ ایسی ہے جو افتراق و انتشار کو ناممکن بنا سکتی ہے، اور ہماری بکھری ہوئی قوتوں کو ہندوستان میں اسلامی مفادات کے تحفّظ کے لیے دوبارہ یکجا و منظّم کرسکتی ہے۔

دوم : مَیں تجویز کرتا ہوں کہ یہ مرکزی تنظیم فوری طور پر ایک قومی فنڈ کم از کم پچاس لاکھ کا جمع کرے۔ بیشک آج ہم بہت مشکل اوقات میں رہ رہے ہیں مگر آپ یقین جانئے کہ ہند کے مسلمان، اگر ان کو موجودہ صورت حال کی نزاکت کا پورا پورا احساس دلا دیا جائے تو وہ آپ کی پکار پر لبیک کہنے میں پس و پیش نہیں کریں گے۔

سوم : مَیں تجویز کرتا ہوں کہ نوجوانوں کی ایک تنظیم (یوتھ لیگ) قائم کی جائے جس کے رضاکار جملہ ساز و سامان سے لیس ہوں، اور یہ سب ایک مرکزی تنظیم کے کنٹرول اور نگرانی میں کام کریں۔ یہ رضا کار تنظیم لازماً اپنے آپ کو معاشرتی خدمت، رسومات کی اصلاح، قوم کی تجارتی و صنعتی تنظیم اور اقتصادی پیشرفت کے لیے شہروں، قصبوں، گاؤں میں جا کر نشرو اشاعت کا کام کرے۔ خصوصاً پنجاب میں دیہات سدھار اور کسان کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کی بہت ضرورت ہے کیونکہ میرے خیال میں ہند میں اسلام کا مستقبل بہت حد تک پنجاب کے کسانوں کو موجودہ زنجیروں سے آزاد کرانے سے وابستہ ہے۔

چہارم : مَیں تجویز کرتا ہوں کہ ہند کے تمام شہروں میں مردانہ اور زنانہ ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں۔ ان اداروں کا سیاست سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ ان کا اہم مقصد یہ ہونا چاہیے کہ نوجوان نسل کی خُفتہ روحانی قوتوں کو حرکت میں لائیں۔ اُن پر یہ واضح کیا جائے کہ مذہبی اور ثقافتی تاریخ میں اسلام نے اب تک کیا کارنامے انجام دیے ہیں اور ہمیں آئندہ کیا کچھ حاصل کرنا ہے۔ یہ ادارے ہمارے قدیم اور جدید تعلیمی اداروں سے قریبی رابطہ رکھیں تاکہ ہماری تعلیمی کوششوں میں مقصد کی یک جہتی موجود رہے، اور تعلیمی پس ماندگی کا مداوا جلد سے جلد ہو سکے۔

پنجم : مَیں تجویز کرتا ہوں کہ علماء کی ایک اسمبلی وجود میں لائی جائے جس میں وہ مسلم وکلا بھی شامل ہوں جنہوں نے جدید فقہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔"

ہندوستان کی آزادی اور ملکی مفاہمت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت ہندوؤں (اور ان کے آلۂ کار سکھوں) کا یہ غیر معقول رویّہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کو ان کا جائز اور منصفانہ حق کسی صورت میں نہ دیا جائے۔ اقبال کے

نزدیک یہ ایک بنیادی انسانی مسئلہ تھا جس کے بارے میں برادران وطن، بدیسی حکمرانوں اور عالمی رائے عامہ کے ضمیر کو جھنجوڑنا ضروری تھا۔ خصوصاً پنجاب کا مسئلہ اس لیے بھی نازک ہو رہا تھا کہ یہاں ہندو قوم سکھوں کو اپنی ڈھال بنا کر اپنی نامعقول روش میں جذباتی ہیجان اور اشتعال پیدا کر رہی تھی۔ دوسری طرف بعض نام نہاد مسلمان رہنما اور جاگیردار یونینسٹ پارٹی کے پرچم تلے زمیندار اور غیر زمیندار، دیہاتی اور شہری کی تفریق کرکے مسلمانوں میں مزید انتشار پیدا کر رہے تھے اور یہ بات مستقبل قریب میں مسلمانوں کی قومی ہستی کو سخت متاثر کرنے والی تھی۔ اقبال کو اس کا شدید احساس تھا اور وہ اس کھُلی بے انصافی کے خلاف جہاد کو اپنی بقیہ زندگی کا نصب العین قرار دے چکے تھے۔ اقبال کا یہ سیاسی کردار تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اپریل ۱۹۳۲ء میں انہوں نے دو تین احباب کے ساتھ مل کر یہ مشترکہ بیان جاری کیا اور اس تکلیف دہ سیاسی صورت حال کا بے لاگ تجزیہ کیا اور اس صریحاً بے انصافی اور دھاندلی پر سخت احتجاج کیا:

"ہم گذشتہ کئی ہفتوں سے نہایت غور کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت کے اہم اور جائز مطالبہ کے خلاف ایک نہایت ہی زہریلا پروپیگنڈا جاری ہے۔ ہم متعجب ہیں کہ ایک بوسیدہ استدلال کو تازہ ہمّت اور جرأت کے ساتھ بار بار دُہرایا جا رہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ مرکزی مجلس وضع آئین اور دیگر صوبجات میں فرقہ وار اکثریت قائم رہنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ان دو صوبجات میں فرقہ وار اکثریت کا وجود ناقابل برداشت ہے جہاں مسلمانوں کو بہ اعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے۔ اس خلاف عقل و ہوش نقطۂ نظر کے حامیوں نے اس لفظی شعبدہ گری کو بھی ترک کر دیا جو کسی زمانے میں قانونی اور غیر قانونی اکثریت کے فرق و امتیاز کی صورت میں کیا کرتے تھے۔ یہ امتیاز بھی عملاً بے سود اور نتیجتہً بے معنی تھا، اس لیے کہ مرکز کے علاوہ باقی چھ صوبجات میں بھی ہندوؤں کی اکثریت محض غیر قانونی ہونے کے باوجود مؤثر، محفوظ اور مستقل تھی۔

غالباً اس لفظی فریب کاری کے ضعف استدلال سے متاثر ہو کر گول میز کانفرنس کے بعض ہندو اور سکھ مندوبین نے اقلیتوں کے مباحث کے وقت یہ چیز اچھی

طرح واضح کر دی کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے مطالبہ اکثریت کے سلسلے میں ان کا اعتراض اکثریت کی قانونی نوعیت پر نہ تھا بلکہ انہیں نفس اکثریت ہی پر اعتراض تھا، خواہ کسی صورت میں ہی کیوں نہ ہو۔ مسلم مطالبات کی مخالفت کی یہ نوعیت پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے سیاسی اجتماعات کی تقریروں سے اور بھی واضح ہو چکی ہے۔

ہم اس امر کا فیصلہ دنیا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جس حالت میں ہندو اور سکھ مسلمانوں سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ چھ صوبجات اور مرکز میں اپنے آپ کو عظیم ہندو اکثریت کے حوالے کر دیں، وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی شدید مخالفت کر کے ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت کی نیک نیتی کا نقش کس حد تک بٹھا سکیں گے، اور مسلمانوں کے قلوب میں ان کی طرف سے کس حد تک اعتماد پیدا ہو گا؟

بہرحال، ہم یہ پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بحالت موجودہ مسلمانوں کے لیے یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسے دستور کو تسلیم کر لیں جو مرکز اور دیگر صوبجات میں اُنہیں ایک مؤثر اور مستقل ہندو اکثریت کے ماتحت رکھ کر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو ضروری تحفظات سے محروم کر دے۔ مسلم مطالبات کی مخالفت میں سکھوں کی روش نہایت ہی عجیب و غریب ہے۔ وہ پنجاب کی آبادی میں صرف تیرہ فیصد ہیں۔ لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے، یا انہیں اس مطالبے پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ پنجاب کو سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ اکثریت پر چھوڑ دیا جائے۔

ان کی دلچسپ تجویز یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ فی صد کی اقلیت اور ستاون فی صد کی اکثریت کے تفاوت کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور ملک بھر کے فرقہ وار مسائل کی اہمیت سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو پنجاب کونسل میں یکساں نیابت دی جائے۔ یا بالفاظ دیگر ستاون فی صد کی اکثریت کو چالیس فیصد کی اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے اور سکھوں اور ہندوؤں کی انتالیس فیصد کی مشترکہ اقلیت کو پچپن فی صد کی اکثریت کے برابر کر دیا جائے، اور یہ وہ استدلال ہے جسے منطق اور عقل و خرد سے کوئی واسطہ نہیں۔"

متذکرہ بالا بیان کے متعلق "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نمائندے نے علامہ اقبال سے ملاقات کی تو انہوں نے فرمایا: "اس مسئلے پر آل انڈیا نقطہ نظر سے غور کرنا

چاہیے۔ آٹھ صوبوں میں سے دو میں مسلمانوں کی اکثریت کو یقینی بنا دینے سے مسلمانوں کو آل انڈیا اقلیت کی حیثیت میں اپنی مستقل شخصیت کے اظہار کا موقع ملے گا۔"

مس فارقوہرسن کے نام مکتوب محررہ ۲۲ مئی ۱۹۳۲ء میں اقبال ہندوستان کی خطرناک صورت حال کے بارے میں اپنے احساسات بیان کرتے ہیں:

"ذاتی طور پر مَیں ہندوستان کے مستقبل سے نہایت مایوس ہو رہا ہوں۔ بمبئی کے فسادات نے جو ابھی فرو نہیں ہوئے، مجھے بے حد پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت کا آغاز ایک خونریزی کی صورت اختیار کرے گا اور یہ بدامنی ایسے نتائج پیدا کرے گی جو بے حد ناگوار ہوں گے۔ بعض لوگوں کی تو رائے ہے کہ ہندوستان میں لازماً خون خرابے سے گزر کر کسی نہ کسی قسم کی سوویت استوار ہو جائے گی۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ بہترین برطانوی واقف کار کو بھی اس امر کا قطعاً اندازہ نہیں کہ اس بظاہر پُرسکون سمندر کی گہرائیوں میں کیسے کیسے طوفان بیتاب ہیں۔ وہ ہندوستانی جو اعلیٰ مناصب پر فائز ہو کر برطانوی پالیسی کو قریب سے دیکھ سکتے ہیں متلاشیان روزگار سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں کبھی کبھار چالاک و ہوشیار لوگ بھی نظر آ جاتے ہیں لیکن یہ طبقہ یکسر محروم بصیرت ہے۔ ہمیں بہتری کی توقع کرنی چاہیے۔ دنیا بہ امید قائم۔ خدا کرے بہتر حالات پیدا ہوں۔

مَیں یورپ، شمالی افریقہ، ترکی اور ہسپانیہ کا قصد رکھتا ہوں۔ دو ایک ماہ میں قطعی فیصلے پر پہنچ سکوں گا۔"

اقبال نے اس اثنا میں سر فرانسس ینگ ہسبینڈ کی فرمائش پر انگلستان کے فلسفی اور اپنے کیمبرج کے نگران استاد آنجہانی پروفیسر میک ٹیگرٹ پر مقالہ لکھا جو انڈین آرٹس اینڈ لیٹرز کی اشاعت جون ۱۹۳۲ء میں چھپا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں اقبال نے ارسٹوٹولین سوسائٹی لندن کے لیے لیکچر بعنوان Is Religion Possible (کیا مذہب کا امکان ہے؟) تیار کیا جو تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر وہاں پیش کیا گیا اور خطبات کے آکسفورڈ ایڈیشن (۱۹۳۴ء) میں ساتویں خطبے کے طور پر شائع ہوا۔

۶ مارچ ۱۹۳۲ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے اہتمام میں وائی۔ ایم۔ سی۔

اے ہال لاہور میں پہلا یوم اقبال منایا گیا جس کے دو اجلاس زیر صدارت جسٹس آغا حیدر اور ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹناگر منعقد ہوئے۔ اقبال کے فکر و فن پر مقالات پڑھے گئے۔ شام کو ہوٹل سٹیفلز میں استقبالیہ دعوت ہوئی جس میں اقبال بھی شریک ہوئے۔ اسی سال اکتوبر میں ماہنامہ "نیرنگ خیال" لاہور کا خصوصی شمارہ اقبال نمبر شائع ہوا۔

کمیونل ایوارڈ کا اعلان ۱۷ اگست ۱۹۳۲ء کو متوقع تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے قبل از وقت ہی شور و غوغا شروع کر دیا تھا۔ وہ مینارٹیز پیکٹ کے خلاف زبردست غم و غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ سکھوں کی حالت عجیب تھی۔ سکھ قوم کا تعلق صرف پنجاب سے تھا اور اسے ایک معزز اقلیت سمجھا جاتا تھا، مگر سکھوں نے ہندوؤں کے اکسانے پر مینارٹی پیکٹ میں شمولیت اختیار نہ کی۔ ان کے مطالبات انتہائی غیر معقول اور طرز عمل بے حد ناشائستہ تھا۔ اقبال نے ایوارڈ سے قبل ۲۵ جولائی ۱۹۳۲ء کو اور ایوارڈ کے اعلان کے بعد ۲۴ اگست ۱۹۳۲ء کو اپنے تاریخ ساز بیانات میں انتہائی صبر و تحمل اور تدبر و شائستگی کے ساتھ صورت حال کا تجزیہ کیا، اور برادران وطن اور بدیسی حکمرانوں کے سامنے اسلامیان ہند کا مبنی برحق و انصاف موقف پیش کیا۔ ۲۵ جولائی کے بیان میں انہوں نے کہا:

"ان محضر ناموں، منشوروں اور جلسوں کا سیلاب کمیونل ایوارڈ کے اعلان کے موقع پر متوقع تھا۔ علاوہ ازیں سردار اُجل سنگھ نے تو واضح کر دیا ہے کہ سکھوں کو ملک کی دستوری ترقی کے بجائے فرقہ وارانہ مسئلے سے تشویش ہے۔ اس طرح کا طرز عمل، خواہ اپنی قوم کی محبت ہی میں کیوں نہ ہو، دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا جس میں کسی فرقے کے مفادات کے لیے تو بیقراری ہو مگر کُل ہند کے مفاد کو نظرانداز کر دیا جائے۔

مسلمانوں کے لیے یہ غیر ضروری ہے کہ وہ سکھ دوستوں کی اس دریافت کا سنجیدگی سے نوٹس لیں کہ وہ مسلم مطالبات کی مخالفت تاریخی استحقاق کی بنا پر کر رہے ہیں۔ اگرچہ مجھے ازحد افسوس کے ساتھ اس زبان اور لہجے کا ذکر کرنا پڑتا ہے جو انہوں نے پنجاب میں مسلم اکثریت کے حق نمائندگی کی مخالفت میں استعمال کی ہے جس کا مقصد بدقسمتی سے سکھوں کے مذہبی تعصبات کو اُبھارنا ہے۔ مزید بدقسمتی یہ ہے کہ پنجاب میں سکھوں کے اس منفی رویے کے نتائج، جس کی ہلہ شیری ہندوؤں کی طرف

سے ہو رہی ہے، پورے نہیں ہو رہے اور قدرتی طور پر دوسری اقلیتوں میں رد عمل پیدا ہو رہا ہے اُس فرقہ وارانہ اکثریت کے بارے میں جو مرکز اور چھ صوبوں میں ہندوؤں کے اقتدار کی صورت میں آئے گی۔ اقلیتوں میں یہ بڑھتا ہوا اندیشہ لازمی طور سے ہندوستان کے مستقبل کی تاریخ پر ازحد تباہ کُن اثرات مرتب کرے گا۔

ہماری اپنی پوزیشن بہرحال، بالکل واضح ہے۔ مسلمانان ہند جتنے اپنے قومی مفادات کے تحفظ کے لیے فکرمند ہیں، اتنے ہی وہ ملک کی دستوری ترقی کے حصول کے لیے متفکّر ہیں۔ جن دستوری تحفظات کا وہ مطالبہ کرتے ہیں وہ کُل ہند اقلیت کی حفاظت کے لیے لازم ہیں۔ وہ مرکز اور ان صوبوں میں جہاں وہ اقلیت میں ہیں، اکثریت کے اقتدار کا اصول تسلیم کرتے ہیں، بشرطیکہ انہیں مناسب تحفظات دیے جائیں اور جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی مقتدر حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔ انہوں نے بار بار اپنی اس پوزیشن کی وضاحت برادر اقوام اور برطانوی حکومت پر واضح کی ہے، اور ماسوا سکھوں کے تمام ہندی اقلیتوں نے ان کے مطالبات کی معقولیت سے اتفاق کیا ہے۔"

کمیونل ایوارڈ کا اعلان ہوا، تو اس میں مسلمانوں کے جائز مطالبات کے بارے میں انتہائی غیر منصفانہ طریق اختیار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اقبال نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ۲۴ اگست کو یہ بیان جاری کیا:

میری یہ دیانتدارانہ رائے ہے کہ اس غیر منصفانہ فیصلے کے خلاف مسلمانوں سے زیادہ کسی قوم کو جائز شکایت نہیں ہوگی۔ فی الحقیقت، میں یہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ برطانوی ضمیر نے اس بے انصافی کو کیسے برداشت کر لیا ہے۔

یہ شور و غوغا کہ اس فیصلے نے پنجاب کے مسلمانوں کو اکثریتی نمائندگی کا حق دے دیا ہے، قطعاً بے بنیاد ہے۔ اس صوبے میں یہ مسلم اکثریت جیسی کچھ بھی ہے کسی فرقے کے لیے ہرگز وجہ شکایت نہیں ہو سکتی۔ علاوہ ازیں، موجودہ صورت میں یہ اکثریت اس امر پر منحصر کر دی گئی ہے کہ مسلمان کچھ نشستیں مخلوط انتخاب کے ذریعے حاصل کریں۔ برطانوی حکومت کے اس فیصلے پر ہندی مسلمانوں کا نقطہ نظر گذشتہ روز مجلس منتظمہ آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی کی طرف سے آ چکا ہے۔ اسے دُہرانے کی مجھے

ضرورت نہیں۔ مگر اس فیصلے پر محتاط غور و فکر کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے دو سیاسی اصولوں کو بظاہر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی کسی (صوبے کی) اکثریت کو اقلیت میں نہ بدلا جائے اور اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ انہیں مناسب پاسنگ دے کر کیا جائے۔ مگر ان دونوں اصولوں کے اطلاق میں مسلمانوں ہی کو نقصان پہنچایا گیا ہے۔

بنگال میں مسلمانوں کو جو حیثیت دی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے اصول کی دھجیاں اڑائی گئی ہیں۔ مختلف صوبوں میں اقلیتوں کو پاسنگ دینے کے سلسلے میں اعداد و شمار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صوبہ سرحد میں دوسرے اصول پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کے لیے بڑی فراخدلی دکھائی گئی ہے جبکہ دوسرے صوبوں میں مسلمانوں کو مقابلتاً نقصان پہنچایا گیا ہے۔ پنجاب میں سکھ اقلیت کو اس حد تک پاسنگ دے دیا گیا ہے کہ اس صوبے میں مسلم اکثریت سکڑ کر کم ازکم حد تک آ گئی ہے۔ بنگال کے مسلمانوں کو جنہیں ۵۱ فیصد نمائندگی کی بجائے ۴۸٫۴ فیصد نمائندگی دی گئی ہے انہیں معمولی سی اکثریت کے لیے صرف دو فیصد کی مزید ضرورت تھی۔ مگر ہز میجسٹی کی حکومت نے یہ مناسب سمجھا کہ مینارٹی پیکٹ کا سہارا لے کر مسلمانوں کو نظرانداز کرکے یورپینوں کو نوازا جائے کیونکہ خونی رشتہ گاڑھا ہوتا ہے یا مسلمانوں سے بے انصافی کرکے یورپینوں کی امداد اور ہندوؤں کی خوشنودی کا دوہرا فائدہ مقصود تھا۔

بہرحال اب مسلمانوں کے سامنے اہم سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں کیا ہونا چاہیے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کے لیے ایک آئینی راستہ کھلا ہے۔ بنگال ان صوبوں میں سے ایک ہے جنہوں نے دو ایوانوں کا تقاضا کیا ہے۔ ایوان بالا کا دستور ابھی طے ہونا ہے۔ ان دو ایوانوں کا آپس میں کیا تعلق ہوگا؟ اور کیا حکومت دونوں ایوانوں کے اشتراک کے سامنے جواب دہ ہوگی یا صرف ایوان زیریں کے سامنے؟ یہ ابھی طے ہونا ہے۔ اگر ایوان بالا میں مسلمانوں کی نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہو، اور حکومت دونوں ایوانوں کے اشتراک کے سامنے جوابدہ ہو، تب تو مسلمانوں کو اس صوبے میں اکثریت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ ایوان زیریں میں خصوصی مفادات پر بھرپور توجہ دی گئی ہے، متذکرہ بالا طریق سے بنگال کے

مسلمانوں کی صرف اشک شوئی ہو سکتی ہے۔

مجھے یہاں یہ ضرور کہنا چاہیے کہ مختلف فرقوں کے لیے نشستوں کی تخصیص بذات خود کوئی بڑی نتیجہ خیز بات نہیں۔ جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ ہند کے صوبوں کو کس قدر اختیارات منتقل ہوں گے۔ اگر صوبوں کو حقیقی اختیارات ملتے ہیں تو بیشک ہند کی اقلیتوں، مسلم اور غیر مسلم، سب کو یہ موقع میسر آئے گا کہ ملک میں اپنی سیاسی حیثیت کو بہتر بنا سکیں اور آنے والے دستور کے سلسلے میں مسلمان اپنے اکثریتی صوبوں میں اپنے ماضی کی تاریخ اور روایات کے حوالے سے اپنے آپ کو ہر قسم کی ذہنی تنگی اور کم ظرفی سے بالا اور آزاد ثابت کریں گے۔ ان کا اولین فریضہ میرے نزدیک یہ ہو گا--- ناخواندگی اور اقتصادی محکومی کے خلاف جہاد!"

اقبال کے ذہنی و فکری ارتقا کے سلسلے میں ہم نے دیکھا کہ بیسویں صدی کے شروع میں وہ ایک شاعر کے ساتھ ساتھ سیاسی مفکّر و مدبر کے طور پر ایک مقصد اور پیغام لے کر گامزن سفر ہوئے تھے۔ مگر چند سال قبل (۱۹۲۶ء میں) انہوں نے عملی سیاست میں بھی آنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط، اس سے قطع نظر وہ خلوص نیت سے سیاست کے عملی میدان میں قومی خدمت کی خاطر آئے تھے۔ مگر سال رواں کے اندر کچھ حالات نے ایسی کروٹ لی اور کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اقبال کو اپنے پہلے فیصلے سے رجوع کرنا پڑا۔ غالباً فوری فیصلہ انہیں کمیونل ایوارڈ کے اعلان کے کچھ دنوں بعد کرنا پڑا، جب میاں سر فضل حسین کے ایما و سرپرستی میں ایک نیا شوشہ "پنجاب ایگریمنٹ" کے عنوان سے چھوڑا گیا اور میاں صاحب مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کو دھتورا پلا کر اور پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کا پرچم لے کر آگے آنے لگے۔ یہیں آ کر فضل حسین کی سیاست کا بھرم اقبال پر کھلا اور مسلمانوں کی متفرق سیاسی جماعتوں اور ان کے لیڈروں کی محاذ آرائیوں نے بھی انہیں دل برداشتہ کر دیا۔

[☆ اس ایجاز کی تفصیل کے لیے راقم کی تالیفات "میاں سر فضل حسین کا کردار، تاریخ کے آئینے میں" اور "جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار" شائع کردہ ریسرچ سوسائٹی پاکستان ملاحظہ کی جا سکتی ہیں]

اس موقع پر اقبال کا ایک مکتوب مولانا راغب احسن کے نام محررہ لاہور ۴

اکتوبر ۱۹۳۲ء ملاحظہ کیجئے:

"ڈیر راغب احسن، السلام علیکم! آپ کا خط مجھے ابھی ملا ہے۔ مَیں آج رات الور وفد کے سلسلے میں شملہ جا رہا ہوں۔ داؤدی صاحب سے وہیں ملاقات ہوگی۔ آپ کا خط بھی ساتھ لیے جاتا ہوں۔ غالباً ۷ کی صبح لاہور واپس آ جاؤں گا۔ آپ کا اور عثمان صاحب کا معاملہ روح نبویؐ کے تصرّف کا نتیجہ ہے۔ یہ تصرف ابھی اور عام ہوگا، انشاء اللہ۔

دلوں میں کچھ حرارت سی مجھے معلوم ہوتی ہے
کوئی پھر لے کے شاید وعدۂ دیدارِ عام آیا!

مجھے یقین ہے کہ آئندہ نسل بہت جلد اپنے فرائض کو سمجھ جائے گی۔ اگرچہ ہم لوگوں نے اس نئی پود کو اپنے فرائض سمجھنے کے لیے تیار نہیں کیا۔

جو مقالہ مَیں نے لکھا ہے وہ سوسائٹی کی روئداد کی کتاب میں شائع ہوگا۔ مَیں ان سے کہوں گا کہ اس کے چند Off Prints مہیا کر دیں۔ یوسف علی صاحب کے مقالے کا مجھے علم نہیں۔ مَیں اس یقین میں آپ کا ہم نوا ہوں کہ اس وقت بنی نوع انسان کی سب سے بڑی خدمت ہی احیائے اسلام ہے۔ اس لیے کہ اسلام کی نعمت سے خود مسلمان محروم ہیں۔ جمہوریت اور سوشلزم کی کوئی نہ کوئی شکل اختیار کرنا ہندو ازم کے لیے موت ہے۔ اسلام کے لیے یہی چیز اس کی حیات ثانیہ کا سامان ہے۔ جدید دنیا کے حالات اور مقتضیات خود بخود اسلام کی حقیقی اساس کو نمایاں کرتے جائیں گے۔ اسلام کی یہ خدمت خود فطرت کا کارنامہ ہوگی نہ مسلمانوں کا۔

سیاسیات سے علیحدگی تیسری گول میز کانفرنس کے بعد ہی ہوگی اس سے پہلے نہیں۔ اگر اس دفعہ گیا تو شاید بعض ممالک اسلامیہ کو بھی دیکھوں۔ یہ بات بعض حالات پر منحصر ہے۔ خدمت اسلام کی ایک تجویز اس وقت ذہن میں ہے۔ اس میں اور بھی دو چار حضرات شریک ہیں۔ اگر کچھ صورت اس کی نکل آئی تو آپ کو لکھوں گا۔ سب سے بڑی دقت فنڈ کی ہے۔ اگر یہ مرحلہ طے ہوگیا تو امید کامل ہے کوئی اچھی صورت نکل سکے۔ حضرت زین العابدین فرماتے ہیں کہ جب خدا تعالیٰ کسی قوم سے ناراض ہوتا ہے تو اس قوم کا مال بخیلوں کے سپرد کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ کیا عرض کروں،

والسلام۔"

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو اقبال تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے انگلستان روانہ ہوگئے اور ۳۰ دسمبر تک وہ لندن میں رہے۔ اس دفعہ ارسٹو ٹولین سوسائٹی میں انہوں نے اپنا لیکچر Is Religion Possible پیش کیا۔ مسٹر محمد علی جناح سے بھی ان کی تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں اور انہوں نے ہندوستان میں مسلم جماعتوں اور ان کے قائدین کی ابتر حالت، اور نئے دستور کی متوقع آمد کے حوالے سے اسلامیان ہند کو درپیش خطرات سے مسٹر جناح کو آگاہ کرتے ہوئے ان سے وطن واپس آ کر قیادت کا بارگراں سنبھالنے کی اپیل کی۔ یہ قیاسی بات ہی نہیں بلکہ حقیقی امر ہے۔ "میر کارواں" کا استعارہ جو "بال جبریل" (اشاعت ۱۹۳۵ء) کی ایک غزل کے اس شعر میں ملتا ہے:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

یہ شعر انہی ملاقاتوں کے بعد مسٹر جناح کی شخصیت سے متاثر ہو کر اقبال نے کہا ہے، اور اس کا ٹھوس ثبوت اقبال کے ایک مکتوب سے بھی ملتا ہے جو انہوں نے بھوپال کے قیام کے دوران ۱۲ فروری ۱۹۳۵ء کو مولانا محمد شفیع داؤدی کو لکھا جس میں مولانا راغب احسن اور سید راس مسعود کا ذکر بھی ہے۔ متعلقہ عبارت یہ ہے:

"مسٹر جناح نے اپنی قابلیت کا خوب مظاہرہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ عام مسلمانوں کی پالیسی کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھائیں گے۔ میری ان سے مفصّل گفتگو ہو چکی ہے اور انتخاب جداگانہ و مشترکہ پر بھی گفتگو ہو چکی ہے۔"

[یاد رہے کہ مسٹر جناح نے جنوری ۱۹۳۴ء میں ہند پہنچ کر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے کا عندیہ ظاہر کر دیا تھا اور پھر اپنا کاروبار سمیٹنے لندن چلے گئے تھے۔ اس دوران حلقہ بمبئی کے مسلمانوں نے انہیں مرکزی اسمبلی کے لیے بلامقابلہ منتخب کیا۔ ۷ فروری ۱۹۳۵ء کو مرکزی مجلس قانون ساز میں ہند کی دستوری اصلاحات پر انہوں نے معرکہ خیز تقریر کی تھی۔ اس مکتوب میں اسی تقریر کا حوالہ ہے]

۱۹۳۳

اقبال ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو لندن سے روانہ ہوئے اور اگلے دن پیرس پہنچے۔ پیرس میں قیام کے دوران وہ نامور فرانسیسی فلسفی ہنری برگساں سے ملے۔ اس ملاقات کے بعد اقبال ہسپانیہ کے لیے روانہ ہوگئے جہاں وہ تین ہفتے رہے اور ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو واپس پیرس پہنچے۔ وینس سے وہ ۱۰ فروری کو بحری جہاز "کانٹے وردی" میں سوار ہوئے اور ۲۲ فروری کو بمبئی پہنچے جہاں سے وہ بذریعہ فرنٹیر میل روانہ ہو کر ۲۵ فروری کو لاہور پہنچے۔

یکم مارچ ۱۹۳۳ء کو اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا:

"مَیں نے اپنی زندگی کے گذشتہ ۳۵ سال اسلام اور موجودہ تہذیب و تمدّن کی تطبیق کی تدابیر کے غور و فکر میں بسر کر دیئے ہیں اور اس عرصے میں یہی میری زندگی کا مقصد وحید رہا ہے۔ میرے حال کے سفر نے مجھے کسی حد تک اس نتیجہ پر پہنچا دیا ہے کہ ایسے مسئلے کو اس شکل میں پیش نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس کا مطلب بجز اس کے کچھ نہیں کہ اسلام موجودہ تمدن کے مقابلے میں ایک کمزور طاقت ہے۔ میری رائے میں اس کو یوں پیش کرنا چاہیے کہ موجودہ تمدن کو کس طرح اسلام کے قریب تر لایا جائے۔"

لارڈ لوتھیان کے نام ۱۷ مارچ ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال نے اپنی اس یادگار سیاحت کی کچھ تفصیلات بیان کی ہیں:

☆ "آپ کے نوازش نامے کا بہت بہت شکریہ جو کل دہلی سے واپسی پر مجھے موصول ہوا۔ مَیں لندن سے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۲ء کو روانہ ہوا، اور پیرس میں کچھ دن رُکنے کے بعد ہسپانیہ چلا گیا جہاں مَیں نے تقریباً تین ہفتے گزارے۔ فروری کے آخر میں ہندوستان پہنچا۔ آپ کا مکتوب مجھے اسی وجہ سے اتنی تاخیر سے ملا۔ مجھے یہ سُن کر مسرت ہوئی کہ آپ نے میری کتاب خطبات کو پسند کیا ہے۔ آپ نے آکسفورڈ کے مسٹر تھامس ایڈورڈ کو مکتوب لکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس ضمن میں مجھے لکھا ہے اور مَیں نے انہیں کتاب کے دو نسخے روانہ کر دیے ہیں۔ اگر آکسفورڈ یونیورسٹی ان خطبات کی طباعت و اشاعت کا فیصلہ کرتی ہے تو مَیں خطبات میں کہیں کہیں تھوڑا بہت

ردوبدل کروں گا اور اپنے اس خطبے بعنوان "کیا مذہب کا امکان ہے؟" کا اضافہ بھی کروں گا جو مَیں نے لندن کی اسطاطالین سوسائٹی کے سامنے دیا تھا۔

ہسپانیہ اور فرانس میں میرا وقت بہت دلچسپی سے گزرا۔ پیرس میں قیام کے دوران میری برگساں سے ملاقات ہوئی۔ جدید فلسفے اور تمدن پر ہماری گفتگو تقریباً دو گھنٹے تک جاری رہی۔ کچھ وقت ہم نے برکلے پر تبادلۂ خیال کیا جس کے فلسفے پر بعض فرانسیسی فلسفیوں نے بعض نہایت دلچسپ مشاہدات پیش کیے ہیں۔ ہسپانیہ میں قیام کے دوران عربی کے بہت سے پروفیسروں سے میرا رابطہ قائم ہوا، جو اسلام کے کلچر کے بارے میں بہت پُرجوش نظر آتے تھے۔ میڈرڈ یونیورسٹی نے (سپین اور عالم اسلام کا ذہنی ارتقا) 'Spain And the Intellectual world of Islam' کے موضوع پر مجھ سے یونیورسٹی میں خطاب کرنے کی درخواست کی۔ میرے خطاب کو بیحد سراہا گیا۔ صدارت پروفیسر آسن نے کی جو 'Divine Comedy and Islam' کے معروف مصنف ہیں۔ اسپین کی نئی حکومت غرناطہ کو دنیائے اسلام کے لیے ایک طرح کا تہذیبی و ثقافتی مکّہ بنانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میرے خیال میں مناسب ترین وقت یہی ہے کہ انگلستان کو اسلام کے تہذیبی و ثقافتی پہلو میں سنجیدگی کے ساتھ دلچسپی لینی چاہیے۔ درحقیقت ایک اقتصادی نظام کی حیثیت سے اسلام کہیں زیادہ جاذب توجہ ہے اور ہماری موجودہ مشکلات کے کہیں زیادہ عملی حل تجویز کرتا ہے۔

قرطاس ابیض آج ہی آ رہا ہے۔ ہندی مسلمان مرکز میں اپنی حیثیت کے بارے میں ازحد فکر مند ہیں۔"

انہی ایّام میں ایک اور مکتوب بنام سر ولیم روتھن سٹین، میں اقبال نے برگساں سے اپنی ملاقات کی کچھ اور تفصیلات بھی لکھی ہیں:

"جب مَیں پیرس پہنچا تو برگساں سے ملا۔ ہم نے فلسفیانہ موضوعات پر بہت دلچسپ بات چیت کی۔ برکلے کے فلسفے کا جوہر یہ ہے کہ ادراک میں مادہ اپنا سب کچھ ظاہر کر دیتا ہے بغیر کسی اخفا اور تحفظ کے جبکہ ذہن کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ برکلے کے فلسفے کو پیش کرنے کا یہ اسلوب ہے۔ ہماری گفتگو دو گھنٹے تک جاری رہی۔ برگساں بوڑھا ہے اور سخت بیمار۔ وہ لوگوں سے نہیں ملتا مگر میرے معاملے میں استثنیٰ برتنے میں

بہت مہربان تھا۔ بدقسمتی سے جو معاون اس کے ساتھ تھا، اور جس نے ہماری گفتگو کو قلم بند کیا، بعد میں وہ اپنی ہی تحریر کو پڑھ نہ سکا۔"

۲۶ فروری ۱۹۳۳ء کو اقبال نے مسلم نیوز سروس کے نامہ نگار کو یہ بیان دیا جس میں یورپ کی عصری صورت حالات کے حوالے سے اپنے مشاہدات، خصوصاً سپین میں اپنی سیاحت کے اہم تاثرات بیان کیے: "مختلف یورپین ملکوں کی سیاحت کے دوران ماڈرن ورلڈ کے عام اخلاقی انحطاط کو دیکھنے سے مجھے یقین ہوگیا ہے کہ اسلام کے لیے بطور ایک دین قیم بڑے مواقع پیدا ہوگئے ہیں۔ یورپ کے کروڑوں مرد اور عورتیں یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے ہیں کہ اسلام اور اس کے تہذیبی و ثقافتی نظریے کیا ہیں؟ مسلمانوں کی نوجوان نسل جتنی جلد اس حقیقت کا ادراک کرلے، بہتر ہے۔ یورپین مسلمان اس حقیقت کا ادراک پہلے ہی کرچکے ہیں۔ وہ آئندہ اگست میں جنیوا میں ایک کانفرنس منعقد کر رہے ہیں۔ اس مجوزہ کانفرنس کا مقصد خالصتاً معاشرتی، تہذیبی اور ثقافتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے مسلمان اس کانفرنس کے داعیوں کی ان مبارک کاوشوں پر فراخدلی سے لبیک کہیں گے۔

مَیں نے قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، طلیطلہ اور میڈرڈ کی سیاحت بھی کی اور قرطبہ کی تاریخی مسجد، غرناطہ میں الحمرا کے محلات دیکھے۔ علاوہ ازیں مَیں نے مدینۃ الزہرہ کے شہرہ آفاق محل کے کھنڈرات بھی دیکھے۔ یہ محل کوہسار پر عبدالرحمٰن اوّل نے اپنی بیوی زہرہ کے لیے بنوایا تھا۔ ان کھنڈرات کی کھدائی کا کام جاری ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بارہویں صدی عیسوی میں ایک مسلمان ایجاد کنندہ نے ہوائی مشین کی پرولز کا اولین مظاہرہ کیا تھا۔

دوسرے اکابر کے علاوہ مجھے حکومت سپین کے وزیر تعلیم سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا، جو بیحد مہذب، شریف الطبع اور وسیع النظر انسان تھے جس کی توقع سپین جیسے ملک میں کم ہی کی جاسکتی ہے۔ اسی کردار کے مالک پروفیسر آسن "ڈیوائن کامیڈی اور اسلام" کے معروف مصنف ہیں۔ وزیر تعلیم کی ہدایات کے تحت غرناطہ یونیورسٹی میں شعبہ عربی کی بہت توسیع ہو رہی ہے۔ اس شعبے کا صدر پروفیسر آسن کا شاگرد ہے۔

سپین کے جنوب کی آباد قوم مورش نسل ہونے پر اور اسلامی تہذیب کے ان

عظیم آثار پر، جو ان کے ملک میں موجود ہیں، بہت فخر کرتی ہے۔ وہاں بھی ایک نئی ذہنیت پیدا ہو رہی ہے جس میں تعلیمی ترقی کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جائے گا۔ لوتھر نے جو مذہبی اصلاح کی تھی وہ نامعلوم طریقوں سے ترقی کر رہی ہے اور پادریوں کا اثر تمام یورپ میں عموماً اور سپین میں خصوصاً کم ہو رہا ہے۔"

اسپین کی سیاحت و تاثرات کے سلسلے میں اقبال کے دو مکتوبات اور یہاں قابل ذکر ہیں۔ ایک اپنے فرزند جاوید اقبال کے نام اور دوسرا شیخ محمد اکرام کے نام :

مکتوب بنام جاوید اقبال :

"مَیں خدا کا شکرگزار ہوں کہ مَیں اس مسجد (قرطبہ) کے دیکھنے کے لیے زندہ رہا۔ یہ مسجد تمام دنیا کی مساجد سے بہتر ہے۔ خدا کرے تم جوان ہو کر اس عمارت کے انوار سے اپنی آنکھیں روشن کرو۔"

مکتوب بنام شیخ محمد اکرام (۲۷ مارچ ۱۹۳۳ء)

"مَیں اپنی سیاحت اندلس سے بے حد لذت گیر ہوا۔ وہاں دوسری نظموں کے علاوہ ایک نظم مسجد قرطبہ پر لکھی جو کسی وقت شائع ہو گی۔ الحمراء کا تو مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہ ہوا لیکن مسجد کی زیارت نے مجھے جذبات کی ایسی رفعت پر پہنچا دیا جو مجھے پہلے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔"

مارچ کے تیسرے ہفتے میں اقبال نے جامعہ ملیہ دہلی میں غازی رؤف پاشا کے دو لیکچروں میں صدارت کے فرائض انجام دیے، اور صدارتی تقریر کے دوران اپنے نئے تخلیقی شہکار "مسجد قرطبہ" کا آخری بند بھی سنایا۔

لارڈ لوتھیان کے توسط سے آکسفورڈ یونیورسٹی میں اقبال کو رھوڈز لیکچرز (Rhodes Lectures) کے سلسلے میں دعوت دی گئی، جسے اقبال نے قبول کر لیا۔ خطبات کا موضوع "زمان و مکان فلسفہ اسلام کی تاریخ میں" قرار پایا۔ اپریل ۱۹۳۴ء میں لیکچر دینے کے لیے کہا گیا لیکن اقبال نے مہلت مانگی اور بالآخر ۱۹۳۵ء میں وہاں جانے پر رضامندی کا اظہار کیا۔ ان خطبات کی تیاری کے سلسلے میں سال رواں (۱۹۳۳ء) میں سید سلیمان ندوی سے اکثر خطوط میں مسئلہ زمان و مکان کے بارے میں مسائل اور بعض مطبوعہ اور قلمی کتب پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ نیز سید محفوظ علی بدایونی اور سید مہر

علی شاہ کو بھی خطوط لکھے گئے۔ آکسفورڈ میں شیخ محمد اکرام کو اس بارے میں مکتوب محررہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۳ء میں لکھا:

"مَیں نے لارڈ لوتھیان کی دعوت قبول کر لی ہے۔ جس موضوع پر مَیں خطبات لکھنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے "Space and Time in Muslim Thought" یہ بہت دقیق موضوع ہے اور اس کے لیے بہت سے مخطوطات پر تحقیق کرنی ہوگی جو ابھی تک نہ معلوم ہیں یا ان میں سے کچھ۔ نہ ہی کسی نے اب تک اس بارے میں لکھا ہے۔ اس لیے مَیں تذبذب مَیں ہوں کہ مَیں تین چار ماہ کے عرصے میں، جو مجھے دیے گئے ہیں، یہ خطبات لکھ بھی سکوں گا؟ لہٰذا مَیں نے لارڈ لوتھیان کو لکھ کر پوچھا ہے کیا رہوڈز ٹرسٹیز مجھے اجازت دیں گے کہ مَیں یہ لیکچر ۱۹۳۴ء کے موسم گرما میں دوں؟

ازراہ کرم مجھے فروری یا جنوری ۱۹۳۴ء کے اخیر میں لکھیے۔ اُس وقت تک مَیں آپ کو زیادہ صحیح معلومات دے سکوں گا۔ میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ موجودہ لیکچروں کے علاوہ آکسفورڈ میں کوئی پبلک لیکچر دے سکوں۔ لیکن اسلامی موضوعات پر غیر رسمی گفتگو کرنا میرے لیے باعث مسرت ہوگا۔"

تیسری گول میز کانفرنس سے واپس آ کر اقبال سیاسی اجتماعات اور جلسوں میں شرکت سے گریز کرنے لگے تھے۔ عبدالماجد دریا بادی کو ایک مکتوب مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھے بہت دردمند کر دیا ہے۔ اس لیے جلسوں میں میرے واسطے کوئی کشش باقی نہیں رہی۔ مَیں کہیں نہیں جا رہا، نہ پٹنہ نہ کانپور۔"

اس ذہنی کیفیت اور احساس دردمندی کے سلسلے میں کچھ تفصیلات مولانا راغب احسن کے نام اقبال کے خطوط میں ملتی ہیں۔ مکتوب مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۳۳ء میں لکھتے ہیں:

"ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم! آپ کا خط مل گیا ہے۔ "سٹار" ☆ کی حالت پہلے سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے علم نہ تھا کہ آپ وہاں چلے گئے۔ جہاں بھی ہو خلوص و محبت کو ہاتھ سے نہ دو، اور اپنی تمام قوتوں کو اسلام کی خدمت و حفاظت

کے لیے وقف کر دو۔ اس وقت یہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ کیونکہ اکابر امت یعنی علماء و صوفیا کا پیشہ اب وہ نہیں جو اُن کے اسلاف کا تھا۔ نئے تعلیم یافتہ گروہ کے نزدیک منافقت سب سے بڑا اصول زندگی کا ہے اور وہ اپنے تمام معاملات میں اسی پر عمل پیرا ہیں۔ لیکن یہ سب لوگ ذلیل ہوں گے اور حق آخرکار غالب آئے گا۔ اگر میری زندگی میں نہیں تو آپ کی زندگی میں غالب آئے گا۔ مَیں ایک تجویز پر مدت سے غور کر رہا ہوں، ممکن ہے اب وہ تجویز کوئی عملی صورت اختیار کرلے۔ اگر ایسا ہوا تو آپ کو بھی اطلاع ہو جائے گی۔

میمورنڈم تیار کرکے بھیج دیا گیا ہے۔ میرے انگلستان نہ جاسکنے کے متعلق آپ کا خیال صحیح نہیں۔ یہ بات زبانی کہوں گا۔ خط میں لکھنے کی نہیں۔ ممکن ہے جولائی کے آخر میں یورپ کا سفر کروں۔ کیا عجب کہ آپ بھی ساتھ ہوں۔ اگر امسال نہ گیا تو آئندہ سال، انشاء اللہ العزیز۔ زیادہ کیا لکھوں سوائے اس کے کہ :

مرے کدہ کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ میکدے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے"

[☆"سٹار آف انڈیا" یہ انگریزی اخبار کلکتہ سے شائع ہوتا تھا۔]

۳ جولائی ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :

"ڈیر راغب احسن صاحب، اسلام علیکم! مجھے آپ کے خیالات سے پورا اتفاق اور دلی ہمدردی ہے۔ مولوی سلیمان ندوی کا مضمون مَیں نے نہیں دیکھا۔ اس پر آپ کو اپنے اخبار میں تفصیلی تنقید کرنی چاہیے۔ میرا ایک مدت سے عقیدہ ہے کہ علماء اور صوفیا قرآن کے اصل مقاصد سے بے خبر ہیں۔ نئی نسل سے چند آدمیوں نے باوجود فرنگی تعلیم کے اس حقیقت کو محض اپنی سلیم فطرتی کی وجہ سے پالیا ہے، الحمدللہ --- میرے خیال میں آپ کو ایک سفر یورپ کا کرنے کے بعد مصر میں کچھ مدت کے لیے مقیم ہو جانا چاہیے۔ یورپ میں تعلیم پانے کے لیے ٹھہرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بغیر اس قیام کے اپنا علم بڑھا سکتے ہیں اور اصل بات علم نہیں بلکہ بصیرت ہے جو عطائے ربانی ہے۔ اس سے خدا تعالیٰ نے آپ کو حصہ وافر دیا ہے، اور ابھی یہ بصیرت عمر کے ساتھ اور بڑھے گی۔ والسلام"

مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں :

"ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم! مَیں دو چار روز سے علیل ہوں اور مضمحل۔ وجہ شکایت درد دنداں۔ علاج دنداں اخراج دنداں، مگر اخراج سے گھبراتا ہوں۔ اگرچہ اس کا تجربہ بھی پہلے کرچکا ہوں۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک ایک حرف درست ہے۔ مجھ کو ایک مدت سے اس کا احساس ہے اور اب تو گذشتہ پانچ چار سال کے تجربے نے مجھ کو اپنے تمام لیڈروں سے مایوس کر دیا ہے۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں اس وقت زمام کار ہے اُن سے کچھ نہ ہوسکے گا۔ اُن کے تخیلات مریض اور تاریک ہیں۔ مَیں نے بہت سوچا ہے اور اکثر احباب نے مشورہ دیا ہے کہ آپ سلسلۂ بیعت شروع کرکے کم از کم پنجاب کے عامتہ الناس کو اپنے تخیلات کی روشنی میں تربیت کیجئے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مَیں سلسلہ امارت سے جس کی بنا بیعت پر ہو، گھبراتا ہوں اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کہیں ہماری پوری جماعت بھی ایک فرقہ بن کر نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ اس لیڈر گردی میں جماعت کا تیار کرنا بھی مشکل ہے اور دیگر حضرات اس کی راہ میں مخل ہوں گے۔ غرضیکہ فی الحال کوئی راہ اس تاریکی میں نظر نہیں آتی اور طبیعت پست اور مضمحل ہو رہی ہے۔ خدائے تعالیٰ فضل کرے اور کوئی مناسب فضا پیدا کرے، اور کچھ نہیں تو میری پریشانی ہی رفع کر دے!"

مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں :

"ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم! آپ کا خط مل گیا ہے۔ مَیں خدا کا شکر کرتا ہوں کہ کانفرنس ☆ کی صدارت سے مجھے سبکدوشی ہوئی۔ اس کے اندرونی حالات افسوسناک ہیں اور اگر مجھے ان کا پہلے علم ہوتا تو مَیں اس کی صدارت قبول نہ کرتا۔ بہرحال خدا کا شکر ہے کہ یہ زمانۂ صدارت ختم ہوا۔ جمعیت العلماء کا حال بھی ایسا ہی ہے۔ انہوں نے مجھ سے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے کہا مگر مَیں نے انکار کر دیا۔ اصرار پر بھی انکار ہی رہا۔ علماء کے اختلاف کی وجہ سے محکمہ قضا اور علماء کی اسمبلی کا خیال، مجھے اندیشہ ہے کہ محض خیال ہی رہے گا۔ ایک وقت تھا (شردا ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے زمانے میں) کہ گورنمنٹ ہند خود اس تجویز کے لیے تیار تھی۔ مَیں نے مولوی

کفایت اللہ صاحب کو لکھا بھی، مگر انہوں نے توجہ نہ فرمائی۔ جو کچھ میرے خیال میں ہے وہ تو فی الحال صرف اسی قدر ہے کہ مسلمانوں کے پرسنل لاء کے لیے علماء کی ایک اسمبلی بنائی جائے۔جس کا فرض یہ ہو کہ کوئی قانون جس کا تعلق مسلمانوں کے پرسنل لاء سے ہو "مرکزی اسمبلی" میں وضع نہ کیا جائے جب تک علماء کی اسمبلی اس پر غور نہ کر لے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ بعض امور شرعیہ ایسے ہیں کہ ان کا فیصلہ صرف مسلمان قاضی ہی کر سکتا ہے۔ اس واسطے مسلمان سب جج خاص اس مطلب کے لیے مقرر کیے جائیں اور ہائی کورٹوں میں سابق کی طرح صدر الصدور ہوا کریں۔ میرے خیال میں موجودہ حالات میں صرف اسی قدر ممکن ہے، اگر مسلمان جدوجہد کریں۔ جو کچھ آپ کے خیال میں ہے اس کا پورا ہونا بہت سے نئے حالات و اسباب پر منحصر ہے جن میں سب سے بڑا ضروری امر یہ ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست پیدا کی جائے یا "پاکستان" ☆☆ کی سکیم بروئے کار آئے۔ ان سکیموں کے ہوتے ہوئے بھی کامل شرعی آزادی حاصل کرنے کے لیے مزید جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ بہت حد تک ان تمام باتوں کا دارومدار علماء کے اتحاد پر ہے، مگر ان کا اختلاف عامہ مسلمین سے بھی زیادہ ہے اور ان کا وجود اس وقت (خاص کر ان کا جو پالیٹیشن ہوگئے ہیں) منصب پرست مسلمانوں سے بھی زیادہ مضر ہے۔ بہرحال مَیں نے شفیع داؤدی صاحب اور سید ذاکر علی صاحب کو لکھا ہے کہ وہ علماء کی ایک عالمگیر کانفرنس کے لیے کوشش کریں۔ ابھی وقت ہے۔ اس کانفرنس کا کام ہوگا کہ اوروں کے مشورہ سے ایک خاص سکیم تیار کرے۔ ابھی تک خاص سکیم کسی کے ذہن میں نہیں ہے۔ اکثر علماء کو بھی معلوم نہیں، کیونکہ یہ کام ہر عالم کا نہیں ہے۔"

[☆ آل پارٹیز مسلم کانفرنس۔ ☆☆ چودھری رحمت علی کی اسکیم؟]

متذکرہ بالا مکتوب کے دو روز بعد (۱۷ ستمبر کو) اقبال یہ مکتوب لکھتے ہیں:

"ڈیئر راغب صاحب، السلام علیکم! آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ مَیں اس سے پہلے آپ کو ایک خط لکھ چکا تھا۔ معلوم نہیں وہ خط آپ تک پہنچا یا نہیں۔ مجھے آپ کی دردمندی کا حال معلوم ہے، مگر مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ گذشتہ چند سال کے تجربے نے مجھ کو آپ سے بہت زیادہ دردمند کر دیا ہے۔ مسلمانوں کے انتشار اور ان

کے معززین کی خود غرضیوں کا مظاہرہ بہت دل شکن ہے اور مَیں نے تو اب قصد مصمم کر لیا ہے کہ اپنے گذشتہ دستورالعمل پر پھر قائم ہو جاؤں اور اپنے مخصوص طریق پر خدمت مسلمانوں کی کرتا رہوں جس کو چھوڑ کر مَیں نے عملی سیاست کا کام اختیار کیا تھا۔ جن حالات نے مجھ کو اس بات پر مجبور کیا ہے ان کا علم آپ کو نہیں مگر ممکن ہے کہ نوجوان طبائع پر ان واقعات کا اثر کچھ اور ہو--- میرا دل بہت دکھا ہوا ہے اور اپنے دُکھوں کی نمائش کرنے کی مجھ میں عادت نہیں ہے!"

مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۳۳ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں :

"ڈیر راغب صاحب، السلام علیکم! آپ کا خط مل گیا۔ کانفرنس کا اجلاس پٹنہ ملتوی ہوگیا ہے۔ میرا کوئی ارادہ اجلاس مذکور کے یا یوتھ لیگ کے اجلاس کے لیے پٹنہ جانے کا نہ تھا۔ علیٰ ہذا القیاس کوئی پیغام بھیجنے کا قصد بھی نہ تھا۔ مَیں جلد ہر چیز سے علیحدہ ہو جانا چاہتا ہوں۔ کانفرنس کی صدارت تو اب ختم ہے، ممکن ہے قواعد کی رُو سے مجھے سالانہ جلسہ تک اور یہ کام نبھانا پڑے۔ کشمیر کمیٹی کی صدارت ابھی میرے ذمے ہے۔ جب یہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائے تو اس سے بھی علیحدہ ہو جانے کا قصد رکھتا ہوں۔ آپ کو کم از کم یوتھ لیگ سے علیحدہ نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس لیگ کا مقصد عملی سیاست نہیں، یا نہیں ہونا چاہیے۔ میرے خیال میں ایسی لیگ کا مقصد صرف تربیت ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ڈسپلن--- تربیت سے مراد وہ طریق ہے جس سے مسلمان نوجوان میں دینی حرارت پیدا ہو۔"

مکتوب مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۳۳ء کے آغاز میں اقبال راغب حسن صاحب کو یہ لکھتے ہیں :

"آپ کا خط مل گیا ہے جس کے لیے شکریہ قبول کیجئے۔ مَیں اب خدا کے فضل و کرم سے اچھا ہوں۔ آپ مضطرب نہ ہوں۔ جس کا آپ کو انتظار ہے وہ ہو کر رہے گا۔ البتہ میں اُس روز شاید اس دنیا میں نہ ہوں گا۔ آپ انشاء اللہ دیکھیں گے۔"

اکتوبر ۱۹۳۳ء کے آخر میں اقبال، سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود کے ہمراہ براستہ پشاور افغانستان گئے۔ محمد نادر شاہ غازی نے انہیں تعلیمی مسائل میں مشورے کے لیے دعوت دے کر بلایا تھا۔ یہ فریضہ انجام دے کر انہوں نے افغانستان کے مختلف

مقامات کی سیاحت بھی کی اور بزرگوں کے مزارت کی زیارت بھی کی۔ حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کے بعد اقبال نے سنائی کے ایک مشہور قصیدے کی پیروی میں کچھ اردو اشعار کہہ کر اس موقع کو یادگار بنا دیا۔ یہ اشعار "بال جبریل" کی زینت بنے۔ سلطان محمود غزنوی، احمد شاہ ابدالی اور دوسرے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کے بعد براستہ قندھار، چمن، کوئٹہ واپسی ہوئی۔ اس سیاحت کی ایک اہم یادگار "مثنوی مسافر" (فارسی) تخلیق ہوئی۔

۴ دسمبر ۱۹۳۳ء کو پنجاب یونیورسٹی نے اپنی گولڈن جوبلی کانوکیشن کے موقع پر اقبال کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی۔ (اس تالیف کے شروع میں تصویر اسی موقع کی ہے۔)

۱۹۳۴ء

پندرہ سال کے وقفے کے بعد یورپ کی فضا پر پھر جنگ و جدل کے تاریک بادل چھا رہے تھے۔ طاقت ہی میں صداقت ہے، کا غلغلہ بلند ہو رہا تھا۔ اطالیہ میں مسولینی آمر مطلق کے طور پر اُبھر چکے تھے۔ جرمنی میں اوڈلف ہٹلر کے اقتدار کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور تاریک بادلوں میں بجلیاں چمکنے لگی تھیں۔ اقبال کا وجدان ۱۹۰۷ء کی طرح پھر آتش و آہن کے طوفان کی آمد آمد کی خبر دے رہا تھا — ۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء کو ایک ہی روز وہ دو خطوط میں ایک ہی موضوع پر سید سلیمان ندوی اور مولانا راغب احسن کو یہ لکھ رہے تھے:

(۱) سید سلیمان ندوی کے نام:

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے۔ جمہوریت فنا ہو رہی ہے، اور اس کی جگہ ڈکٹیٹرشپ قائم ہو رہی ہے۔ جرمنی میں مادی قوت کی پرستش کی تعلیم دی جارہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف پھر ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن (بالخصوص یورپ میں) حالت نزع میں ہے۔ غرض کہ نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک مد ہو سکتا ہے۔؟"

(۲) مولانا راغب احسن کے نام۔

"ڈیئر راغب صاحب، دنیا اس وقت ایک نئی تشکیل کی محتاج ہے۔
جمہوریت فنا ہو رہی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف ایک جہاد عظیم ہو رہا ہے۔ تہذیب و تمدن بھی ایک کشمکش میں مبتلا ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں دنیا کی جدید تشکیل میں اسلام کیا مدد کر سکتا ہے۔ اس مبحث پر اپنے خیالات مفصل لکھیں اور اگر بعض کتب ایسی ہوں جو آپ کے مطالعہ سے گزری ہوں اور جو اس مبحث میں مفید ہو سکتی ہوں تو ان کے نام، پبلشر وغیرہ لکھ دیجئے۔ والسلام۔"

اتفاق سے اسی روز بہار، اڑیسہ میں زلزلہ آیا تھا جس کے خفیف جھٹکے لاہور میں بھی محسوس کیے گئے۔ اگلے مکتوب (۲۶ جنوری) میں اقبال مولانا راغب کو لکھتے ہیں (جن کا مکتوب اس قہر الٰہی کی خبر لایا)۔

"لاہور میں بھی ۱۵ جنوری کو زلزلہ آیا تھا مگر اس قدر خفیف تھا کہ بہت سے لوگوں کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا:

اے فلک چشم تو بے باک و بلا جوست ہنوز
می شناسم کہ تماشائے دگر می خواہی"

(پیام مشرق صفحہ ۱۸۰، کلیات فارسی، صفحہ ۳۵۰)

جنوری ۱۹۳۴ء کے دوسرے ہفتے میں اقبال پر انفلوئنزا کا حملہ ہوا، جسے شروع میں معمولی نزلہ بخار سمجھا گیا (۱۰ جنوری کو عید الفطر کے موقع پر سویوں پر دہی ڈال کر کھایا اور پھر شاہی مسجد کے ٹھنڈے فرش پر نماز عید ادا کی۔ اس سے ابتدا ہوئی۔ نزلے کے ساتھ گلا بھی بیٹھ گیا) بعد میں گلے کی تکلیف اور دمے کے عارضے نے مستقل علالت کی صورت اختیار کر لی۔ (بیماری کی تفصیلات حکیم نابینا دہلوی کے گوش گزار کرنے کے لیے سید نذیر نیازی کے نام خطوط میں بیان ہوئی ہیں)۔ مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۳۴ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں:

"آپ حکیم نابینا صاحب کی خدمت میں میری طرف سے حاضر ہوں اور بیماری کے حالات عرض کر دیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ گلے کے نیچے جو آلۂ صوت (Larynx) ہے اس کا تار ڈھیلا ہوگیا ہے۔ اس وجہ سے آواز بیٹھ گئی ہے۔ چار ماہ تک علاج ہوا، مگر کچھ خاص فائدہ اس سے نہیں ہوا۔ جسم کی کمزوری بڑھ رہی ہے۔ درد گردہ اور

نقرس کا حال تو حکیم صاحب کو خود ہی معلوم ہے۔ درد گردہ کا پھر دورہ نہیں ہوا، جب سے ان کا علاج کیا ہے۔ آج چھ سال ہوگئے ہیں، اس درد نے پھر تکلیف نہیں دی، البتہ نقرس کی شکایت کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ بعض ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ نقرس کا اثر بھی گلے پر پڑ سکتا ہے، واللہ اعلم، غرض کہ تمام حالات ان کی خدمت میں عرض کر دیں۔ مَیں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا مگر صحت کمزور ہے اور گرمی سے ڈرتا ہوں۔"

بیماری کی حالت میں بھی معمول کے کاروباری، تصنیفی اور تخلیقی کام جاری تھے۔ اردو کا نیا شعری مجموعہ (جس کا نام ابھی طے نہیں ہوا تھا) زیر ترتیب تھا۔ فارسی مثنوی "مسافر"، (سیاحت افغانستان) تخلیق ہو رہی تھی۔ خطبات کا آکسفورڈ اڈیشن اسی دوران میں شائع ہوا۔ خطبات کے اردو ترجمے کی تیاری اور طباعت وغیرہ کا مرحلہ زیر غور تھا۔ سید نذیر نیازی کو ۲۴ مئی ۱۹۳۴ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مجموعۂ نظم میری رائے میں پانچ ہزار چھپنا چاہیے۔ آپ ان کی (جامعہ ملیہ والوں کی) رائے بھی معلوم کر لیں۔ اس کے صفحات شاید دو سو سے زیادہ ہوں گے۔ سائز وہی ہوگا جو میری کتابوں کا عام طور پر ہوتا ہے، یعنی ۱۷x۲۷۔ قیمت میرے خیال میں (ڈھائی روپے) ہونی چاہیے اور اگر صفحات زیادہ ہوں تو زیادہ۔ بہرحال آپ ان کے رُمز معلوم کر لیں۔ اگر کتابت و کاغذ و طباعت اچھی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ کتاب دہلی میں چھپ سکتی ہے۔ آپ خود نگرانی کریں گے تو اور بھی اچھا ہے۔"

مس مارگریٹ فارقوہرسن کے نام مکتوب محررہ ۲۸ جولائی ۱۹۳۴ء میں لکھتے ہیں:

"مائی ڈیر مس فارقوہرسن! دونوں عنایت ناموں کے لیے جو پے بہ پے تازہ اور گذشتہ ڈاک سے موصول ہوئے، ممنوں ہوں۔ افسوس ہے مَیں اب تک علیل ہوں۔ مجھے گلے کی تکلیف ہے جس نے گذشتہ پانچ ماہ سے ڈاکٹری علاج کو وقف ناکامی کر رکھا ہے۔ ڈاکٹروں کی تشخیص کوئی صدری پیچیدگی ہے۔ وی آنا میں علاج کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہ بڑی شومی قسمت ہے۔ حیران ہوں کہ ۱۹۳۵ء میں انگلستان میں اپنی مصروفیات سے کیوں کر عہدہ برآ ہوسکوں گا۔ اگر میرے ذرائع اس کے متحمل ہوئے تو وی آنا میں چار پانچ ماہ قیام رہے گا۔ اس وقت ایک تجربہ کار دہلوی حکیم کے زیر علاج ہوں۔

وہ جلد صحت یابی کی امید دلاتے ہیں۔ کچھ دیر اور ان کا علاج کروں گا۔ اگر ان کا علاج ناکام رہا تو لارڈ لوتھیان کو خطبات کے التوا کے لیے لکھوں گا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ ان کے لیے پریشانی کا موجب ہوگا۔ لیکن کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا۔ بول تو سکتا ہوں لیکن نہایت مدھم آواز میں۔ مقدمات کی پیروی اور جلسوں کی تقریر دونوں سے قاصر ہوں۔ میری بیوی اور بچوں کو اس صورت حال سے شدید پریشانی لاحق ہے۔ مجھے آپ کی پاک باطنی پر یقین رہا ہے، میرے لیے دعا فرمایئے--- ہندوستانی مسلمان عربوں کے لیے آپ کی خدمات کو بہ نظر ستائش دیکھتے ہیں--- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں طوفان پل رہے ہیں۔ ڈاکٹر ڈالفس کا قتل ایک خطرناک علامت ہے۔"

۲ اگست اور ٦ اگست ۱۹۳۴ء کے مکتوبات میں نذیر نیازی کو لکھتے ہیں:

"میرا انگلینڈ جانا بھی یقینی نہیں ہوا۔ غالباً نہ جاؤں گا"--- "مسافر (سیاحت افغانستان) کاتب کو دے دی ہے۔ اس کے بعد اردو کا مجموعہ دے دیا جائے گا۔"

اردو کے شعری مجموعے کا نام پہلے "نشان منزل" سوچا گیا، پھر "بال جبریل" طے پایا۔ اس بارے میں نذیر نیازی کو ۱٦ اگست کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کتاب کا نام (نشان منزل) کی جگہ "بال جبریل" تجویز ہوا ہے--- جہاں تک مَیں اندازہ کرسکتا ہوں یہ کتاب جلد ختم ہو جائے گی۔ لوگ یہاں اس کی اشاعت کے لیے بہت منتظر ہیں۔ فی الحال مسافر (سیاحت چند روزہ افغانستان) کی کتابت شروع ہے جو کل یا پرسوں ختم ہو جائے (گی)۔ اس کے بعد "بال جبریل" کی کتابت شروع ہوگی۔"

انہی معاملات پر سید نذیر نیازی کو ۹ ستمبر اور ۱۹ ستمبر کے مکتوبات میں اقبال رقم طراز ہیں:

"کتابوں کے متعلق عرض ہے کہ سفر نامہ افغانستان کی کتابت ختم ہوگئی ہے۔ دو چار روز میں طباعت شروع ہوگی۔ "بال جبریل" کی کتابت آج سے شروع ہے۔ مکان کی تعمیر چند روز میں شروع ہوگی۔ مجھ کو روپے کی ضرورت ہے۔ اگر یہاں زمین کا انتظام باطمینان ہوگیا تو بہتر ورنہ کچھ کتابیں جامعہ کمیشن پر خرید سکتا ہے۔ آپ مطلع فرمائیں کہ لیکچروں کی کتابت شروع ہوئی یا نہیں؟ اس کے متعلق کوئی خط جامعہ کی طرف سے نہیں آیا۔ مَیں نے اپنی تمام کتابوں کا حق تصنیف جاوید کے نام ہبہ کر کے

دستاویز رجسٹری کرا دی ہے، اور یہ سب مال اس کا ہے۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ ہے، اس واسطے مجھے اس کا باقاعدہ حساب رکھنا ہے۔"

"لیکچروں کے متعلق عرض ہے کہ جو شرائط مکتبہ کے ساتھ طے ہوں وہ صرف پہلی ایڈیشن کے متعلق ہوں گے، اور جو روپیہ میرے لیے انہوں نے تجویز کیا ہے اس میں اجرت ترجمہ شامل ہے یا نہیں۔ بہتر ہو آپ چند روز کے لیے آ جائیں۔ مزید دوا بھی لیتے آئیں۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوگی۔ رقم جو تجویز ہو، یکمشت اور فوراً ادا ہو جائے تو بہتر ہے۔ کیونکہ اب چند روز میں جاوید کے مکان کی تعمیر شروع ہونے والی ہے، اور روپے کی ضرورت ہے۔ بال جبریل دس ہزار طبع ہوگی۔ اس کی فروخت کا انتظام بھی ہوگیا ہے۔ ایک لوکل کمپنی نے سب کی سب خرید لی ہیں۔"

لیکچروں کی طباعت کا مسئلہ تعویق میں رہا۔ اس عرصے میں ایک نئی پریشانی اہلیہ کی شدید علالت کی صورت میں نمودار ہوئی۔ نومبر میں "جاوید منزل" کی تعمیر بڑے بھائی شیخ عطا محمد کی نگرانی میں شروع ہوئی۔ "مسافر" چھپ گئی۔ "بال جبریل" زیر طبع تھی۔ ۶ دسمبر ۱۹۳۴ء، مسٹر جمیل کو اطلاع دیتے ہیں:

"میری اردو نظموں کا ایک مجموعہ جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوگا۔ ایک دو مہینے ہوئے ایک فارسی نظم "مسافر" شائع ہوئی تھی۔ یہ میری سال گذشتہ کی سیاحت افغانستان کا تذکرہ ہے۔"

متذکرہ بالا معاملات کے ساتھ ساتھ دور حاضر کو درپیش خطرات اور عمرانی مسائل پر غور و فکر کا سلسلہ بھی جاری تھا اور ان مسائل پر سید سلیمان ندوی اور مولانا راغب احسن سے خط و کتابت ہو رہی تھی۔

مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو مولانا راغب احسن کے نام مکتوب میں "ملکیت زمین" کے مسئلے پر لکھتے ہیں:

"ڈیئر راغب صاحب! آپ کا خط ابھی ملا ہے۔ اس سے پہلے میں آپ کے خط کے جواب میں ایک خط لکھ چکا ہوں۔ اس مبحث میں جو کچھ میرے خیالات ہیں ان کا اظہار میں "جاوید نامے" میں کر چکا ہوں۔ اس کو غور سے پڑھیے۔ آپ کے خیالات اجمالاً درست ہیں۔ مفصل گفتگو جب آپ سے ملاقات ہوگی تو انشاء اللہ اس وقت

ہوگی۔ مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے بالکل درست ہے۔ قرآن میں تو ارض کے متعلق کئی دفعہ آیا ہے، "الارض للہ" اور حضرت آدم سے بھی یہی کہا گیا کہ تمہارے لیے ارض مستقر اور متاع یعنی فائدہ کی چیز ہے۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف اللہ کی ہے۔ مسلمان صرف اس چیز کا امین ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے۔ میری رائے میں اگر کوئی مسلمان اپنی پرائیویٹ زمین وغیرہ کا غلط استعمال کرے تو حاکمیت اسلامیہ کو حق ہے کہ وہ اس سے باز پرس کرے۔ یہی وہ نکتہ ہے اسلام کا، جس کو یورپ میں مسولینی نے خوب سمجھا ہے۔

غالباً امام محمد یا ابو یوسف سے خلفائے عباسیہ میں سے کسی نے فتویٰ زمین کی ملکیت کے متعلق طلب کیا تھا، تو انہوں نے یہ فرمایا تھا کہ زمین اس کی ملکیت ہے جو اس کو زندہ رکھ سکے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زمین کا مالک امام کے نزدیک وہی ہے جو حقیقت میں اپنی محنت سے اسے کاشت کرتا ہے، نہ وہ شخص کہ گھر میں بیٹھا بٹائی لیتا ہے۔ حضور رسالت مآبؐ نے تو حیوانوں پر بھی شفقت کی ہے اور حکم دیا ہے:

"المرعی للہ و رسولہ،" یعنی چراگاہیں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ملکیت ہیں، کسی شخص کی پرائیویٹ ملکیت نہیں ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض احادیث میں دو منزلہ مکان بنانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ غرضیکہ اس معاملے میں مفصل بحث اور ریسرچ کی ابھی ضرورت ہے۔ اس پر آج تک کسی نے نہیں لکھا۔ مسلمان علما اپنی غفلت سے اسلامی عقائد پر بحث مباحثے کرتے رہے اور اسلام کے معاشرتی نظام کی طرف کسی نے (شاید سوائے شاہ ولی اللہ کے) توجہ نہیں کی۔ اب اس زمانے میں معاشرتی نظام اسلام کی تفصیلات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ لوگ موجودہ زمانے کے اقتصادی سوالات کی وجہ سے عقائد مابعدالطبیعی میں دلچسپی نہیں لیتے۔ بحیثیت مذہب کے اسلام کی کامیابی کا دارومدار اس پر ہے کہ اس کے معاشرتی نظام کی افضلیت زمانہ حال کے نظاموں پر ثابت کی جائے۔ یورپ اور اسلام کی رقابت ہمیشہ رہی ہے، مگر اس سے پہلے اس کا انتہائی نقطہ حروب صلیبیہ تھا۔ اب یورپ اور اسلام کی جنگ تلواروں کی نہیں بلکہ معاشرت کے نظاموں کی ہوگی۔ یعنی فسطائیت، بولشوزم، اور اسلام وغیرہ Plane پر معرکہ آرا ہوں گے۔ مسلمانوں میں تو اس وقت اس مطلب کے آدمی

موجود نہیں۔ کیا عجب کہ یورپ کے مفکر خود اس نظام کا اکتشاف کر لیں۔ یہ امر مشکل بہت ہے کیونکہ مذہب اسلام پر قرون اول سے ہی مجوسیت اور یہودیت غالب آگئی۔ یعنی اسلام کے اصل افکار کو یہودی اور مجوسی افکار نے عوام کی نگاہوں سے چھپا لیا۔ میری رائے ناقص میں اسلام آج تک بے نقاب نہیں ہوا۔ افسوس کہ علالت کی وجہ سے مُیں آپ کو طویل خط نہیں لکھ سکتا۔ جو کچھ مُیں نے لکھا ہے، محض اشارات ہیں۔ ان کی تفصیل اگر آپ سامنے ہوتے تو زبانی عرض کرتا۔ جاوید نامے کے متعدد مقامات پر اس مسئلہ کے مختلف پہلو آئے ہیں، اس کو شروع سے آخر تک پھر پڑھیے۔

آپ کی آگاہی کے لیے یہ بھی لکھ دیتا ہوں کہ قرآن نے تقسیم جائیداد کے متعلق جو قاعدہ دیا ہے اس کا اطلاق (میری رائے ناقص میں) زمین پر نہیں ہوتا۔ یہ قاعدہ صرف جائیداد منقولہ کے لیے ہے۔ مگر علماء کی رائے مختلف ہے اور مسلمانوں کی پریکٹس بھی اس بارے میں جیساکہ آپ کو معلوم ہے، مختلف ہے۔"

۲۲ دسمبر ۱۹۳۴ء (رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ) کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اقبال کو دکتور فی الادب (ڈی۔ لٹ) کی اعزازی ڈگری پیش کی۔

۱۹۳۵ء

۱۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو اقبال علی گڑھ یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر اور شعبہ فلسفہ کے صدر پروفیسر ایم۔ ایم شریف کے نام مکتوب میں اس اعزاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

"میرا کوئی حق اس یونیورسٹی پر نہ تھا، اور نہ عام طور پر علی گڑھ تحریک سے میرا کوئی تعلق رہا ہے۔"

"بال جبریل" جنوری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوگئی۔ ۳۰ جنوری کو اقبال نے جامعہ ملیہ دہلی میں نامور ترک خاتون خالدہ ادیب خانم کے لیکچر میں صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اگلے روز وہ بھوپال روانہ ہوگئے جہاں ایک ماہ سے اوپر ان کا علاج بذریعہ برقی شعاع ہوتا رہا۔ ۸ مارچ کو بھوپال سے لاہور کو واپسی ہوئی۔ گذشتہ برس سے گلا بیٹھ جانے کی وجہ سے اقبال کی وکالت ختم ہو چکی تھی۔ ان کے معاش کے ذرائع مسدود ہو

کر رہ گئے تھے۔ سر راس مسعود اسی زمانے میں بھوپال میں وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔ ان کی یہ خواہش تھی کہ اقبال فکر معاش سے بے نیاز ہو کر علمی کام کرتے رہیں۔ اس مقصد کے تحت وہ بڑی خاموشی سے بھوپال سے اقبال کے لیے علمی وظیفہ کے لیے کوشاں تھے۔ اقبال کو اس بات کا علم کسی دوسرے ذریعے سے ہوا۔ اقبال ان ایام میں اپنی توجہ زیادہ تر مطالعہ قرآن اور دینی و فقہی مسائل پر مرکوز کر چکے تھے۔ عرشی امرتسری کے نام مکتوب محررہ ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء میں لکھتے ہیں :

"مَیں ایک مدت سے مطالعہ کتب ترک کرچکا ہوں۔ اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی" ۔"

سر راس مسعود کے نام مکتوب محررہ ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں رقم طراز ہیں :

"مائی ڈیئر مسعود! نوازش نامہ موصول ہوا۔ آپ کی علالت کی اطلاع باعث تشویش ہوئی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد آپ کو صحت کلی عطا فرمائے۔ مَیں انشاء اللہ مئی کے آخر تک بھوپال آسکوں گا۔ میری بیوی گذشتہ دس سال سے بیمار اور تلی اور جگر کے عوارض میں مبتلا ہے، اور اب بوجہ بخار زیادہ کمزور ہوگئی ہے۔ ہم لوگ انشاء اللہ وسط مئی تک اپنے نئے مکان میں چلے جائیں گے۔ خدا کرے کہ اس وقت تک میری بیوی میں چلنے پھرنے کی ہمت پیدا ہو جائے۔ آپ نے میرے متعلق جس دلچسپی کا اظہار فرمایا ہے اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔ اگرچہ مجھے آپ سے یہ کہنے میں کچھ تامل نہیں کہ مجھے اس سلسلے میں کامیابی کی کچھ زیادہ توقع نہیں۔ مجھے کچھ عرصہ پہلے تو اس خیال سے مسرت تھی کہ آپ کے اس کوشش میں کامیاب ہونے کی قوی امید تھی اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا تھا کہ مَیں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں۔ لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو مَیں سمجھتا ہوں قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانان عالم کو نہیں کر سکتا۔ بہرحال، دیدہ باید۔ ہر امر اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اگر عالم جدید میں اسلام کی اس خدمت کا شرف میرے لیے مقدر ہوچکا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لیے

ضروری ذرائع بہم پہنچا دے گا۔"

اقبال غالباً ۲۰ مئی ۱۹۳۵ء کو میکلوڈ روڈ کی اقامت گاہ سے میو روڈ (موجودہ شارع اقبال) پر اپنی نو تعمیر "جاوید منزل" میں منتقل ہوگئے، اور تین روز بعد اُن کی اہلیہ (والدۂ جاوید) رحلت فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۲۳ مئی ۱۹۳۵ء کو راس مسعود کے نام یہ مکتوب لکھا گیا:

"مائی ڈیئر مسعود! نوازش نامے کے لیے، جس سے ایک گونہ اطمینان ہوا، سراپا سپاس ہوں۔ میری خواہش تو حقیقت میں اُس انسان کی خواہش ہے جو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے اور سفر آخرت سے پہلے کچھ نہ کچھ خدمت انجام دینے کا تمنائی ہے۔ مجھے امید ہے آپ اعلیٰ حضرت کی خدمت اقدس میں اس مسئلہ کو پیش کر دیں گے۔ اعلیٰ حضرت کے مراحم خسروانہ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں کہ بھوپال میں میری آسائش کا ان کو اس قدر خیال ہے۔

میری بیوی خطرناک طور پر بیمار ہے۔ شاید یہ اس کے آخری لمحات ہیں۔ لہٰذا میرے لیے لاہور سے باہر جانا اس وقت ممکن نہیں۔ آپ کو بعد میں اطلاع دے سکوں گا۔۔۔"

(تحریر مابعد) "ساڑھے پانچ بجے میری بیوی کا انتقال ہوگیا۔"

اگلے روز ۲۴ مئی کو سید نذیر نیازی کو اس سانحہ ارتحال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"کل شام چھ بجے والدۂ جاوید اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئیں۔ ان کے آلام و مصائب کا خاتمہ ہوا، اور میرے اطمینان قلب کا، اللہ فضل کرے۔

ہر چہ از دوست می رسد نیکو است!"

۳۰ مئی کو سید راس مسعود کے نام یہ مکتوب لکھا گیا:

"چراغ سحر ہوں، بجھا جاتا ہوں۔ تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلم بند کر جاؤں۔ جو تھوڑی سی ہمت و طاقت ابھی مجھ میں باقی ہے اسے اسی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہتا ہوں تاکہ (قیامت کے دن) آپ کے جد امجد (حضور نبی کریمؐ) کی زیارت مجھے اس اطمینان خاطر کے ساتھ میسر ہو کہ اس عظیم

الشان دین کی جو حضور نے ہم تک پہنچایا کوئی خدمت بجا لاسکا۔"

اس مکتوب کی ترسیل کے فوراً بعد اسی روز (۳۰ مئی کو) دوسرا مکتوب اظہار تشکر و امتنان کے طور پر لکھا گیا۔ غالباً اسی وقت یہ اطلاع ملی کہ والی بھوپال نواب سر حمید اللہ خاں نے اقبال کے لیے تاحیات پانچ سو روپے ماہوار وظیفہ خاص مقرر کر دیا ہے:

"ڈیئر مسعود! آپ کا والا نامہ ابھی ملا ہے۔ مَیں کس زبان سے اعلیٰ حضرت کا شکریہ ادا کروں۔ انہوں نے ایسے وقت میں میری دستگیری فرمائی جب کہ مَیں چاروں طرف آلام و مصائب میں محصور تھا۔ خدا تعالیٰ ان کی عمر و دولت میں برکت دے۔ ہندوستان کے مسلمان شرفا میں سے کون ہے جو اعلیٰ حضرت کا اور ان کے دودمان عالی کا ممنون احسان نہیں ہے:

دور دستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است
ورنہ ہر نخلے بہ پائے خود ثمر می افگند

یہ عریضہ اعلیٰ حضرت کو سنا دیجیے۔ مَیں خود حاضر ہو کر شکریہ ادا کروں گا۔ اب میری درخواست صرف اس قدر ہے کہ احکام اس پنشن کے تو جاری ہوں گے ہی، سرکار عالی اپنے ہاتھ سے بھی اس مضمون کا ایک خط مجھے لکھ دیں جو آپ نے مجھے لکھا ہے۔ یہ خط میری اولاد میں بطور یادگار کے رہے گا، اور وہ اس پر فخر کریں گے۔"

۱۵ جون کو سید راس مسعود کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"کل اعلیٰ حضرت ظاہر شاہ کا تار تعزیتی آیا تھا، اور آج سردار صلاح الدین سلجوقی اعلیٰ حضرت کا زبانی پیغام لائے ہیں۔ بہت حوصلہ افزا اور دل خوش کن پیغام ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں، سوائے دعا ترقی مراتب، لارڈ لوتھیان کا خط ابھی لندن سے آیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کہ "رہوڈز لیکچرز" کے لیے کب آؤ گے؟ اب بچوں کو چھوڑ کر کہاں جاسکتا ہوں؟ ان کی ماں کی وصیت ہے کہ ان بچوں کو اپنے سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہ کرنا۔" اگلے مکتوب (مورخہ ۲۴ جون) میں لکھتے ہیں:

"ڈیئر مسعود، آپ کا خط مل گیا ہے اور اعلیٰ حضرت کا والا نامہ بھی موصول

ہوگیا ہے جسے مَیں نے سادہ اور خوبصورت فریم میں لگوا دیا ہے — مَیں انشاء اللہ وسط جولائی تک بھوپال پہنچوں گا۔"

سید راس مسعود بھوپال کے وظیفے کے علاوہ اقبال کی مزید مالی امداد کے لیے سر آغا خان سے بھی سلسلۂ جنبانی کر رہے تھے۔ اقبال اس پر متردد تھے، چنانچہ ۱۸ ستمبر ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"باقی رہا وہ معاملہ، سو اس میں تمہارے اس خط کے بعد مَیں کیا عرض کروں۔ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال کی پنشن قبول کرنے کے بعد کسی اور طرف نگاہ کرنا آئین جوانمردی نہیں ہے۔ لیکن مَیں آپ کو اپنا دوسرا Self خیال کرتا ہوں۔ اس واسطے جو کچھ آپ لکھتے ہیں، اس پر عمل کرتا ہوں۔ اخباروں میں اس کا چرچا مناسب نہیں معلوم ہوتا، اور اس کی ادائیگی بھی معرفت اعلیٰ حضرت ہی ہونی چاہیے جیسا کہ آپ نے مجھ سے زبانی کہا تھا۔"

لیکن یہ تذبذب ختم نہیں ہوا تھا۔ مورخہ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں اقبال قدرے صراحت سے لکھتے ہیں:

"آج اس تمام معاملے پر کامل غور و فکر کرنے کے بعد پھر لکھتا ہوں۔ آپ اس خط کو کانفیڈنشل تصور فرمائیں۔ آپ کو یاد ہوگا مَیں نے آپ سے بھوپال میں آپ کے بڈ روم میں گفتگو کی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میرا خیال معلوم کر لینے کے بعد آپ نے شاید اس تجویز کو ڈراپ کر دیا ہوگا۔ اس کے بعد جس مسٹری کا آپ نے مجھ سے ذکر کیا تھا مَیں سمجھ رہا تھا کہ یہ کوئی اور معاملہ ہے۔ بہرحال آپ کو معلوم ہے کہ اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال نے جو رقم میرے لیے مقرر فرمائی ہے، وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اگر کافی نہ بھی ہو تو مَیں کوئی امیرانہ زندگی کا عادی نہیں۔ بہترین مسلمانوں نے سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کی ہے۔ ضرورت سے زیادہ کی ہوس کرنا روپیہ کا لالچ ہے جو کسی طرح بھی کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ کو میرے اس خط سے یقیناً کوئی تعجب نہ ہوگا۔ کیونکہ جن بزرگوں کی آپ اولاد ہیں اور جو ہم سب کے لیے زندگی کا نمونہ ہیں، اُن کا شیوہ ہمیشہ سادگی اور قناعت رہا ہے۔ ان حالات پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس رقم کو قبول کرتے ہوئے حجاب آتا ہے اور مَیں بے

حد تذبذب کی حالت میں ہوں — !"

۱۶ جولائی ۱۹۳۵ء کو اقبال بغرض علاج دوبارہ بھوپال پہنچے اور ۲۸ اگست تک وہاں قیام رہا (زیر تالیف اردو مجموعہ "صور اسرافیل" جس کا نام بعد میں "ضرب کلیم" رکھا گیا کے بعض حصے بھوپال ہی میں تخلیق ہوئے۔) اس دوران میں مطالعہ کتب بھی جاری رہا۔ سلیمان ندوی کو ۲۰ اگست ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مَیں بھی یہاں حمیدیہ لائبریری اور بعض پرائیویٹ احباب سے کتابیں منگوا کر دیکھتا رہا۔ الحمدللہ بہت سی باتیں مل گئیں۔ اس مطالعہ سے مجھے بے انتہا فائدہ ہوا، اور آپ کے خط نے تو اور بھی راہیں کھول دی ہیں۔

مَیں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا۔ اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن شاعری سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد خاص رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رُو سے مَیں نے نظم کا طریقہ اختیار کر لیا ہے، ورنہ

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست
کہ بر من تہمت شعر و سخن بست

(زبور عجم)

اقبال جب علاج کے سلسلے میں بھوپال میں تھے تو لاہور میں مسجد شہید گنج کے انہدام کا سانحہ پیش آیا۔ ۲۲ جولائی کو بہت سے مسلمانوں نے مسجد کی حرمت پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ پنجاب اور سرحد کی فضا میں اس واقعہ سے بڑی تلخی اور کشیدگی پیدا ہوئی۔ یہ کُل ہند منظر نامے کا ایک جزو تھا۔ ۲۶، ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اقبال مولانا الطاف حسین حالی کی صد سالہ تقریبات میں شرکت کے لیے پانی پت گئے۔

اقبال کشمیر کمیٹی کے معاملات میں قادیانیوں کے اصل رخ کردار اور ان کے حقیقی عزائم سے بہ خوبی آگاہ ہو چکے تھے۔ برطانوی استعمار کی سرپرستی میں اب یہ معاملہ بہت سنگین ہوتا جا رہا تھا۔ اقبال نے اپنی مسلسل علالت اور گرتی ہوئی صحت کے باوجود مسلم اُمہ کو درپیش اس نہایت اہم عصری مسئلے پر آگاہی کے لیے ۱۹۳۵ء، ۱۹۳۶ء میں

قلم اٹھایا۔ مئی ۱۹۳۵ء میں انہوں نے "قادیانی اور جمہور مسلمان" کے عنوان سے ایک آرٹیکل لکھ کر برطانوی رائے عامہ کو اس سنگین مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ یہ مضمون انگریزی، اردو مختلف اخبارات میں شائع ہوا۔ اس بارے میں اقبال، نذیر نیازی کو ۱۷ مئی ۱۹۳۵ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"وہ مضمون جو آپ نے "دکن ٹائمز" میں دیکھا ہے قریباً تمام انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ ایسٹرن ٹائمز، ٹریبیون، سٹیٹس مین، سٹار آف انڈیا کلکتہ، علاوہ اس کے اُردو اخباروں میں اس کا ترجمہ بھی شائع ہوا ہے۔ ۱۴ مئی کے سٹیٹس مین نے اسے شائع کیا ہے اور ساتھ ہی اس کے اس پر لیڈنگ آرٹیکل بھی لکھا ہے۔ اب یہاں کے چند نوجوان اسے پمفلٹ کی صورت میں شائع کر رہے ہیں۔ پمفلٹ کی صورت میں اس میں تھوڑا سا اضافہ بھی ہو جائے گا۔"

متذکرہ بالا مضمون کی تمہید اور اس کا خلاصہ نہایت اختصار کے ساتھ یہاں پیش کیا جاتا ہے: Islam and Qadianism کی تمہید میں اقبال لکھتے ہیں:

"قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کے درمیان بحث سے ایک نہایت اہم مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ ہندی مسلمانوں کو حال ہی میں اس مسئلے کی سنگینی اور اہمیت کا اندازہ ہوا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ برطانوی عوام سے ایک کھلے خط کی صورت میں خطاب کرکے انہیں اس مسئلے کے سیاسی اور معاشرتی نتائج و عواقب سے آگاہ کروں۔ لیکن بدقسمتی سے میری صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ تاہم، مجھے اس اہم مسئلے پر فی الحال چند باتیں کہنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے، جو میرے خیال میں ہندی مسلمانوں کی تمام تر اجتماعی زندگی کو متاثر کرتا ہے۔ اس بات کا ذکر ابتدا ہی میں کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا ارادہ کسی قسم کی مذہبی بحث میں پڑنے کا نہیں، اور نہ ہی میرا مقصد قادیانی تحریک کے بانی کے نفسیاتی تجزیہ کرنے کا ہے۔ کیونکہ اول الذکر میں ان لوگوں کو کوئی دلچسپی نہ ہوگی جن کی خاطر یہ بیان نشر ہو رہا ہے اور ثانی الذکر کے لیے ہند میں ابھی وقت نہیں آیا۔ اس وقت میرا نقطۂ نظر عمومی تاریخ اور تقابل ادیان کے ایک طالب علم کا ہے۔

"ہند ایک ایسا خطہ ہے جہاں کئی اقوام مختلف مذاہب کی پیرو ہیں اور مسلمان ایک مذہبی اساس پر مبنی قوم ہونے کے لحاظ سے اُن اقوام سے کہیں زیادہ وسیع تر

معنوں میں ایک مذہبی قوم ہیں جن کا تانا بانا کچھ تو مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور کچھ نسل سے — اسلام، نسلی نظریئے کو بالکل مسترد کرتا ہے اور صرف مذہبی نظریے کی اساس پر قائم ہے، چونکہ اسلام صرف مذہبی نظریے کی اساس پر قائم ہے اور یہ اساس جو تمام تر روحانی ہے اور نتیجتہ" مادی خونی رشتے سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے۔ اس لیے مسلم معاشرہ قدرتی طور سے ان قوتوں کے بارے میں کہیں زیادہ حساس ہے جو ان کے اتحاد و یکجہتی کے لیے نقصان رساں ہوں۔ کوئی مذہبی گروہ جو تاریخی لحاظ سے اسلام کے اندر سے اُبھرے اور اپنی اساس و بنیاد کے لیے ایک نئی نبوت کا دعویٰ کرے، اور ان تمام مسلمانوں کو جو ان کے اس دعوے کو تسلیم نہ کریں، انہیں کافر قرار دے، تو لازم ہے کہ ہر مسلمان اس گروہ کو اسلام کے استحکام و یک جہتی کے لیے شدید خطرہ قرار دے۔ یقیناً ایسا ہی ہونا چاہیے، کیونکہ مسلم معاشرے کی یک جہتی صرف ختم نبوت کے عقیدے پر ہی قائم رہ سکتی ہے۔

"ختم نبوت کا یہ نظریہ انسان کی ثقافتی تاریخ میں سب سے اولین بنیادی نظریہ ہے۔ اس کی حقیقی اہمیت مغرب اور وسط ایشیا کے صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنہوں نے قبل از اسلام کے مجوسی کلچر کی تاریخ کا بغور مطالعہ کیا ہو۔"

— اور اپنے بیان کے اختتام پر اقبال نے برطانوی حکومت کے سامنے یہ تجویز پیش کی:

"ہند کے برطانوی حکمرانوں کے سامنے میری رائے میں بہتر صورت یہ ہے کہ قادیانیوں کو ایک جداگانہ کمیونٹی قرار دے دیں۔ یہ امر قادیانیوں کی اپنی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا، اور ہندی مسلمان انہیں اسی طرح برداشت کر لیں گے جس طرح وہ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو برداشت کرتے رہے ہیں۔"

برطانوی حکومت اور برطانیہ کے عوام کی آگاہی کے لیے لکھا گیا اقبال کا یہ بیان ہند کے اکثر انگریزی اخبارات میں شائع ہوا۔ انگلش ڈیلی "دی سٹیسمین" نے ۱۴ مئی ۱۹۳۵ء کو نہ صرف یہ بیان چھاپا، بلکہ ساتھ ہی اس بیان پر اپنے شہ اداریے میں تنقید بھی کی۔ اقبال نے مدیر کے اٹھائے گئے اعتراضات کا جواب ایک طویل مکتوب کی صورت میں دیا جو اسی اخبار کی اشاعت ۱۰ جون ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اب پنڈت جواہر

لال نہرو بھی اس میدان میں کود پڑے اور انہوں نے تین مضامین بالاقساط ماڈرن ریویو میں لکھے۔ ابھی پنڈت نہرو کے مضمون کی دو قسطیں شائع ہوئی تھیں کہ اقبال اس کا جواب لکھنے کے لیے بھی تیار ہو چکے تھے۔ وہ مولانا مسعود عالم ندوی کے نام ۲۸ نومبر ۱۹۳۵ء کے محررہ مکتوب میں لکھتے ہیں:

"حال ہی میں پنڈت جواہر لعل نہرو نے ماڈرن ریویو میں دو مضمون شائع کیے ہیں جن میں سے ایک کا مقصود غالباً قادیانیوں کی حمایت ہے۔ ان کے جواب میں انشاء اللہ مَیں بھی کچھ لکھوں گا۔"

۱۹۳۶ء

پنڈت جواہر لال نہرو کے "ماڈرن ریویو" میں تین مضامین مسلسل شائع ہوئے جن میں قادیانیت اور جمہور مسلمانوں کے مابین بحث اور اقبال کے بیانات پر بھی کچھ تنقید ہوئی۔ اقبال نے پنڈت نہرو کے مضامین کے جواب میں ایک مفصل اور جامع مضمون "اسلام اور احمدیت" کے عنوان سے لکھا جس میں انہوں نے بتایا کہ "مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔" اقبال کا یہ مضمون انجمن خدام الدین کے پندرہ روزہ انگریزی جریدہ "اسلام" میں ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء کو شائع ہوا، اور بعد میں اس مضمون کو پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔ پنڈت نہرو اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے اقبال کو خط لکھا، اقبال نے ۲۱ جون کو جواب میں اس تاریخی حقیقت پر روشنی ڈالی جو قادیانی تحریک کی آفرینش کا سبب بنی۔ لکھتے ہیں:

"آپ کے مکتوب کا بیحد شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ جس وقت مَیں نے آپ کے مضامین کے جواب میں لکھا، مجھے یقین تھا کہ آپ کو احمدیوں کے سیاسی کردار کا کچھ اندازہ نہیں۔ درحقیقت میرے جواب لکھنے کی خاص وجہ یہ بتانا تھا، خصوصاً آپ کو، کہ مسلم وفاداری کا آغاز کس طرح ہوا، اور کس طرح اس میں احمدیت نے الہامی بنیاد فراہم کی۔ میرے مضمون کی اشاعت کے بعد مجھ پر یہ حیران کُن انکشاف ہوا کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی ان تاریخی اسباب کا بالکل کوئی اندازہ نہیں جن سے احمدیت

کے پرچار کی صورت گری ہوئی — علاوہ ازیں پنجاب اور دوسری جگہوں پر آپ کے مسلمان مداح آپ کے مضامین سے پریشان ہوئے کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آپ کو احمدیہ تحریک سے ہمدردی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ احمدیوں نے آپ کے مضامین پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ اس غلط فہمی کے پھیلانے کے ذمے دار احمدی اخبارات تھے۔ یہ معلوم ہو کر مجھے مسرت ہوئی کہ میرا تاثر (آپ کے بارے میں) غلط تھا۔ مذہبی مسائل سے میری دلچسپی محدود ہے، تاہم اس مین اتنا درک رکھتا ہوں کہ احمدیوں کو انہی کی زمین میں جواب دے سکوں۔

"مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں نے اپنا مضمون محض اسلام اور ہندوستان کی خیر خواہی کے لیے خلوص نیت سے لکھا تھا۔ میرا ذہن اس بارے میں ہر شبہے سے پاک ہے کہ احمدی، اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدّار ہیں۔"

اقبال نے ۱۹۱۰ء کے خطبہ علی گڑھ میں اسلامی سیرت پر بحث کرتے ہوئے ایک جملے میں یہ کہا تھا (اور ظفر علی خاں نے اس کا یہ ترجمہ کیا تھا): "پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں"۔ اس جملے کے حوالے سے ایک ہفتہ وار قادیانی پرچے نے اقبال پر متلوّن مزاجی اور بے اصولی (Inconsistency) کا الزام جڑ دیا جس کا جواب دیتے ہوئے اقبال نے یہ وضاحت کی:

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ لیکچر ۱۹۱۱ء یا شاید اس سے قبل دیا گیا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی تردد نہیں۔ مَیں بلاتذبذب یہ اعتراف کرتا ہوں کہ رُبع صدی قبل مجھے توقع تھی کہ اس تحریک کے نتائج اچھے ہوں گے۔ لیکن ایک مذہبی تحریک اپنی حقیقی روح یا اپنا آپ ایک دن میں ظاہر نہیں کرتی بلکہ کئی عشروں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس تحریک کے دو گروہوں کے داخلی تنازعات اس حقیقت کا عملی ثبوت ہیں کہ وہ لوگ بھی جو ذاتی طور سے بانی تحریک کے بہت قریب تھے وہ بھی اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے کہ یہ تحریک کس طرح آگے بڑھے گی۔ ذاتی طور پر مجھے اس تحریک کے بارے میں اس وقت شبہ ہوا، جب ایک نئی نبوت، پیغمبر اسلام سے بھی برتر (نعوذ باللہ) کا دعویٰ واضح طور سے پیش کیا گیا اور دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار

دیا گیا۔ بعد میں میرا یہ شبہہ، یقین میں اور مثبت بغاوت میں اس وقت بدل گیا جب مَیں نے اپنے کانوں سے تحریک کے ایک پیرو کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ سخت تحقیر آمیز زبان میں کرتے ہوئے سنا۔ کسی درخت کی جڑوں سے نہیں بلکہ اس کے ثمر سے آپ اس کی حقیقت پہچان سکتے ہیں۔ اگر میرا موجودہ رویہ میری اپنی تردید کرتا ہے تو صرف زندہ اور سوچنے والے انسان ہی کو یہ فوقیت حاصل ہے کہ وہ اپنی تردید آپ کرسکے۔ صرف پتھر ہی اپنی تردید آپ نہیں کرسکتے، جیساکہ ایمرسن نے کہا ہے۔"

ان تاریک ایام میں جب مسلم امہ ہر جگہ افتراق و انتشار میں مبتلا تھی، اقبال کا رجائیت پسند ذہن مسلم اتحاد کے امکانات پر غور و فکر کر رہا تھا۔ اس دوران ایک معمولی سا واقعہ کلچرل پیکٹ کی صورت میں "میثاق سعد آباد" کے عنوان سے رونما ہوا۔ اقبال کو اس میں اُمید کی ایک جھلک نظر آئی۔ چنانچہ وہ ۲۵ فروری ۱۹۳۶ء کو مسعود عالم ندوی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

"ترکوں کے متعلق مایوس نہ ہونا چاہیے۔ اُن کے ایک خدا پرست جرنیل کے الفاظ ہیں: "یہ الحاد کی ہوا آئی ہے، کچھ دن کے بعد نکل جائے گی۔" جو کچھ ہوا جذبہ وطن پرستی بلکہ توران پرستی کا نتیجہ تھا۔ اب جو عراق، افغانستان، ایران اور ترکی کے معاہدے کی تجویز ہو رہی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں نے "توران پرستی" کو بحیثیت ایک پالیسی کے ترک کر دیا ہے "کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو" حالات اس قسم کے ہیں کہ ترک اسلام کو چھوڑ کر بھی من حیث القوم سرسبز نہیں ہو سکتے۔ باقی یہ بات صحیح ہے کہ ان میں افرنگ زدہ لوگ بکثرت ہیں۔ لیکن کیا عجب کہ آئندہ دس سال میں افرنگ زدگی کے سرچشمے ہی کا خاتمہ ہو جائے۔ سب کچھ اللہ کے قبضہ قدرت میں ہے۔"

"ضرب کلیم" اردو اشعار کا مجموعہ طباعت اور اشاعت کے مرحلے میں تھا، اور ایک نئی فارسی مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" تخلیق کے مرحلے میں تھی۔ اس مثنوی کے یہ اشعار اس وقت کی عالمی صورت حال کا بھرپور نقش پیش کرتے ہیں:

آدمیت زار نالید از فرنگ

زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ
پس چہ باید کرد اے اقوام شرق؟
باز روشن می شود ایام شرق
در ضمیرش انقلاب آمد پدید
شب گزشت و آفتاب آمد پدید
یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گردوں رسم لا دینی نہاد
گرگے اندر پوستین برہ ای
ہر زمان اندر کمین برہ ای
مشکلات حضرت انساں ازو است
آدمیت را غم پنہاں ازو است

اس مثنوی کی شان نزول کے بارے میں اقبال سید راس مسعود کے نام مکتوب محررہ ۲۹ جون ۱۹۳۶ء میں لکھتے ہیں :

"ڈیئر مسعود،... ضرب کلیم یا اعلان جنگ زمانہ حاضر کے خلاف، افسوس کہ ابھی تک تیار نہیں ہوئی- یہ میرا قصور نہیں، پریس کا قصور ہے- اب چار جولائی کو کتاب کی طباعت ختم ہو گئی تو Advance کاپی ارسال کر دوں گا- ۳ اپریل کی شب کو جب مَیں بھوپال میں تھا، مَیں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا- مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کر- مَیں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرضداشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے- کُل ساٹھ شعر ہوئے- لاہور آکر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے، اگر کسی زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے- الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے- مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا- بہرحال اس کا نام ہو گا : "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق"- ضرب کلیم کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی-"

یہی خواب اور اس کے اثر کے بارے میں اقبال ۱۳ جون ۱۹۳۶ء کو پروفیسر الیاس برنی کے نام مکتوب میں بھی بیان کر چکے تھے :

"آپ عاشقان رسولؐ میں سے ہیں۔ اس واسطے ایک اور بات آپ کے گوش گزار کرنے کے لائق ہے۔ ۳ اپریل کی رات ۳ بجے کے قریب (مَیں اس شب بھوپال میں تھا) مَیں نے سرسید علیہ الرحمتہ کو خواب میں دیکھا۔ پوچھتے ہیں تم کب سے بیمار ہو؟ مَیں نے عرض کیا، دو سال سے اوپر مدت گزر گئی۔ فرمایا، حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کرو۔ میری آنکھ اسی وقت کھل گئی اور اس عرضداشت کے چند شعر، جو اب طویل ہو گئی ہے، میری زبان پر جاری ہو گئے۔ انشاء اللہ ایک مثنوی فارسی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" نام کے ساتھ یہ عرضداشت شائع ہو گی۔ اب پہلے کی نسبت آواز صاف تر ہے اور اس میں وہ رنگ (Ring) عود کر رہا ہے جو انسانی آواز کا خاصہ ہے۔ گو اس ترقی کی رفتار بہت ست ہے۔"

مثنوی "پس چہ باید کرد اے قوم شرق" جس کے چند اشعار اوپر نقل ہوئے اقبال کی تاریخ ساز نظم ہے، جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنے عصر کے اہم آتشیں مسائل پر ان کا ذہنی رد عمل کتنا شدید اور برحق تھا۔ یہ وہ مسائل تھے جو انسانیت کی تباہی کے لیے اگلی منزل کی تشکیل کر رہے تھے۔ اس موقع پر بے محل نہ ہوگا اگر اس بارے میں گذشتہ برس کے ایک اہم واقعہ کی یہاں نشاندہی کر دی جائے جس نے اقبال کے ذہن میں ازحد ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ اگست ۱۹۳۵ء میں "مہذب یورپ" کا ایک بھیڑیا (اطالیہ) ایک معصوم بھیڑ (ابی سینیا) پر حملہ آور ہوا۔ نام نہاد مہذب یورپ کے ایک ملک کا افریقہ کے ایک غریب اور کمزور ملک پر یہ عریاں حملہ تھا۔ اقبال کا دل خون ہوگیا اور اس کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگے اور ان آنسوؤں نے ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کو ایک نظم بعنوان "ابی سینیا" کی شکل اختیار کر لی تھی، ملاحظہ کیجئے یہ نظم:

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہر ناک ابی سینیا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گُرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سر بازار پاش پاش
پیر کلیسا : یہ حقیقت ہے دلخراش

گول میز کانفرنس کا ماحصل انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی صورت میں سامنے آیا جس نے پہلے مرحلے میں ہندی صوبوں کو کچھ خود مختاری عطا کی اور بعدازاں دوسرے مرحلے میں مرکز میں کسی حد تک ذمے دار حکومت کے قیام کی پیش بینی کی۔ ہندی مسلمانوں کے لیے یہ وقت انتہائی انتشار و بدنظمی کا تھا۔ لندن کی ملاقاتوں میں اقبال مسٹر جناح کو ہند واپس آ کر کاروانِ ملّت کی قیادت کے لیے آمادہ کر چکے تھے۔ جب بعض اصحاب نے مسٹر محمد علی جناح سے ہندوستان واپس آ کر آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیمِ نَو کے لیے رسمی درخواست کی تو انہوں نے ان درخواستوں کو پذیرائی بخشتے ہوئے اس مشکل کام کا بیڑا اٹھایا اور مسلم لیگ کو جمہور کی جماعت بنانے اور پارلیمانی بورڈ تشکیل دے کر عام انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اس سلسلے میں مسٹر جناح پنجاب آئے اور یکم مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب یونی نسٹ پارٹی کے بانی میاں سر فضل حسین سے ملے جس نے مسٹر جناح سے تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر مسٹر جناح جاوید منزل میں اقبال کے پاس آئے۔ اقبال نے بصد خلوص و مسرت مسٹر جناح کا ساتھ دینے کا عہد کیا اور اس عہد کو اپنی فانی زندگی کی آخری سانسوں تک نبھایا۔ اقبال اور جناح کے پُرخلوص تعاون نے تاریخ کے اس فیصلہ کُن موڑ پر ہندی مسلمانوں کی آئندہ منزل کے تعیّن میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور میں مسٹر محمد علی جناح کی سرگرمیوں کے بارے میں اقبال ۲ مئی ۱۹۳۶ء کے تحریر کردہ مکتوب میں سید راس مسعود کو بتاتے ہیں، "پنڈت جواہر لال نہرو کا خط آیا تھا۔ آج کل مسٹر محمد علی جناح لاہور آئے ہوئے ہیں اور یہاں کی مختلف پولیٹیکل پارٹیوں میں اتحاد کی کوشش کر رہے ہیں۔"

مورخہ ۶ جون ۱۹۳۶ء کے تحریر کردہ مکتوب میں اقبال مولانا راغب احسن کو لکھتے ہیں :

"ڈیئر راغب احسن! آپ کا خط ابھی ملا۔ الحمدللہ کہ خیریت ہے۔ جو

کچھ آپ نے لکھا ہے، سب کچھ میرے خیال میں ہے۔ بلکہ ایک بیان لکھا ہوا موجود ہے جسے میں اخبارات میں بھیجنا چاہتا تھا، مگر اس خیال سے معرض التواء میں ڈال دیا کہ یہ بیان زیادہ تفصیل کے ساتھ پارلیمنٹری بورڈ کی طرف سے شائع ہو۔ مسٹر جناح غالباً کل آئیں گے۔ آپ نے اچھا کیا جو ان کو خط لکھ دیا۔ امید ہے ان کو آپ کا خط مل گیا ہو گا۔"

مسٹر جناح کے کشمیر سے واپس آنے پر ۸ جون ۱۹۳۶ء کو لاہور میں مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کا پہلا مشترکہ اجلاس برکت علی اسلامیہ ہال میں ہوا۔ اس موقع پر اقبال کا متذکرہ بالا بیان ایسوسی ایٹڈ پریس آف انڈیا کی معرفت اخبارات میں شائع ہوا۔

اقبال، درحقیقت مستقبل قریب کی جدوجہد آزادی میں پنجاب کے فیصلہ کُن کردار کے بارے میں بڑے حساس تھے، مگر وہ پنجاب کے مسلمانوں کی پسماندگی اور جہالت سے ازحد پریشان تھے جنہیں سامراجی حکومت کے پٹھو جاگیرداروں نے اپنے آہنی پنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ اپنے اس احساس کے بارے میں انہوں نے ۲۷ ستمبر ۱۹۳۶ء کو مولوی عبدالحق کے نام مکتوب میں یہ تاریخی جملے لکھے:

"مسلمانوں کو اپنے تحفظ کے لیے جو لڑائیاں آئندہ لڑنا پڑیں گی ان کا میدان پنجاب ہو گا۔ پنجابیوں کو اس میں بڑی بڑی دقتیں پیش آئیں گی۔ کیونکہ اسلامی زمانہ میں یہاں کے مسلمانوں کی مناسب تربیت نہیں کی گئی۔ مگر اس کا کیا علاج کہ آئندہ رزم گاہ یہی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔"

یکم اگست ۱۹۳۶ء کو ضرب کلیم چھپ کر آ جاتی ہے اور اسی روز اس کے چھ خاص مجلّد نسخے بھوپال روانہ کر دیے جاتے ہیں، اس بارے میں اقبال رقم طراز ہیں:

"ڈیئر مسعود، آج میرے منشی طاہر دین آپ کی خدمت میں ضرب کلیم کی چھ مجلد کاپیاں ارسال کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک کاپی آپ کی ہے اور باقی خاندان شاہی کے لیے۔"

اپنے علمی مشاغل کے بارے میں سید سلیمان ندوی کو ۷ اگست ۱۹۳۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"مخدومی، السلام علیکم! والا نامہ ابھی ملا ہے۔ آپ کی صحت کی خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ خدا تعالیٰ آپ کو دیر تک زندہ و سلامت رکھے۔ میری صحت کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہے، گو آواز میں کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی۔ انشاء اللہ موسم سرما میں وہ انگریزی کتاب لکھنا شروع کروں گا جس کا وعدہ میں نے اعلیٰ حضرت نواب صاحب بھوپال سے کر رکھا ہے۔ اس میں آپ کے مشورہ کی ضرورت ہے۔ بدور البازغہ بھی اسی مطلب کے لیے منگوائی ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر قوانین اسلام پر بحث ہوگی کہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے متعلق جو جو کتب آپ کے ذہن میں ہیں مہربانی کرکے ان کے ناموں سے مجھے آگاہ فرمایئے اور یہ بھی فرمایئے کہ کہاں کہاں سے دستیاب ہوں گی۔

الحمدللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال علماء کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔ اگر آپ کی صحت اجازت دے تو آپ بھی اس پر ایک جامع و نافع بیان شائع فرمایئے۔ میں بھی تیسرا بیان انشاء اللہ جلد لکھوں گا۔ اس کا موضوع ہوگا 'بروز'۔"

قانون ہند ۱۹۳۵ء کے پہلے مرحلے کے نفاذ اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کی آمد آمد کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں تیز ہوگئی تھیں۔ اقبال اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے کنارے پر رہ کر ہی سیاسی عمل میں حصہ لے سکتے تھے۔ ان کی مفکرانہ بصیرت نے ان پر واضح کر دیا تھا کہ مستقبل کی سیاست میں 'پنجاب' کو ازحد اہمیت حاصل ہوگی۔ تاریخ کے اس نازک سیاسی موڑ پر مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے ان کی جو خط و کتابت ہوئی، وہ تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ اس سے اقبال کے تاریخ ساز مفکرانہ سیاسی کردار کا اظہار ہوتا ہے۔ پنجاب مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اہم خدمات انجام دیں۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں بھی وہ آخری بار شریک ہوئے۔ لیکن وہ خود کچھ پڑھنے سے معذور تھے۔ البتہ ان کی نظم "نغمہ سرمدی" (خودی کا سر نہاں، لا الہ الا اللہ) دو نوجوانوں (محمد صدیق، محمد امین) نے ترنم سے پیش کیا اور ایک سماں باندھ دیا۔

اسلام اور سوشلزم کے بارے میں خواجہ غلام السیدین کے نام ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۶ء کے مکتوب میں لکھتے ہیں :

"سوشلزم کے معترف ہر جگہ روحانیت کے مذہب کے مخالف ہیں اور اس کو افیون تصور کرتے ہیں۔ لفظ افیون اس ضمن میں سب سے پہلے کارل مارکس نے استعمال کیا تھا۔ مَیں مسلمان ہوں، اور انشاء اللہ مسلمان مروں گا۔ میرے نزدیک تاریخ انسانی کی مادی تعبیر سراسر غلط ہے۔ روحانیت کا مَیں قائل ہوں، مگر روحانیت کے قرآنی مفہوم کا، جس کی تشریح مَیں نے اپنی تحریروں میں جابجا کی ہے اور سب سے بڑھ کر اس فارسی مثنوی میں جو عنقریب آپ کو ملے گی۔ جو روحانیت میرے نزدیک مغضب ہے، یعنی افیونی خواص رکھتی ہے، اس کی تردید مَیں نے جابجا کی ہے۔ باقی رہا سوشلزم، سو اسلام خود ایک قسم کا سوشلزم ہے جس سے مسلمان سوسائٹی نے آج تک بہت کم فائدہ اٹھایا ہے۔"

اقبال کی نَو تخلیق مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" مع "مسافر" (سفر افغانستان) نومبر ۱۹۳۶ء میں شائع ہوگئی۔ "ابلیس کی مجلس شوریٰ" اردو نظم انہی ایام میں تخلیق ہوئی اور "ارمغان حجاز" اقبال کے آخری مجموعہ کلام میں شامل ہوئی۔

۱۹۳۷ء

اقبال کی زندگی کا یہ سال ملک و ملّت کی تاریخ میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ صحت کے اعتبار سے انہیں ہر قسم کی سرگرمی سے سبکدوش ہو کر آرام اور صرف آرام کی ضرورت تھی۔ ان کی بینائی حد درجہ کمزور ہو رہی تھی اور معالجوں نے لکھنے پڑھنے سے منع بھی کر دیا تھا (چنانچہ اب وہ اکثر خطوط اپنے قلم سے لکھنے کی بجائے دوسروں سے لکھواتے تھے) لیکن قومی مستقبل کی فکر نے انہیں مضطرب و بے چَین کر رکھا تھا۔ دوسری طرف اُنہیں اپنی زندگی مستعار کا پیمانہ مختصر ہوتا نظر آ رہا تھا، اور سفر آخرت سے پہلے دیار محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت اُن کے دل کو تڑپا رہی تھی۔ اپنے بچوں کی نگہداشت کی فکر اور سرپرستوں کے بارے میں وصیت اسی تیاری کا حصہ تھی۔ تخلیقی فکر جامۂ عمل پہن رہی تھی ("ارمغان حجاز" کا کلام زیر تالیف تھا)۔

اور قومی مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں گردو پیش کی عصری سیاست (خصوصاً پنجاب کا پیچیدہ مسئلہ جسے اقبال خطے میں بڑی اہمیت دیتے تھے) سے لے کر عالم اسلام کی آزادی و اتحاد، اور عالم انسانی کی نجات کے مسائل پر ان کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے کم سن بچوں (جاوید اور منیرہ) کی طرح ملک و ملت کی آزادی و نگہداشت کے لیے بھی کسی قابل اعتماد سرپرست کو مقرر کرکے ذمے داری کے اُس بوجھ سے سبکدوش ہونا چاہتے ہوں جو خالق کائنات نے بطور ایک مفکر اور شاعر رحمانی انہیں سونپا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح (قائداعظم) کے نام اقبال کے مکتوبات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ان کے اندرونی ہیجان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ پنجاب میں احیائے دین و ملّت کے لیے چودھری نیاز علی نے سرنا (پٹھان کوٹ کے نواح) میں ایک ادارہ "دارالسلام" قائم کرنا چاہا تو اس کے لیے شیخ الازہر سے اس ادارے کے لیے کسی موزوں سکالر کی خدمات کی فرمائش کی گئی۔

اقبال کے فکر و احساس کی یہ صورتیں اب انہی کے الفاظ میں چند مکتوبات میں دیکھیے۔ ذیل کے تین مکتوبات جو ۱۵ جنوری، ۸ جون اور ۱۰ جون ۱۹۳۷ء کو انہوں نے اپنے دوست اور محب سید راس مسعود کے نام لکھے، (سر راس مسعود ۳۰ جولائی ۱۹۳۷ء کو وفات پا گئے۔ اقبال نے اپنے دوست کی وفات پر مرثیہ لکھا جو ارمغان حجاز میں شامل ہوا):

(I) "ڈیئر مسعود، ابھی تمہارا خط ملا۔ کیا خوب: مَیں گذشتہ رات علی بخش سے کہہ رہا تھا کہ مسعود کا خط کئی دن سے نہیں آیا۔ فکرو تردد ہے۔ آج دوپہر کو تمہارا خط مل گیا۔ الحمدللہ۔ میری صحت دن بدن ترقی کر رہی ہے۔ آواز میں بھی فرق آرہا ہے۔ انشاء اللہ دربار رسالتؐ میں جو کچھ مَیں نے عرض کیا ہے قبول ہو گا۔ امسال دربار حضورؐ میں حاضری کا قصد تھا مگر بعض موانع پیش آگئے۔ انشاء اللہ امید کہ سال (آئندہ) حج بھی کروں گا اور دربار رسالتؐ میں بھی حاضری دوں گا اور وہاں سے ایک ایسا تحفہ لاؤں گا کہ مسلمانان ہند یاد کریں گے.....

لاہور میں الیکشن کی گرم بازاری ہے۔ پنجاب میں الیکشن کے سلسلے میں اب تک دو قتل کی وارداتیں ہو چکی ہیں۔ سرحد پر بھی جنگ اور قصہ وہی مسجد شہید گنج کا۔"

(محررہ ۱۵ جنوری ۱۹۳۷)

(II) "جاوید اور منیرہ کی نگہداشت کے لیے اور گھر کے عام انتظام کے لیے، جو ایک مدت سے بگڑا ہوا ہے، مَیں نے فی الحال آزمائشی طور پر علی گڑھ سے ایک جرمن خاتون کو جو اسلامی معاشرت سے واقف ہے اور اردو بول سکتی ہے، بلوایا ہے۔ پروفیسر رشید صدیقی اور دیگر احباب نے اس کی شرافت کی بہت تعریف کی ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض ادا کرنے میں کامیاب ہو گی تو مجھے بے فکری ہو جائے گی۔ جاوید کی عمر اس وقت قریباً تیرہ سال ہے اور منیرہ کی قریباً سات سال۔ ماں کی موت سے ان کی تربیت میں بہت نقص رہ گئے ہیں۔ اسی واسطے میں نے مذکورہ بالا انتظام کیا ہے۔"

(محررہ ۸ جون ۱۹۳۷ء)

(III) "مَیں نے جاوید اور منیرہ کے چار Guardian مقرر کیے تھے۔ یہ Guardian ازروئے وصیت مقرر کیے گئے تھے جو سب رجسٹرار لاہور کے دفتر میں محفوظ ہے... نمبر ۳ شیخ اعجاز احمد میرا بھتیجا ہے۔ نہایت صالح آدمی ہے لیکن خود بہت عیالدار ہے اور عام طور سے لاہور سے باہر رہتا ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ اس کی جگہ تم کو Guardian مقرر کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔"

(محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء)

مکتوب بنام ماسٹر عبد اللہ چغتائی، محررہ ۱۳ جون ۱۹۳۷ء :

"میری صحت بہ نسبت سابق بہتر ہے، لیکن بہ حیثیت مجموعی ایک دائم المریض کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ تاہم صابر اور شاکر ہوں۔ انشاء اللہ جب موت آئے گی تو مجھے متبسم پائے گی۔ قصد تو یہ تھا کہ زندگی کے باقی دن جرمنی اور اٹلی میں گزار دوں، مگر بچوں کی تربیت کس پر چھوڑوں، خصوصاً جب کہ مَیں ان کی مرحوم ماں سے یہ عہد کر چکا ہوں کہ جب تک بالغ نہ ہو جائیں ان کو اپنی نظر سے اوجھل نہ کروں۔ ان حالات میں یورپ کا سفر اور وہاں کی اقامت ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ اگر توفیق الٰہی شامل حال رہی تو زیادہ سے زیادہ مکّہ ہوتا ہوا ممکن ہے مدینہ تک پہنچ سکوں۔ اب مجھ جیسے گنہ گاروں کے لیے آستان رسالتؐ کے سوا اور کہاں جائے پناہ ہے۔"

"دنیائے اسلام میں ایک ذہنی انقلاب کے آثار پیدا ہیں۔ مگر یہ قومیں ابھی تک اپنی سیاسی اور اقتصادی مشکلات میں الجھی ہوئی ہیں۔ ان مشکلات کے خاتمے پر ذہنی انقلاب کا آغاز یقینی ہے، اور اس وقت تک امید ہے کہ ایسے آدمی پیدا ہو جائیں گے جو اس انقلاب کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔ آپ اپنے خط میں لکھتے ہیں کہ یورپ میں ابھی جنگ نہ ہو گی۔ یہاں کے اخباروں میں جو خبریں شائع ہوتی ہیں ان سے تو معلوم ہوتا ہے کہ عنقریب یورپ میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھنے والی ہے۔

یورپ کی قوموں نے ایک اعلیٰ کلچر کی بنیاد رکھی ہے مگر افسوس کہ ان کا عمل اس کلچر کے مقتضیات کے خلاف ہے۔ اس واسطے اغلب ہے کہ یہ کلچر بیکار ہو کر یورپ میں فنا ہو جائے گا۔"

(بلا تاریخ، مگر پہلے خط کے بعد کسی وقت لکھا گیا۔)

ذیل کا مکتوب سر اکبر حیدری کے نام ۱۳ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا جو اقبال کی اس وقت کی کچھ ذہنی و جذباتی کیفیات کا عکاس ہے:

"مائی ڈیئر سر اکبر، لندن سے آپ کا مکتوب میرے لیے خوشگوار حیرت لایا، کیونکہ مَیں اپنے اپریل کے مکتوب کے کسی جواب کی توقع نہیں رکھتا تھا۔ یہ معلوم ہو کر بہت اطمینان ہوا کہ آپ میرے مکتوبات محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکن مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مَیں آپ کی شفقت اور ہمدردی کو اس سے کہیں زیادہ قابل قدر سمجھتا ہوں جتنی بڑی فراخدلی سے آپ میرے خطوط کو اہمیت دیتے ہیں۔

سال کے اس مرحلے پر انگلستان کا موسم لازماً بہت اچھا ہو گا اور مجھے امید ہے کہ یہ آپ کی صحت پر بہت خوشگوار اثرات ڈالے گا جس کی ان لوگوں کو بے حد ضرورت ہے جن کی آپ نے زندگی بھر خدمت کی ہے۔ رہا مَیں، تو مَیں یورپ سے سیر ہو چکا ہوں۔ وہاں کی شدید سردی نے ایک معذور شخص کی سی زندگی میرا مقدر کر دی ہے، جسے مَیں گذشتہ تین سال سے بسر کر رہا ہوں۔ بعض احباب نے علاج کے لیے جرمنی اور آسٹریا جانے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن مَیں سمجھتا ہوں کہ وہاں کے اخراجات میری استطاعت سے باہر ہوں گے۔ مزید برآں، یہ بات میرے بچوں کے ساتھ زیادتی کے

مترادف ہوگی کہ عمر کے ان ڈھلتے ہوئے سایوں میں جب کہ میری زندگی کا کام عملاً انجام کو پہنچ چکا ہے، مَیں اپنی ذات پر اس قدر خرچ کروں۔ تنہا خواہش جو ہنوز میرے جی میں خلش پیدا کرتی ہے، یہ رہ گئی ہے کہ اگر ممکن ہو تو حج کے لیے مکّہ جاؤں اور وہاں سے اس ہستی کے روضے پر حاضری دوں جس کا ذات الٰہی سے بے پایاں شغف میرے لیے وجہ تسکین اور سرچشمہ الہام رہا ہے۔ میری جذباتی زندگی کا سانچہ کچھ ایسا واقع ہوا ہے کہ انفرادی شعور کی ابدیت پر مضبوط یقین رکھے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہوسکا۔ یہ یقین مجھے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے حاصل ہوا ہے۔ میرا ہر بن مو آپ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہے اور میری روح ایک بھرپور اظہار کی طالب ہے جو صرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مقدس پر ہی ممکن ہے۔ اگر خدا نے مجھے توفیق بخشی تو میرا حج اظہار تشکر کی ایک شکل ہوگی۔"

گذشتہ سال (۱۹۳۶ء) قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے صوبائی عام انتخابات کے سلسلے میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کا بیڑا اٹھایا۔ پنجاب میں اقبال نے ان کا پورا پورا ساتھ دیا، اور پارلیمانی بورڈ کی تشکیل اور مسلم لیگ کے قیام و استحکام میں سرگرم ہوئے (پنجاب میں اس وقت تک مسلم لیگ کا وجود ڈرائنگ روم سیاست تک محدود تھا) مسلم لیگ نے پنجاب کے صوبائی انتخابات میں ۸۶ مسلم نشستوں میں سے فقط سات نشستوں پر مقابلہ کیا اور صرف دو نشستیں حاصل کیں، لیکن یہ آغاز تھا اس تاریخی نیک انجام کا جو آگے چل کر مطالبہ پاکستان (۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء) اور پھر ظہور پاکستان (۱۴ اگست ۱۹۴۷ء) پر پہنچا۔ اس زمانے میں اقبال کے تاریخ ساز کردار کے بارے میں ان کے وہ مشورے دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں جو انہوں نے انتخابات کے بعد (۱۹۳۷ء میں) مسٹر جناح کو دیے۔ یہ وہ موقع تھا جب انڈین نیشنل کانگرس کو انتخابات میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، اور اس کامیابی کے زعم میں کانگرس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو نے صوبائی مجالس قانون ساز کے کانگرسی اراکین کے آل انڈیا کنونشن (منعقدہ دہلی ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء) میں ہندوستانی مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور صرف اقتصادی مسئلے ہی کو ملک کا اصل

مسئلہ قرار دیا — اس سے قبل انتخابات کے موقع پر کلکتہ میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے یہ بڑ ہانکی تھی کہ "ہندوستان میں آج صرف دو فریق موجود ہیں، یعنی کانگرس اور برطانوی حکومت" جس پر مسٹر جناح کو یہ کہنا پڑا تھا کہ "ہندوستان میں دو نہیں، تین فریق ہیں، کانگرس، برطانوی حکومت اور مسلمان!" اس پس منظر میں ہند کا سیاسی مسئلہ انتہائی نازک مرحلے میں داخل ہوگیا تھا۔

اس نازک مرحلے پر رواں صدی کی تاریخ کے دو ازحد اہم مسائل اقبال کے ذہن کو مضطرب کیے ہوئے تھے۔ اول، اس برصغیر میں ہندی مسلمانوں کے مستقبل کا مسئلہ، دوم، فلسطین کا مسئلہ، جبکہ شاہی کمیشن اپنی رپورٹ میں فلسطین کی تقسیم کی سفارش کرچکا تھا۔ یہاں اس دوسرے مسئلے کو پہلے لیا جاتا ہے (فلسطین کے آتشیں مسئلے پر اقبال نے اپنے گذشتہ برس کے شعری مجموعے "ضرب کلیم" میں بھی خصوصی توجہ دی تھی)۔

نیشنل لیگ آف انگلینڈ کی چیئرپرسن مس مارگریٹ فارقوہرسن کے نام ۲۰ جولائی ۱۹۳۷ء کے مکتوب میں اقبال فلسطین کے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مَیں بدستور بیمار ہوں۔ اس لیے فلسطین رپورٹ پر اپنی رائے اور وہ عجیب و غریب خیالات اور احساسات تفصیل سے تحریر نہیں کرسکتا جو اس رپورٹ نے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں بالخصوص اور ایشیائی مسلمانوں کے دلوں میں بالعموم پیدا کیے ہیں یا پیدا کرسکتی ہے۔ میرے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ نیشنل لیگ آف انگلینڈ وقت شناسی کا ثبوت دے اور اہل برطانیہ کو عربوں کے خلاف ناانصافی کے ارتکاب سے بچالے، جن سے برطانوی سیاست دانوں نے اہل برطانیہ کے نام سے حتمی وعدے کیے تھے۔ طاقت کا سرچشمہ فہم و فراست ہے۔ جب طاقت عقل و دانش کو پس پشت ڈال کر محض اپنی ہی ذات پر بھروسہ کرلیتی ہے تو نتیجہ خود طاقت کا خاتمہ ہوتا ہے۔

مصر کے پرنس محمد علی نے ایک معقول تعمیری تجویز پیش کی ہے جو ہر طرح اہل برطانیہ کی توجہ کے لائق ہے۔ ہمیں یہ کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ فلسطین انگلستان کی کوئی ذاتی جاگیر نہیں۔ فلسطین تو انگلستان کے پاس جمعیتہ الاقوام کی طرف سے زیر انتداب ہے۔ اور مسلم ایشیا اب لیگ آف نیشنز کو اینگلو فرنچ استعمار پرستوں کا ایک

ایسا ادارہ سمجھتا ہے جسے انہوں نے کمزور مسلم سلطنتوں کے علاقوں کی باہمی تقسیم کے لیے وضع کر رکھا ہے۔ نہ ہی فلسطین پر یہودیوں کا کوئی حق ہے جنہوں نے اس ملک کو رضامندانہ طور پر، عربوں کے فلسطین پر قابض ہونے سے صدیوں پہلے، خیرباد کہہ دیا تھا۔ نہ ہی صیہونیت کوئی مذہبی تحریک ہے۔ علاوہ اس امر کے کہ مذہبی یہودیوں کو صیہونیت سے کوئی دلچسپی نہیں، خود فلسطین رپورٹ نے اس بات کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ فلسطین رپورٹ کو منصفانہ نظر سے دیکھنے والے کے دل میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ تحریک صیہونیت کا آغاز یہودیوں کے لیے ایک قومی وطن مہیا کرنے سے کہیں زیادہ برطانوی استعمار کے لیے بحیرہ روم میں ایک ساحلی کنارہ حاصل کرنے کے لیے ہوا تھا۔

بحیثیت مجموعی رپورٹ کا منشا مقامات مقدسہ کا بہ جبر، مستقل انتداب کی صورت میں جو کمیشن نے برطانوی استعماری ہوس کی پردہ پوشی کے لیے وضع کیا ہے، عربوں سے خرید لینا ہے۔ اس خرید و فروخت کی قیمت عربوں کے لیے تھوڑا سا روپیہ اور ان کی سخاوت و مردانگی کا ایک قصیدہ اور یہودیوں کا ایک علاقے پر قبضہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین عربوں کے خلاف صریح عناد کی پالیسی سے دست کش ہو کر اُن کا ملک اُن کے حوالے کر دیں گے۔ مجھے یہ بھی امید ہے کہ عرب انگریزوں اور بشرط ضرورت فرانسیسیوں سے بھی مصالحت کے لیے تیار ہوں گے۔ اگر پروپیگنڈے کے زور سے اہل برطانیہ کو عربوں کے خلاف دھوکہ دیا گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ موجودہ حکمت عملی کے نتائج خطرناک ثابت ہوں گے۔"

اس مکتوب کے ایک ہفتہ بعد ۲۷ جولائی کو جب مسلمانان ہند نے یوم فلسطین منایا، تو اقبال نے فلسطین کے مسئلے پر مندرجہ ذیل بیان جاری کیا:

"مجھے نہایت افسوس ہے کہ مَیں اس جلسہ عام میں جو مسلمانان لاہور آج فلسطین رپورٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی غرض سے منعقد کر رہے ہیں، شمولیت سے قاصر ہوں۔ لیکن مَیں مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورت حالات سے واقف کسی شخص کو ہو سکتا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ اہل برطانیہ

کو اب بھی اس وعدہ کے ایفا پر مائل کیا جاسکتا ہے جو انگلستان کی طرف سے عربوں سے کیا گیا تھا۔ مجھے مسرت ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے اپنی ایک تازہ بحث میں ملک معظم کی حکومت کے فیصلے پر نظرثانی کرتے ہوئے مسئلہ تقسیم فلسطین کو غیر منفصل چھوڑ دیا ہے۔ یہ فیصلہ مسلمانان عالم کو ایک موقع بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت کے ساتھ اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ، جس کا حل برطانوی سیاست دان تلاش کر رہے ہیں، محض قضیہ فلسطین ہی نہیں، بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا۔

مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود کا تو تیرہ صدیاں ہوئیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل خاتمہ ہوچکا تھا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا، بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادے سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا۔ مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا۔ زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے 'پیٹر دی ہرمٹ' کی ہستی ہی کو محل اشتباہ قرار دے دیا ہے۔ بالفرض اگر یہ اعتراف بھی کر لیا جائے کہ حروب صلیبیہ فلسطین کو عیسائیوں کا مسئلہ بنانے کی کوشش تھی تو اس کوشش کو صلاح الدین کی فتوحات نے ناکام بنا دیا تھا۔ لہٰذا ئیں فلسطین کو خالص اسلامی مسئلہ سمجھتا ہو۔ مشرق قریب کے اسلامی ممالک سے متعلق برطانوی سامراجی ارادے کبھی بھی اس طرح بے نقاب نہ ہوئے تھے جیسے رائل کمیشن کی رپورٹ نے انہیں رُسوا کر دیا ہے۔ فلسطین میں یہود کے لیے ایک قومی وطن کا قیام تو محض ایک حیلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برطانوی امپریلزم مسلمانوں کے مقامات مقدسہ میں مستقل انتداب اور سیادت کی شکل میں اپنے لیے ایک مقام کی متلاشی ہے۔ بقول ایک رُکن پارلیمنٹ کے یہ ایک خطرناک تجربہ ہے اور اس سے برطانوی مسئلہ کا بحیرۂ روم کا حل میسّر نہیں آتا۔ برطانوی مدبرین کو جاننا چاہیے کہ برطانوی امپریلزم کی مشکلات کا حل تلاش کرتے کرتے وہ برطانوی امپریلزم کے لیے ایک مصیبت برپا کر رہے ہیں۔ ارض

مقدس بشمول مسجد عمر کی فروخت مارشل لاء کی دھمکی کے ماتحت، جس کے ساتھ ساتھ عربوں کی مروت و سخاوت کا قصیدہ بھی پڑھا گیا ہے، برطانوی سیاست کا کارنامہ نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے دیوالیہ پن کا ماتم ہے۔

یہودیوں کو زرخیز زمین کا علاقہ اور عربوں کے لیے پتھریلی اور بنجر زمین کا عطیہ اور کچھ نقدی کوئی سیاسی دانائی نہیں۔ یہ تو برطانوی تدبر کی شان سے گرا ہوا ایک نہایت ہی کمینہ سودا ہے جو اس نامور قوم کے لیے باعث ندامت ہے جس کے نام پر عربوں سے آزادی اور اتحاد کے قطعی وعدے کیے گئے تھے۔

میرے لیے ناممکن ہے کہ اس مختصر بیان میں فلسطین رپورٹ کی تفاصیل سے اور تازہ تاریخی حالات سے جن کی بنا پر یہ معرض ظہور میں آئی، بحث کرسکوں۔ یہ رپورٹ مسلمانان ایشیا کے لیے بڑی بڑی عبرتوں اور اسباق کی آئینہ دار ہے۔ تجربے نے اس امر کو بہ تکرار واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد مکرّر پر موقوف ہے۔ ترکوں کو دنیائے اسلام سے علیحدہ کر دینے کی حکمت عملی ابھی تک جاری ہے۔ گاہے گاہے اب بھی یہ صدا بلند ہوتی ہے کہ ترک تارک اسلام ہو رہے ہیں۔ ترکوں پر اس سے بڑا بُہتان نہیں باندھا جاسکتا۔ اس شرارت آمیز پروپیگنڈے کا شکار وہی لوگ ہوسکتے ہیں جو تاریخ تصورات فقہ اسلامی سے نابلد ہیں۔

عربوں کو، جن کا شعور مذہبی ظہور اسلام کا موجب بنا اور جس نے ایشیا کی مختلف اقوام کو ایک حیرت انگیز کامیابی کے ساتھ متحدہ کر دکھایا، ترکوں سے ان کی مصیبت کے زمانے میں غداری کے نتائج سے غافل نہ رہنا چاہیے۔ دوسرے، عربوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ان عرب بادشاہوں کے مشورے پر، خواہ وہ کتنے ہی طاقتور کیوں نہ ہوں، مگر وہ مسئلہ فلسطین پر ایک آزادانہ اور دیانتدارانہ فیصلے سے قاصر ہیں، بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ عربوں کا فیصلہ پورے غور و خوض کے بعد ایک آزادانہ فیصلہ ہونا چاہیے جس کے لیے انہیں مسئلہ زیر بحث کے پہلوؤں پر پوری پوری ضروری معلومات میسر ہونی چاہئیں۔

تیسرے، موجودہ وقت ایشیا کے غیر عرب آزاد اسلامی ملکوں کے لیے بھی ابتلا و

آزمائش کا دَور ہے۔ کیونکہ تنسیخ خلافت کے بعد مذہبی اور سیاسی نوعیت کا یہ پہلا نازک بین الاقوامی مسئلہ ہے جو تاریخی قوتیں اُن کے سامنے لا رہی ہیں۔ مسئلہ فلسطین کے امکانات ممکن ہے مسلمانوں کو اس متحدہ اینگلو فرنچ ادارے کی، جسے غلط طور پر جمعیتہ الاقوام (لیگ آف نیشنز) کا لقب دیا گیا ہے، رکنیت کی حیثیت پر سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبورکر دیں اور ایک مشرقی جمعیتہ الاقوام کے قیام و ترتیب پر عملی ذرائع تلاش کرنے پر وہ آمادہ ہو جائیں۔"

یہی بات اقبال نے ایک سال قبل "ضربِ کلیم" کے ایک شعر میں بھی کہی تھی:

تہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا
شاید کہ کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے پہلے صوبائی انتخابات میں انڈین نیشنل کانگرس نے ہندو اکثریت کے چھ صوبوں میں غالب اکثریت سے کامیابی حاصل کی، مگر مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگرس کو سخت ناکامی سے دو چار ہونا پڑا۔ اس کامیابی پر صدر کانگرس پنڈت جواہر لال نہرو کا دماغ اونچی ہواؤں میں پرواز کرنے لگا اور انہوں نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء کو دہلی میں ایک آل انڈیا کنونشن بلائی جس میں کانگرسی ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے ارکان اسمبلی مدعو کیے گئے۔ کنونشن میں پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں ہندی مسلمانوں کے بارے میں مندرجہ ذیل نکات اٹھائے:

۱۔ ہم اب تک کمیونل مسئلے کو حل کرنے کے لیے مسلم رہنماؤں سے بات چیت کرتے رہے اور مسلم جمہور کو نظرانداز کیا۔

۲۔ مسلمان کوئی الگ قوم نہیں۔ یہ خیال قرون وسطیٰ کی باقیات میں سے ہے۔

۳۔ اصل مسئلہ اقتصادی ہے۔ جب غربت، بے روزگاری اور قومی آزادی کا سوال سامنے آتا ہے تو اس میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی وغیرہ کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

۴۔ مسلم عوام آج کانگرس کی کامیابی دیکھ کر ازحد مایوسی کا احساس کر رہے ہیں۔ وہ اپنے ہم وطنوں کی خوشیوں میں شریک ہونا اور مسرتوں کو بانٹنا چاہتے ہیں۔

یہ نکات پیش کرتے ہوئے آخر میں پنڈت جی نے یہ فیصلہ دیا کہ مسلمانوں کو مفتوح کرنے کے لیے ایک رابطہ مسلم عوام تحریک شروع کی جائے گی۔

اقبال پہلے مسلمان تھے جنہوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ فوری طور پر اس چیلنج کا نوٹس لیا اور پنڈت نہرو کی تقریر پڑھتے ہی فی الفور مسٹر محمد علی جناح کے نام (۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو) ایک مفصّل مکتوب لکھا اور اس خطرناک رجحان سے انہیں آگاہ کیا — پھر اس مسئلے پر اقبال اور جناح کے مابین خط و کتابت کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔

اقبال اور جناح کی یہ مراسلت جہاں تاریخ کے ایک نازک ترین دَور کی دستاویزی شہادت ہے، وہاں اقبالؒ کے ذہن و فکر کی بھی عکاسی کرتی ہے جو اس صورت حال میں ملّتِ اسلامیہ کی رہنمائی اور ہند کے سیاسی مسئلے کے پُرامن حل کی نشاندہی کرتی ہے۔

اقبال کے یہ مکتوبات جو ۱۹۴۳ء میں قائداعظم محمد علی جناح کے پیش لفظ کے ساتھ شائع ہوئے آگے درج کیے جا رہے ہیں۔ منتخب مکاتیب کے اردو ترجمے سے قبل قائداعظم کے پیش لفظ کا اردو ترجمہ بھی دیا جا رہا ہے، تاکہ ان مکاتیب کی عصری و تاریخی اہمیت واضح ہو جائے۔

مکاتیب اقبال، جناح کے نام

پیش لفظ از ایم۔ اے جناح

"یہ کتابچہ ان مکاتیب پر مشتمل ہے جو اسلام کے قومی شاعر، فلسفی اور عارف ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم نے میرے نام مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں اپنی وفات سے کچھ ماہ قبل تحریر کئے تھے۔ یہ دور جو جون ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام اور اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ کے تاریخی اجلاس کے عرصے تک محیط ہے، مسلم ہند کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ نے اپنی صوبائی شاخوں کے ساتھ مسلم لیگ کی طرف

سے یہ پہلی عظیم کوشش کی کہ مسلم رائے عامہ کے ذریعے قانون ہند ۱۹۳۵ء کے تحت صوبائی مجلس قانون ساز کے لئے لیگ کے ٹکٹ پر آئندہ انتخابات میں حصہ لیا جائے تو لکھنؤ اجلاس اس امر کی نشاندہی کا باعث بنا کہ پہلے مرحلے میں مسلم لیگ کی عوامی سطح پر تنظیم نو ہونی چاہیے، اور یہ کہ مسلم لیگ ہی ہند کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار جماعت ہے۔ ان دونوں اعلیٰ مقاصد کے حصول میں مَیں اپنے جن بہت سے دوستوں کے انمول تعاون، حب الوطنی، پُرخلوص کوششوں اور بے غرض مساعی کی بدولت کامیاب ہو سکا ان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی شامل ہیں۔ اس مختصر عرصے میں مسلم لیگ کافی قوت پکڑ گئی۔ ہر صوبے میں جہاں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ قائم ہوا اور مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہوئیں، ہم نے ساٹھ سے ستر فی صد نشستیں حاصل کیں، جن پر مسلم لیگی امیدواروں نے انتخاب لڑا تھا۔ تقریباً ہر صوبے میں مدراس کے دور دراز گوشے سے لے کر شمال مغربی سرحدی صوبے تک مسلم لیگ کی سینکڑوں ضلعی اور ابتدائی شاخیں قائم ہو گئیں۔

کانگرس نے نام نہاد مسلم رابطہ عوام تحریک چلائی تاکہ مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو اور مسلم لیگ خوفزدہ ہو کر اس کی تابع فرمان ہو جائے۔ مسلم لیگ نے اس (کانگرسی تحریک) پر ضرب کاری لگائی۔ مسلم لیگ متعدد ضمنی انتخابات میں کامیاب ہوئی اور ان لوگوں کی فتنہ پردازیوں اور سازشوں کو ختم کر دیا جو یہ تاثر دینے کی توقع رکھتے تھے کہ مسلم لیگ کو مسلمان عوام کی حمایت حاصل نہیں۔

لکھنؤ اجلاس سے اٹھارہ ماہ پہلے مسلم لیگ ایک اعلیٰ اور ترقی پذیر پروگرام کی حامل جماعت کی حیثیت سے مسلمانوں کو منظم کرنے میں کامیاب ہوئی، اور وہ صوبے بھی اس کے زیر اثر آ گئے جن تک قلت وقت کے سبب یا لیگ پارلیمانی بورڈوں کی ناکافی سرگرمیوں کے باعث بہتر طور پر رسائی نہ ہو سکی تھی۔ لکھنؤ اجلاس نے اس مقبولیت کی صریح شہادت فراہم کر دی جو مسلم لیگ کو مسلمانوں کی تمام جماعتوں اور گروہوں میں حاصل تھی۔

یہ مسلم لیگ کی نہایت شاندار کامیابی تھی کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریتی اور اقلیتی صوبوں نے قبول کر لیا، اور اسے اس کامیابی تک پہنچانے میں ڈاکٹر سر محمد اقبال

نے بڑا کردار ادا کیا، اگرچہ عوام کو اس وقت اس کا علم نہ ہو سکا۔ سکندر جناح معاہدے کے بارے میں ان کے کچھ اپنے خدشات تھے۔ وہ اس پر عمل درآمد اور اس کے نمایاں نتائج کو جلد از جلد دیکھنا چاہتے تھے، تاکہ اس کے متعلق عوام کے شکوک و شبہات دُور ہو سکیں۔ لیکن افسوس، وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ پنجاب نے قابل ذکر ترقی کر لی ہے اور اب اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان ثابت قدمی سے مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ان مکاتیب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ تاہم مجھے اس بات کا بہت افسوس ہے کہ اقبال کے مکتوبات کے جواب میں میرے مکتوبات دستیاب نہ ہو سکے۔ مذکورہ عرصے کے دوران میں مَیں تن تنہا بغیر کسی ذاتی عملے کی مدد کے کام کرتا تھا، اس لیے مَیں ان متعدد مکاتیب کی نقول اپنے پاس نہ رکھ سکا جو مَیں دوسروں کو ارسال کرتا تھا۔ مَیں نے لاہور میں اقبال کے ترکے کے نگرانوں سے دریافت کرایا تو مجھے اطلاع ملی کہ میرے مکاتیب دستیاب نہیں ہو سکے۔ چنانچہ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مَیں ان مکاتیب کو اپنے جوابات کے بغیر ہی شائع کراؤں، کیونکہ میرے نزدیک یہ مکاتیب بے حد تاریخی اہمیت کے حامل ہیں، بالخصوص وہ مکاتیب جن میں مسلم ہند کے سیاسی مستقبل کے بارے میں ان کے خیالات کا واضح اور غیر مبہم اظہار ہے۔ ان کے خیالات پورے طور پر میرے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں، اور بالآخر مَیں ہند کے دستوری مسائل کے مطالعہ اور تجزیہ کے بعد انہی نتائج پر پہنچا، اور کچھ عرصہ بعد یہی خیالات ہند کے مسلمانوں کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار آل انڈیا مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی منظور کردہ قرارداد لاہور ہے جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔"

ایم۔ اے جناح
(۲۷ مارچ ۱۹۴۳ء)

مکاتیب اقبال

(انتہائی بہ صیغہ راز)

لاہور ۲۰ مارچ، ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح،

میرا خیال ہے کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا وہ خطبہ ملاحظہ فرما لیا ہو گا جو انہوں نے کُل ہند نیشنل کنونشن میں دیا اور اس میں اسلامیان ہند کے بارے میں جس حکمت عملی کا اعلان کیا گیا ہے اس کو بھی آپ نے بخوبی محسوس کیا ہو گا۔ مجھے یقین ہے، آپ اس بات سے بھی آگاہ ہوں گے کہ نئے آئین نے ہند کے مسلمانوں کو کم از کم اس امر کا ایک نادر موقع ضرور دیا ہے کہ وہ ہند اور مسلم ایشیا میں رونما ہونے والے سیاسی حالات کے پیش نظر اپنی ملّی تنظیم کر سکیں۔ بلاشبہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند جماعتوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کرنے کو تیار ہیں، لیکن ہمیں اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں اسلام کی اخلاقی اور سیاسی طاقت کے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک خود ہند کے مسلمانوں کی مکمّل قوی تنظیم پر ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ کُل ہند نیشنل کنونشن کو ایک مُوثر جواب دینا بے حد ضروری ہے۔ آپ کو چاہیے کہ فوراً دہلی میں ایک کُل ہند مسلم کنونشن منعقد کریں جس میں شرکت کے لئے نئی صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کے علاوہ دیگر بڑے بڑے مسلمان رہنماؤں کو بھی مدعو کریں۔ اس کنونشن میں آپ پوری صفائی اور تحدی کے ساتھ یہ حقیقت بیان کریں کہ ہند کے مسلمان ایک جُداگانہ سیاسی ہستی کے مالک ہیں اور اس حیثیت سے ان کا سیاسی مطمح نظر کیا ہے؟ یہ امر ازحد ضروری ہے کہ اندرون ہند و بیرون ہند کی تمام دنیا کو بتا دیا جائے کہ ملک میں محض اقتصادی مسئلہ تنہا ایک مسئلہ نہیں ہے بلکہ مسلم نقطہ نگاہ سے اسلامیان ہند کے لئے ثقافت اور کلچر کا مسئلہ اپنے اندر زیادہ اہم نتائج رکھتا ہے۔ بہرکیف، کلچر کا مسئلہ کسی طرح سے بھی اقتصادی مسئلے سے کم اہم نہیں ہے۔

اگر آپ نے اس قسم کی کنونشن منعقد کی تو اس کا ایک فائدہ یہ ہو گا کہ اس

طرح اُن مسلمان ممبروں کی نیتوں کا بھی امتحان ہو جائے گا جنہوں نے مسلمانان ہند کے اغراض و مقاصد کے خلاف اپنی الگ الگ جماعتیں قائم کر رکھی ہیں، اور دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ ہندوؤں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ باریک سے باریک سیاسی چال بھی مسلمانوں کو فریب نہیں دے سکتی اور وہ اپنی جداگانہ تمدنی ہستی کو کسی طور پر بھی نظرانداز نہیں کر سکتے۔

مَیں چند روز تک دہلی آرہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس اہم مسئلے پر آپ سے بات چیت ہو گی۔ میرا قیام افغان قونصل خانے میں ہو گا۔ اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں تو وہیں ہماری ملاقات ہو گی۔ ازرہ مہربانی، اس مکتوب کے جواب میں چند سطریں ممکن طور پر جلد از جلد تحریر فرمائیں۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال، بارایٹ لا

مگر اس وقت مسٹر جناح دہلی سے دُور اس مشن پر نکلے ہوئے تھے کہ یو۔ پی کے مسلم ارکان اسمبلی کو مسلم لیگ کے پرچم تلے متحد کریں۔ اس لیے وہ متذکرہ بالا مکتوب کا جواب نہ دے سکے۔ اقبال نے دہلی سے واپس لاہور پہنچ دوبارہ انہیں مندرجہ ذیل مکتوب لکھا:

لاہور، ۲۲ اپریل ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح

دو ہفتے ہوئے مَیں نے آپ کو جو مکتوب لکھا تھا معلوم نہیں وہ آپ تک پہنچا یا نہیں پہنچا۔ مَیں نے وہ مکتوب آپ کے دہلی کے پتے پر ارسال کیا تھا اور جب بعد میں مَیں دہلی پہنچا تو مجھے معلوم ہوا کہ آپ وہاں سے پہلے ہی رخصت ہو چکے تھے۔ مَیں نے اس مکتوب میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں فوراً ایک کل ہند مسلم کنونشن دہلی یا کسی اور مقام پر منعقد کر کے حکومت اور ہندوؤں کو ایک بار پھر مسلمانان ہند کی پالیسی سے آگاہ کر دینا چاہیے۔

چونکہ صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے اور پنجاب کے مسلمانوں کا رجحان بعض ایسے وجوہ کی بنا پر جن کی تفصیل میں جانا اس وقت غیر ضروری ہے، کانگرس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس معاملے پر جتنی جلد ممکن ہو سکے، غور فرما کر فیصلہ کریں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس اگست تک ملتوی ہو چکا ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا ہے کہ فوری طور پر مسلم پالیسی کا اعلان مکرر ہو۔ اگر کنونشن کے انعقاد سے پہلے مقتدر مسلمان رہنماؤں کا ایک دورہ بھی ہو جائے تو کنونشن بہت کامیاب رہے گا۔ براہ کرم اس مکتوب کا جواب اپنی اولین فرصت میں عنایت فرمایئے۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال، بارایٹ لاء

اور پھر اس نازک مسئلے پر خط و کتابت شروع ہو گئی: اقبال کے مندرجہ ذیل مکتوبات دیکھیے:

لاہور، ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح،

آپ کے نوازش نامے کا ازحد شکریہ، جو مجھے اس اثنا میں ملا۔ مجھے یہ جان کر بیحد خوشی ہوئی کہ مسلم لیگ کے دستور اور پروگرام میں جن تبدیلیوں کے بارے میں مَیں نے تحریر کیا تھا وہ آپ کے پیش نظر رہیں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانان ہند کی نازک صورت حال کا آپ کو پورا پورا احساس ہے۔ مسلم لیگ کو آخر کار یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ وہ ہندی مسلمانوں کے بالائی طبقوں کی ایک جماعت بنی رہے گی یا مسلم جمہور کی، جنہوں نے اب تک بعض معقول وجوہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ میرا ذاتی خیال یہی ہے کہ کوئی سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی حالت سدھارنے کی ضامن نہ ہو، ہمارے عوام کے لئے باعث کشش نہیں ہو سکتی۔

نئے دستور کے تحت اعلیٰ ملازمتیں تو بالائی طبقوں کے بچوں کے لئے مختص ہیں اور ادنیٰ ملازمتیں وزراء کے اعزا اور احباب کی نذر ہو جاتی ہیں۔ دیگر امور میں بھی

ہمارے سیاسی اداروں نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی طرف کبھی غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز نازک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو صد سال سے وہ برابر تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس غربت کی وجہ ہندو کی ساہوکاری یا سرمایہ داری ہے۔ یہ احساس کہ اس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی شریک ہے، ابھی پوری طرح نہیں اُبھرا، لیکن آخر کو ایسا ہو کر رہے گا۔ جواہر لال نہرو کی بے دین اشتراکیت مسلمانوں میں کوئی تاثر پیدا نہ کر سکے گی۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت کا علاج کیا ہے؟ مسلم لیگ کا سارا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا کوشش کرتی ہے۔ اگر اس امر میں مسلم لیگ نے کوئی وعدہ نہ کیا تو مجھے یقین ہے کہ مسلم عوام پہلے کی طرح اس سے بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون (شریعت) کے نفاذ میں اس کا حل ہے، اور موجودہ نظریات کی روشنی میں اس میں ترقی کا امکان ہے۔

اسلامی قانون کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد مَیں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو ہر شخص کے لئے کم از کم حق معاش محفوظ ہو جاتا ہے۔ لیکن شریعت اسلام کا نفاذ اور ارتقا ایک آزاد مسلم ریاست یا ریاستوں کے بغیر اس ملک میں ناممکن ہے۔ سالہا سال سے یہی میرا عقیدہ رہا ہے اور اب بھی مجھے یقین ہے کہ مسلمانوں کی غربت اور روٹی کا مسئلہ اور ہند میں امن و امان کا قیام اسی سے حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہند میں یہ ممکن نہیں ہے تو پھر دوسری متبادل صورت صرف خانہ جنگی ہے جو فی الحقیقت ہندو مسلم فسادات کی شکل میں کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہند میں فلسطین کی داستان دُہرائی جائے گی۔ جواہر لال نہرو کی اشتراکیت کا ہندوؤں کی ہیئت سیاسیہ کے ساتھ پیوند بھی خود ہندوؤں کے آپس میں خون خرابے کا باعث ہو گا۔ اشتراکی جمہوریت اور برہمنیت کے درمیان وجہ نزاع برہمنیت اور بدھ مت کے مابین وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے۔ آیا اشتراکیت کا حشر ہند میں بدھ مت کا سا ہو گا یا نہیں؟ مَیں اس بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا، لیکن میرے ذہن میں یہ بات صاف ہے کہ اگر ہندو دھرم اشتراکی جمہوریت اختیار کر لیتا ہے تو خود ہندو دھرم ختم ہو جاتا ہے۔

اسلام کے لئے اشتراکی جمہوریت کو مناسب تبدیلیوں اور اسلام کے اصول شریعت کے ساتھ اختیار کر لینا کوئی انقلاب نہیں بلکہ اسلام کی حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع ہو گا۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لئے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے اوپر بیان کیا ہے، مسلم ہند کے ان مسائل کا حل آسان طور پر کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو ایک یا زیادہ مسلم ریاستوں میں تقسیم کیا جائے، جہاں پر مسلمانوں کی واضح اکثریت ہو۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبے کا وقت نہیں آ پہنچا؟ شاید جواہر لال کی بے دین اشتراکیت کا آپ کے پاس یہ ایک بہترین جواب ہے۔

بہرحال، مَیں نے اپنے خیالات پیش کر دیئے ہیں، اس امید پر کہ آپ اپنے خطبہ یا مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں ان پر سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔ مسلم ہند کو امید ہے کہ اس نازک دور میں آپ کی فراست موجودہ مشکلات کا کوئی حل تجویز کر سکے گی۔

آپ کا مخلص،
محمد اقبال

پس نوشت : میرا خیال تھا کہ اس مکتوب کے موضوع پر آپ کے نام اخبارات میں ایک کھلا خط شائع کراؤں، مگر مزید سوچ بچار کے بعد مَیں نے محسوس کیا کہ اس مرحلے پر ایسا اقدام مناسب نہیں۔

(نجی، بصیغہ راز)

لاہور، ۲۱ جون ۱۹۳۷ء

مائی ڈیر مسٹر جناح!

آپ کے مکتوب کا بہت بہت شکریہ جو مجھے کل موصول ہوا۔ مَیں جانتا ہوں آپ بہت مصروف آدمی ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ میرے بار بار مکتوب لکھنے کو آپ بار خاطر خیال نہیں کریں گے، کیونکہ آج ہندوستان بھر میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلم رہنما ہیں جن کی ذات گرامی سے قوم اس طوفان میں محفوظ رہنمائی کا حق رکھتی ہے جو اس وقت شمال مغربی ہند اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے۔ مَیں

عرض کرتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت ہی میں ہیں۔ اگر فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ خانہ جنگی دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔ گذشتہ چند ماہ کے دوران ہند میں ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہند میں گذشتہ تین ماہ میں کم از کم تین فسادات ہو چکے ہیں اور کم از کم چار وارداتیں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسالت ؐ کی ہو چکی ہیں۔ ان چاروں مواقع پر رسول ؐ کی اہانت کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن مجید کو نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ مَیں نے تمام صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں اور نہ اقتصادی، بلکہ خالص سیاسی ہیں۔ یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کرنا ہے۔ نیا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلم وزارتیں کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتیں، بلکہ انہیں خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنا پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن پر وزارت کا انحصار ہے خوش رہ سکیں اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر جانبدار ہے۔ لہٰذا یہ واضح ہے کہ ہمارے پاس اس دستور کو رد کرنے کی خاص وجوہ موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کی خوشنودی کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظرانداز کر سکتے ہیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کامل طور پر ہندوؤں پر انحصار کرنے کے لئے مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ یہ دستور ہندی مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کیلئے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اقتصادی مسئلے کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں کے لئے بہت زیادہ جانکاہ بن چکا ہے۔

کیبنٹ مشن ایوارڈ ہند میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو صرف تسلیم کرتا ہے لیکن کسی قوم کے سیاسی وجود کا ایسا اعتراف جو اس کی اقتصادی پسماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو، اور نہ کر سکے، اس کے لئے بے سود ہے۔ کانگریس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری

سیاسی جماعت یعنی مہاسبھا نے، جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہند میں ایک متحدہ ہندو مسلم قوم کا وجود ناممکن ہے۔ ان حالات کے پیش نظر بدیہی حل یہ ہے کہ ہند میں قیام امن کے لئے ملک کی از سرنو تقسیم کی جائے جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور لسانی اشتراک پر ہو۔ بہت سے برطانوی مدبرین بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اور نئے دستور کے جلو میں جو ہندو مسلم فسادات چلے آ رہے ہیں وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں کہ ملک کی حقیقی صورتحال کیا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے روانہ ہونے سے قبل لارڈ لوتھیان نے مجھے کہا تھا کہ میری سکیم میں ہند کے مصائب کا واحد ممکن حل ہے لیکن اس پر عمل درآمد کے لئے ۲۵ سال درکار ہوں گے۔ پنجاب کے کچھ مسلمان شمال مغربی ہند میں مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور یہ تجویز تیزی سے مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہماری قوم ابھی اتنی زیادہ منظم نہیں ہوئی اور نہ ہی ان میں اتنا نظم و ضبط ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کا ابھی موزوں وقت بھی نہیں آیا، لیکن مَیں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو بالآخر اختیار کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں تو نئے دستور میں سارے ہند کو ایک ہی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بے کار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جداگانہ وفاق کا قیام اس طریق پر جس کا مَیں نے اوپر ذکر کیا ہے صرف واحد راستہ ہے جس سے ہند میں امن و امان قائم ہو گا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ و تسلط سے بچایا جا سکے گا۔ کیوں نہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے جنہیں ہند اور بیرون ہند کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظرانداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق کو اختیار کرنے میں ہے۔ اس لئے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہو گا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ لاہور میں وسط اکتوبر میں

جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں غور فرمائیں۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ سے دلچسپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا پیش خیمہ ہو گا۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال، بارایٹ لاء

لاہور، ۱۱ اگست ۱۹۳۷ء

مائی ڈیئر مسٹر جناح

واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ مسلم لیگ کو اپنی تمام تر سرگرمیاں شمال مغربی ہند کے مسلمانوں پر مرکوز کر دینی چاہئیں۔ مسلم لیگ کے دہلی دفتر نے مسٹر غلام رسول کو مطلع کیا ہے کہ مسلم لیگ کے اجلاس کی تاریخ تاحال طے نہیں ہوئی۔

اندریں حالات مجھے اندیشہ ہے کہ اگست اور ستمبر میں اجلاس نہیں ہو سکے گا۔ لہٰذا میں مکرّر درخواست کرتا ہوں کہ مسلم لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط میں لاہور میں منعقد کیا جائے۔ پنجاب میں مسلم لیگ کے لیے جوش و خروش برابر بڑھ رہا ہے اور مجھے قوی امید ہے کہ لاہور میں اس کا اجلاس مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام سے رابطہ استوار کرنے کے لئے ایک اہم ذریعہ ثابت ہو گا۔ براہ کرم! جواب میں چند سطریں لکھئے۔

آپ کا مخلص
محمد اقبال، بارایٹ لاء

مگر آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۳۷ء کے وسط میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اقبال نے ۷ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کے نام مکتوب لکھتے ہوئے کہا:

"ہم ایک پُر آشوب دور میں سے گزر رہے ہیں، اور ہندی مسلمان توقع کرتے ہیں کہ آپ کا صدارتی خطاب ان جملہ امور میں جن کا تعلق قوم کے مستقبل سے ہے، ان کی مکمل اور واضح تر رہنمائی کرے گا۔"

اور لکھنؤ کے اجلاس نے واقعی، جیساکہ اقبال چاہتے تھے، مسلم ہند کو ایک ولولہ تازہ دیا، اور سیاسی بیداری کے احساس نے قوم کو اتحاد و یک جہتی کی راہ پر ڈال کر کانگرس کی مزعومہ رابطہ مسلم عوام تحریک کا ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے بساط سیاست ہند کا نقشہ بدلنے لگا۔

اس مرحلے پر کانگرس کے جھوٹے اور بے بنیاد پروپیگنڈے کی یہ صورت بھی سامنے آئی، اور بعد میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی کہ اقبال اس موقع پر مسٹر جناح اور مسلم لیگ کا ساتھ چھوڑ گئے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کذب و افترا کے اس ڈھول کا پول اقبال ہی کے ایک مکتوب کے حوالے سے کھول دیا جائے جو انہوں نے کلکتہ کے مولانا راغب احسن کو ۲۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کو لکھا:

"ڈیئر راغب صاحب! السلام علیکم۔ مَیں ایک مختصر پیغام آپ کو بھیج چکا ہوں جو امید ہے مل گیا ہوگا۔ یہ خیال کرکے مجھے بہت تعجب ہوا کہ بنگال میں یہ خیال ہے کہ مجھے لیگ سے ہمدردی نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ مَیں لیگ کے ایک سالانہ اجلاس کا صدر رہ چکا ہوں اور اس وقت بھی پراونشل لیگ کا صدر ہوں۔ ہاں یہ افسوس ہے کہ طویل علالت اور نیز ضعف قلب اور ضعف بصارت کی وجہ سے حال کی تحریکوں میں کوئی عملی حصہ لینے سے محروم ہوں۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے یہی راہ عمل ممکن ہے کہ وہ مسٹر محمد علی جناح کی قیادت میں اپنی تنظیم کریں۔ مجھ کو ان کی دیانت پر کُلی اعتماد ہے۔ آپ مہربانی کرکے میری طرف سے اس خیال کی پُرزور تردید کریں کہ مجھے لیگ سے دلچسپی نہیں۔"

۱۹۳۸ء

یورپ کی فضا پر بیس برس بعد پھر آتش و آہن کی گنگور گھٹائیں چھا رہی تھیں اور دنیا بڑی تیزی سے ایک خوفناک طوفان کی زد میں آ رہی تھی۔ اقبال کی حیات فانی کا یہ آخری سال تھا۔ مشرق کے مفکر شاعر نے بڑے درد و غم کے ساتھ اس بھیانک منظر کو دیکھا اور مشرق و مغرب اور دنیائے انسانی کو سالِ نو کا پیغام دیتے ہوئے انہیں خواب غفلت سے جھنجوڑا۔ یہ پیغام یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن

لاہور سے نشر ہوا۔ اقبال نے اپنے نشری پیغام میں فرمایا :

"عصر حاضر کو اپنے علوم و فنون کی ترقی اور سائنس کی بیمثال ایجادات پر فخر و ناز ہے۔ بیشک اسے اس فخر و ناز کا استحقاق حاصل ہے۔ آج کل زمان و مکان کے فاصلے سمٹ رہے ہیں، اور انسان فطرت کے رازوں کو بے نقاب کرنے اور فطرت کی پوشیدہ طاقتوں کو اپنے تصرف میں لانے کے لیے حیران کُن کامیابی حاصل کر رہا ہے۔ لیکن ان تمام ایجادات و ترقیات کے باوجود امپریلزم کا غرور و تکبّر اور ظلم و استبداد جس نے اپنا چہرہ جمہوریت، نیشنلزم، کمیونزم، فاشزم اور خدا جانے کن کس پردے میں چھپایا ہوا ہے دنیائے ارضی میں ہر طرف روح حریت اور انسان کے شرف و عزت و وقار کو اپنے پاؤں تلے اس طرح روندا اور کچل ڈالا ہے کہ تاریخ انسانی کے تاریک ترین ایام میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ نام نہاد سیاسی مدبر جنہیں انسانوں کی قیادت اور حکومت سونپی گئی، وہ خونخواری اور ظلم و استبداد کے خوفناک دیو ثابت ہوئے۔ جن حکمرانوں کا یہ فرض تھا کہ وہ ان نظریات کی پاسداری کرتے، اعلیٰ انسانی قدروں کا تحفظ کرتے اور ان کی نشوونما کرکے انسانوں پر انسانوں کے ظلم و ستم کا سدباب کرتے، اور انسانیت کی اخلاقی اور ذہنی سطح کو بلند سے بلند تر کرتے، وہ اس کی بجائے اپنی ہوس جوع الارض اور امپریل مقبوضات کی خاطر لاکھوں انسانوں کا خون بہاتے اور کروڑوں انسانوں کو محض اس لیے غلام بناتے ہیں کہ صرف اپنے مخصوص گروہ کی حرص اور طمع کی پیاس بجھائیں۔ اور پھر بات یہیں ختم نہیں ہوتی، بلکہ کمزور اقوام کو غلام بنانے اور اپنی نو آبادیات بسانے کے بعد یہ ظالم ان کے دین و مذہب پر ڈاکا ڈالتے، ان کی ثقافتی روایات اور علم و ادب کو پامال کرتے ہیں، اور پھر یہ غاصب ان کے اندر تفرقات کے بیج بوتے ہیں تاکہ وہ آپس میں لڑیں اور ایک دوسرے کا خون بہائیں اور غلامی و محکومی کے خواب آور نشے میں اس طرح دُھت ہو جائیں کہ امپریلزم کی جونکیں بلاتکلف ان کا خون چُوستی رہیں۔

جب مَیں اس برس پر نگاہ ڈالتا ہوں جو گزر گیا، اور پھر جب میں دنیا پر نظر کرتا ہوں جو سال نو کی خوشیاں منانے میں مگن ہے تو عجب بھیانک منظر سامنے آتا ہے۔ دنیا بھر میں، یہ ابی سینیا ہو یا فلسطین، سپین ہو یا چین، انسانی آبادیوں پر ایک طرح کی

مصیبت چھائی ہوئی نظر آتی ہے، اور لاکھوں انسان بے رحمی سے بے دریغ مارے جا رہے ہیں۔ تباہی و بربادی کے مشینی آلات حرب، جنہیں سائنس نے ایجاد کیا، انسان کی ثقافتی و تمدنی فتوحات کے عظیم الشان نشانات کو تباہ و برباد کرتے چلے جا رہے ہیں۔ جو حکومتیں آگ اور خون کے اس ہولناک ڈرامے میں خود ملوث نہیں ہیں وہ کمزور اقوام کا لہو اقتصادی حربوں کے ذریعے چُوس رہی ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے قیامت کا دن اس کرۂ ارضی پر آگیا ہے جس میں ہر کوئی اپنی اپنی چمڑی بچانے کی فکر میں مبتلا ہو گیا ہے۔

کیا دنیا بھر کے اہل فکر و نظر گونگے بہرے ہو بیٹھے ہیں؟ کیا ان تمام علمی ترقیات اور تہذیب و تمدن کے ارتقا کا انجام قریب آگیا ہے؟ وہ پوچھتے ہیں باہمی نفرت و عداوت کے سبب کیا آدمی، آدمی کو تباہ و برباد کر دے گا؟ اور کیا اس کرۂ ارض پر انسانی بود و باش کو ناممکن بنا دیا جائے گا؟

یاد رکھیے، انسان اس دنیا میں صرف ایک دوسرے کو عزت و احترام کا مقام دے کر ہی باقی رہ سکتا ہے۔ ورنہ یہ دنیا خونخوار شکاری درندوں کا میدان حرب بن کر رہ جائے گی، تاوقتیکہ ساری دنیا کے اہل علم و فضل اپنی پوری تعلیمی سعی و کاوش سے انسانوں میں انسانوں کے لیے جذبۂ عزت و احترام پیدا نہیں کریں گے، بہتری کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ اسپین کے لوگ، ہرچند کہ وہ ایک ہی نسل، ایک ہی قوم، ایک ہی زبان، ایک ہی مذہب کے رشتے میں گندھے ہوئے ہیں، مگر وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں، اور اپنے ہی کلچر اور تہذیب و تمدن کو اپنے ہاتھوں سے برباد کر رہے ہیں، محض اپنے اقتصادی مسلک میں اختلاف کے سبب؟

اس ایک واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ قومی اتحاد بھی کچھ زیادہ دیرپا قوت نہیں رکھتا۔ صرف ایک ہی اتحاد قابل اعتماد ہے اور وہ اتحاد ہے، انسانی بھائی چارے کا اتحاد، جو رنگ، نسل، زبان، قومیت وغیرہ سے بالاتر ہے۔ جب تک یہ نام نہاد جمہوریت، یہ بدبخت نیشنلزم اور یہ کم ظرف امپریلزم برباد نہیں ہو جاتے، جب تک انسان اپنے عمل سے یہ ظاہر نہیں کر دیتے کہ ان کا یقین و ایمان یہ ہے کہ تمام دنیائے انسانی ایک خدا کا کنبہ ہے، اور جب تک رنگ، نسل، زبان اور جغرافیائی قومیتوں کا احساس تفاخر مکمل

طور پر ختم نہیں ہو جاتا وہ اس کرۂ ارض پر مطمئن ہو کر پُرمسرت زندگی بسر نہیں کر سکیں گے، اور حریت، مساوات اور اخوت (بھائی چارے) کے خوبصورت الفاظ اور دلفریب نظریات شرمندۂ معنی نہیں ہو سکیں گے۔

لہٰذا آیئے، نئے سال کا آغاز اس دعا کے ساتھ کریں کہ اے اللہ، رب العالمین! ان لوگوں کو جذبہ انسانیت سے سرفراز فرما جو اقتدار، قوت و حشمت کے مقام پر فائز ہیں، اور انہیں انسانیت پروری اور بنی نوع انسان کی بھلائی کا راستہ دکھا۔ آمین!"

اقبال کا سال نو کا یہ پیغام اُن کے اس شعر (جاوید نامہ) کی شرح و تفسیر ہے:

آدمیّت، احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی

لاہور میں مسلم برادر ہڈ کی طرف سے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو یوم اقبال منایا گیا۔ یہ اقبال کی زندگی میں دوسرا یوم اقبال تھا۔ اس موقع پر عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی اقبال کو اعزازی ڈی۔ لٹ کی پیشکش کی۔ پروفیسر مظفر الدین کو مکتوب محررہ ۱۶ فروری ۱۹۳۸ء میں لکھتے ہیں:

"عثمانیہ یونیورسٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ مجھ کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کی جائے۔ اس فیصلے کے لیے میں صدر اعظم صاحب اور نواب مہدی یارجنگ بہادر کا شکرگزار ہوں۔ نواب مہدی یارجنگ صاحب نے لکھا تھا کہ حیدر آباد آیئے، آپ کی آسائش کا پورا انتظام کیا جائے گا۔ مگر افسوس ہے کہ صحت اجازت نہیں دیتی۔ حیدری صاحب نے مجھ پر ایک مزید عنایت کی، اور وہ یہ کہ اقبال ڈے کے موقع پر حضور نظام کے توشہ خانے سے بھی ایک ہزار روپیہ عطا فرمایا، مگر افسوس کہ مَیں اس عطیے کو قبول نہ کرسکا۔"

اقبال مغرب کے سیاسی نظریئے علاقائی قومیت (Territorial Nationalism) کے ۱۹۰۷ء سے شدید نقاد تھے، جب انہوں نے اس کی نامعقولیت کا احساس کیا تھا۔ اس کے بعد مسلم برادر ہڈ یا قومیت کا عالمی تصور ان کے افکار کا مرکزی نقطہ بن گیا۔ محمد طالوت کے نام مکتوب محررہ ۱۸ فروری ۱۹۳۸ء میں لکھتے ہیں:

"مَیں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلامی قومیت اور ملّت کے اسلامی نقطہ نظر کی تشریح و توضیح میں گزارا ہے، محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصوصاً اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسوس ہوتا ہے۔"

انہی دنوں جب دیوبند کے ایک مذہبی فاضل نے انڈین نیشنل کانگرس کے موقف انڈین نیشلزم کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" اور ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کو متحدہ قومیت کا مشورہ دیا، تو اقبال کو ایک عالم دین کی زبان سے یہ باتیں سُن کر ازحد تکلیف ہوئی اور انہوں نے اس کرب کے عالم میں یہ اشعار کہے:

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود برسرِ منبر کہ ملّت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمدؐ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

جس پر دیوبند کے ایک حلقے کی طرف سے سب و شتم کا طوفان برپا ہوا۔ اخباری مباحثے اور مجادلے بھی ہوئے۔ باوجود اپنی سخت علالت کے، اقبال نے قومیت کے جدید مغربی تصور اور اسلامی نقطۂ نظر کے بارے میں روزنامہ "احسان" میں مضامین لکھے (جغرافیائی حدود اور مسلمان) آخر بعض معاملہ فہم احباب کے توسط سے یہ قضیہ یوں ختم ہوا کہ مولانا نے یہ عذر خواہی کی کہ انہوں نے اپنی تقریر میں بطور خبر یہ بات کہی تھی کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں"، مشورہ نہیں دیا تھا۔ اس پر اقبال نے اس امر کا اعلان کیا کہ:

"مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا۔ مَیں مولانا کے ان عقیدت مندوں کے جوش عقیدت کی قدر کرتا ہوں جنہوں نے ایک دینی امر کی توضیح کے سایہ میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں۔ خدا تعالیٰ اُن کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے۔ نیز اُن کو یقین

دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں، مَیں اُن کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں۔" (انوار اقبال، صفحہ ۱۷۰)

مسلسل علالت بھی اپنا کام کر رہی تھی۔ معمولات زندگی بھی جاری تھے۔ شام کی محفل عام بھی حسب معمول آراستہ ہوتی رہی، خطوں کے جواب بھی لکھوائے جاتے رہے، قومی مسائل پر غور و فکر بھی جاری رہا، اور تخلیق شعر بھی ہوتی رہی — بقول سید نذیر نیازی : "حضرت علامہ ایک زندہ انسان تھے اور ان کا فکری ارتقا تادم مرگ جاری رہا۔"

سید غلام میراں شاہ سفر حج سے واپس آئے تو اُن کو ۲۹ مارچ ۱۹۳۸ء کے مکتوب میں اقبال لکھتے ہیں :

" — اور دعا کرتا ہوں کہ خدا تعالیٰ آپ کو اس امر کی توفیق دے کہ آپ اپنی قوت، ہمت، اثر، رسوخ اور دولت و عظمت کو حقائق اسلام کی نشرو اشاعت میں صرف کریں۔ اس تاریک زمانے میں حضور رسالت مآب صلعم کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ جلد آپ کی طبیعت میں ایک بہت بڑا انقلاب پیدا ہو جس کی ابھی تک آپ کو توقع نہیں۔ افسوس ہے کہ شمال مغربی ہندوستان میں جن بزرگوں نے علم اسلام بلند کیا، ان کی اولادیں دنیوی جاہ و منصب کے پیچھے پڑ کر تباہ ہوگئیں، اور آج ان سے زیادہ جاہل کوئی مسلمان مشکل سے ملے گا، الا ماشاء اللہ۔ وقت تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ انہیں بزرگوں کی اولاد سے کسی کی روحانیت کو بیدار کر دے اور کلمہ اسلام کے اعلاء پر مامور کرے۔ باقی خدا کے فضل سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ مَیں آپ کے جانے سے چند روز بعد بہت بیمار ہوگیا۔ یہاں تک کہ زندگی سے مایوسی تھی۔ دمے کے متواتر دورے ہوئے۔ اب تک یہ سلسلہ جاری ہے، گو دمے میں کچھ افاقہ ہوگیا ہے۔"

وقت رحلت قریب آ رہا تھا، مگر صبر و شکر کا یہ پیکر مجسم، اقبال، شدائد مرض کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کرتے ہوئے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے لیے زندگی کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ "شدید تکلیف کے باوجود اسی طرح محفلیں جمتیں اور وہ بستر پر لیٹے لیٹے ہر طرح کے مسائل پر اظہار خیال فرماتے۔" وفات سے چند روز پیشتر بڑے بھائی (شیخ

عطا محمد سیالکوٹ سے ان کی عیادت کے لیے آئے اور اُنہیں دلاسا دیا تو فرمایا:
"بھائی صاحب! مَیں موت سے نہیں ڈرتا۔ انشاء اللہ مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کروں گا۔" اور پھر اپنا یہ شعر پڑھا:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم برلبِ اوست

۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کو ضرار احمد کاظمی کے نام مکتوب لکھوایا:
"میری طبیعت پہلے سے اچھی ہے، مگر حالت روز بروز ابتر نظر آتی ہے۔ بوجہ کمزوری کے دوسرے صاحب سے خط لکھوا رہا ہوں۔"

بھوپال میں ممنون حسن خاں کو ۱۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ مکتوب لکھوایا:
"ڈیئر ممنون، آپ کا خط کئی روز ہوئے ملا تھا۔ افسوس کہ شدید علالت کی وجہ سے مَیں جواب نہ لکھوا سکا۔ دمے کے متواتر دوروں نے مجھے زندگی سے تقریباً مایوس کر دیا تھا۔ مگر اب خدا کے فضل سے کچھ افاقہ ہے۔ گو کُلی طور پر ابھی صحت نہیں ہوئی۔ آنکھوں کا آپریشن مارچ میں ہونے والا تھا، مگر دمے کی وجہ سے اسے ملتوی کرنا پڑا۔ اب بشرط زندگی، انشاء اللہ ستمبر میں ہو گا۔"

اور ۲۱ اپریل کو علی الصباح تقریباً سوا پانچ بجے صبر و شکر، فقر و استغنا کا یہ پیکر راہی عالم بقا ہو گیا!

کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال و الاکرام

اس صدی کا سب سے بڑا عاشق رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، حرم پاک کی زیارت، اور اپنے محبوبؐ کے روضہ اطہر پر حاضری کی آرزو اپنے دل ہی میں لیے اپنے خالق حقیقی کے حضور پہنچ گیا! اناللہ وانا الیہ راجعون۔

لیکن اپنی ملّت اور اپنے محبوبؐ کی امت کے لیے "ارمغان حجاز" چھوڑ گیا جو اسی سال کے آخر میں شائع ہوئی۔ یہ رباعی اسی ارمغان میں شامل ہے:

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید؟
نسیمے از حجاز آید کہ ناید؟
سر آمد روزگار این فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید؟

اشاریہ (شخصیات)

آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم : ۲۲، ۲۴، ۳۱، ۵۳، ۵۵، ۷۲، ۸۳، ۸۷، ۹۲، ۹۶، ۹۷، ۱۰۶، ۱۱۵، ۱۱۸، ۱۲۹، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۴۶، ۱۶۲، ۱۶۶، ۱۹۵، ۱۹۸، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۳۷، ۲۳۹

آرنلڈ، طامس : ۱۴، ۲۰، ۲۹، ۳۳

آزاد، ابوالکلام : ۸۵، ۸۷، ۸۸، ۹۰، ۹۱، ۹۵، ۱۰۵، ۱۱۶، ۲۱۱

آسن، پروفیسر : ۱۸۲، ۱۸۳

آغا حیدر، جسٹس : ۱۷۵

آغا خاں، سر سلطان احمد : ۱۳۳، ۲۰۰

آفتاب اقبال : ۱۳

ابن تیمیہ، امام : ۱۱۴

ابن رشد : ۱۱۴

ابن عربی : ۱۰۴

ابو حنیفہ، امام : ۱۲۱

ابو یوسف : ۱۹۵

اجل سنگھ، سردار : ۱۷۵

اجمل خاں حکیم : ۶۳، ۱۰۵

احسن مارہروی : ۱۵

احمد الدین، خواجہ : ۱۱۹

احمد سرہندی : ۷۱، ۸۴، ۱۰۴

احمد شاہ ابدالی : ۱۶۴، ۱۹۰

ارشد گورگانی : ۱۴

اردن، لارڈ : ۱۵۴، ۱۵۷

اسلم جیراجپوری : ۷۳، ۸۸

اسماعیل، حاجی : ۱۳۶

اسماعیل شہید، مولانا : ۷۱

اشعری، امام : ۱۱۴

اعجاز احمد، شیخ : ۲۱۴

افلاطون، حکیم : ۴۲، ۷۳

اقبال، علامہ، شیخ محمد : تقریباً ہر صفحے پر

اکبر الہ آبادی، لسان العصر : ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۷۳،

۸۵، ۸۶، ۸۸
اکبر، بادشاہ: ۴۶، ۴۷، ۱۴۷
اکبر حیدری: ۴۸، ۷۹، ۸۴، ۲۱۵، ۲۳۶
اکبر منیر، محمد: ۹۳، ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۱۸
اکرام، ایس- ایم: ۱۸۴، ۱۸۵
الف- دین، مولوی: ۸۰
الیاس برنی: ۲۰۷
انگزانڈر پروفیسر: ۹۹
امان اللہ خان، شاہ: ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۶۵
امیر علی، سید: ۳۴
امیر مینائی: ۱۵
امین الحسینی، مفتی اعظم: ۱۶۵
اورنگ زیب: دیکھیے عالمگیر اورنگ زیب
او ہلنڈ: ۸۹، ۹۰
ایمرسن: ۲۱، ۲۰۶
بابر، ظہیرالدین: ۴۷
بائرن: ۴۲
بھٹناگر، شانتی سروپ: ۱۷۵
بچہ سقہ: ۱۳۶
بدھ، گوتم: ۱۶۲
برکلے: ۱۸۲
برگساں، ہنری: ۱۸۱، ۱۸۲
بشیر حیدر، سید: ۱۹، ۲۵
بلالؓ: ۲۱
بوعلی قلندر: ۵۶
بہاء اللہ: ۱۲۱
بیدل، عبدالقادر: ۴۹
بیضاوی: ۱۱۴
بیک، مس: ۳۳
پیٹردی ہرمٹ: ۲۱۹
تاثیر، محمد دین، ڈاکٹر: ۱۳۰
تاج الدین، مولانا: ۱۰۵
تھامس، ایڈورڈ: ۱۸۱
تمکین کاظمی: ۵۶
تیمور: ۴۷
ٹالسٹائی، کونٹ: ۹۳
ٹیپو سلطان، شہید: ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۶۴
ٹینی سن: ۲۱
جاوید اقبال: ۱۱۷، ۱۶۱، ۱۶۴، ۱۸۴، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۱۳، ۲۱۳، ۲۱۴
جعفر، میر: ۱۶۳
جلال الدین مرزا: ۱۰۸
جمال الدین افغانی: ۱۶۳
جناح، محمد علی، قائداعظم: ۱۳۳، ۱۳۸، ۱۴۱، ۱۸۰، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۲، ۲۲۴ - ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۲، ۲۳۳
جمیل بنگلوری: ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۷، ۱۹۴
جہانگیر، بادشاہ: ۴۸
چیڑجی، پی- سی: ۱۸
حافظ شیرازی خواجہ: ۲۷، ۵۰، ۶۶، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۸۸
حالی، مولانا الطاف حسین: ۲۲، ۲۰۱
حریری: ۲۶
حسن الدین میر: ۳۴
حسن نظامی خواجہ: ۲۳، ۲۶، ۳۳، ۳۴،

۳۵، ۶۲، ۶۹، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶
حسین احمد مدنی، مولانا: ۲۳۷
حسین، حضرت امامؓ: ۸۰
حشمت علی، مولوی: ۱۲۰
حلاج، منصور: ۷۴، ۱۶۳
حلیمی پاشا: ۱۵۹
حمید اللہ خان، نواب سر: ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۱۱
خالد نظیر، صوفی: ۱۱، ۱۲
خالدہ ادیب خانم: ۱۹۶
خلیلؑ (حضرت ابراہیم): ۸۵
داراشکوہ: ۲۳
داغ دہلوی: ۱۳، ۱۵، ۲۲
داؤد: ۱۲۶
داؤدی، مولوی شفیع: ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۸
دین محمد، منشی: ۷۹
ڈالفس، ڈاکٹر: ۱۹۳
ڈکنسن، پروفیسر: ۹۹، ۱۰۱، ۱۰۲
ذاکر علی، سید: ۱۸۸
ذوالفقار علی خاں: ۱۳۸
ذوقی شاہ: ۷۲
رازی، امام: ۱۱۴
راس مسعود سید: ۱۳۷، ۱۸۰، ۱۸۹، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۳
راغب احسن، مولانا: ۱۵۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۵ - ۱۹۱، ۱۹۴، ۲۰۹، ۲۳۳
رام پرشاد، لالہ: ۶۴
رحمت علی، چوہدری: ۱۸۸
رشید احمد صدیقی: ۲۱۴
رو.سن، پروفیسر: ۴۳
روسو: ۱۴۳، ۱۵۱
رؤف پاشا: ۱۵۹، ۱۸۴
رومی، جلال الدین، مولانا: ۵۶، ۱۱۴، ۱۴۰، ۱۶۲
ریتان، پروفیسر: ۱۰۱، ۱۴۷
زرتشت: ۱۶۲
زمخشری: ۱۱۴
زہرہ: ۱۸۳
زین العابدین امام: ۱۷۹
ژان ماریک: ۱۱
سارلے، ڈاکٹر: ۲۸
سالک، عبدالمجید: ۱۱، ۱۰۸
سانڈرس، ایل - پی، پروفیسر: ۴۳
سائمن، سرجان: ۱۳۲، ۱۳۸
سٹبس: ۱۶
سٹریٹن، ڈاکٹر: ۱۸، ۱۹
سراج الدین پال: ۷۳، ۷۸
سراج الدین، منشی: ۱۹، ۷۱
سری نواس شاستری: ۱۵۱
سعید حلیم پاشا: ۱۶۳
سعید الدین جعفری، محمد: ۱۰۸، ۱۱۳
سعید شامل: ۱۵۹
سکندر اعظم: ۴۶
سلطان احمد، مرزا: ۱۷۰
سلیمان پھلواری، شاہ: ۲۶، ۷۳
سلیمان ندوی، مولانا سید: ۸۰، ۸۳، ۸۵، ۸۷، ۸۹، ۹۰، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۱۶، ۱۲۱، ۱۲۲

۱۲۳، ۱۲۶، ۱۳۲، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۸۹، ۱۹۰،
۱۹۴، ۲۰۱، ۲۱۰
سنائی، حکیم : ۱۹۰
سید احمد خان، سر : ۱۳۳، ۲۰۸
سیواجی : ۴۷
شاد، کشن پرشاد، سر : ۶۱، ۶۳، ۶۴ - ۷۰،
۷۴، ۷۶، ۷۷، ۷۹ - ۸۱، ۸۵، ۸۸، ۹۱،
۱۰۵، ۱۱۱
شامل - شاطر مدراسی : ۳۴، ۳۵
شامل، امام : ۱۵۹
شبلی نعمانی، مولانا محمد : ۸۵، ۱۲۱
شرف النساء بیگم : ۱۶۴
شریف، ایم - ایم، پروفیسر : ۱۹۶
شفیع، پروفیسر محمد : ۹۸
شفیع، سر محمد : ۱۳۲، ۱۳۳
شکور احسن، پروفیسر، ڈاکٹر : ۵۸
شمس الدین حسن : ۱۱۱
شوکت علی، مولانا : ۶۸، ۹۳، ۱۰۵
شیکسپیر، ولیم : ۴۹
شیلے : ۴۲
صادق، میر : ۱۶۳
صالح محمد، مولوی : ۱۳۹، ۱۵۸
صلاح الدین ایوبی، سلطان : ۲۱۹
صلاح الدین سلجوقی، سردار : ۱۹۹
ضرار احمد کاظمی : ۲۳۹
ضیابک گوکالپ : ۱۲۲
ضیاء الدین طباطبائی : ۱۵۹
طالوت، محمد : ۲۳۶
طاہرالدین، منشی : ۲۱۰
ظاہر شاہ، محمد : ۱۹۹
ظفر علی خاں : ۴۷، ۵۴، ۸۴، ۲۰۵
عالمگیر، اورنگ زیب : ۴۳ - ۴۸، ۷۱،
۷۴
عبداللہ چغتائی : ۱۶۴، ۲۱۴
عبداللہ العمادی : ۷۳
عبداللہ ماموں سہروردی : ۳۰
عبدالحق، مولوی : ۸۴، ۲۱۰
عبدالرحمٰن اول : ۱۸۳
عبدالرحمٰن بجنوری : ۸۶
عبدالصمد خان : ۱۶۴
عبدالعزیز : ۹۰
عبدالعزیز ابن سعود، سلطان : ۱۱۷
عبدالغفور : ۱۳۶
عبدالقادر جیلانی، شیخ : ۸۴
عبدالقادر، شیخ سر : ۱۶، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۶،
۲۹، ۳۰، ۳۱، ۳۳، ۳۶، ۴۰، ۶۹، ۱۱۶
عبدالکریم الجیلی : ۱۶، ۱۰۴
عبدالماجد دریابادی : ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۳۷، ۱۸۵
عبدالواحد، سید : ۱۱
عثمان : ۱۷۹
عثمان علی خان، میر : ۴۴، ۶۳، ۲۳۶
عراقی : ۱۰۴
عرشی امرتسری : ۹۲، ۱۹۷
عزیز لکھنوی، خواجہ : ۶۹
عطا محمد، شیخ : ۲۰، ۱۹۴، ۲۳۹
عطیہ، مس (فیضی) : ۳۳، ۳۸ - ۴۴،

۵۶، ۶۱
علی بخش : ۱۲۸، ۲۱۳
علی رزاق، شیخ : ۱۲۰
علی مرتضیٰؓ، حضرت : ۲۷
علی ہمدانی، سید : ۱۶۴
عمرؓ، حضرت : ۲۱۹
غالب، مرزا اسداللہ خاں : ۱۸، ۴۹، ۱۶۳
غزالی، امام : ۷۹، ۱۱۴
غلام حسین، مولوی : ۱۲
غلام رسول، بیرسٹر : ۲۳۲
غلام السیدین، خواجہ : ۲۱۲
غلام قادر فرخ : ۳۷
غلام مصطفیٰ تبسم : ۱۱۹
غلام میراں شاہ : ۲۳۸
فار قوہرسن، مارگریٹ : ۱۷۴، ۱۹۲، ۲۱۷
فاطمہ بنت عبداللہ : ۶۰، ۶۱
فرانسس ینگ ہسبینڈ، سر : ۱۷۴
فرعون : ۱۶۳
فضل حسین، میاں سر : ۵۴، ۱۷۸، ۲۰۹
فضل الدین احمد، مولوی : ۹۰، ۹۱
قرۃالعین طاہرہ : ۱۶۳
کانٹ، ایمونویل : ۲۹
کبیر، بھگت : ۱۴۷
کچنر : ۱۶۳
کرشن یاکشن : ۷۷
کفایت اللہ، مولوی : ۱۸۸
کلیم (حضرت موسیٰ) : ۸۵
کینز : ۱۰۲
گاندھی، مسٹر ایم۔ کے : ۸۸، ۹۱، ۹۲، ۱۰۷، ۱۵۷
گڈ نکس : ۴۷
گرامی، مولانا غلام قادر : ۶۵، ۶۹، ۷۹، ۸۰، ۸۲، ۹۲، ۹۳، ۱۰۶ - ۱۱۰، ۱۲۵
گلاب دین، شیخ : ۱۳
گلاب سنگھ منشی : ۶۴
گولڈ زہیر : ۱۳۸
گوئٹے : ۴۲، ۴۹، ۵۰، ۸۹، ۹۴، ۱۱۰، ۱۳۰
لانگ فیلو : ۲۱
لوتھر، مارٹن : ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۸۴
لوتھیان، لارڈ : ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۹۳، ۱۹۹، ۲۳۱
لوقا، ڈاکٹر : ۱۲۸، ۱۲۹
لیڈ (Ladd) : ۱۶
مارکس، کارل : ۱۱۱، ۱۶۳، ۲۱۲
مارسن تھیوڈور : ۶۴
مجدالف ثانی : دیکھیے احمد، شیخ
محبوب عالم، مولوی : ۱۷
محفوظ علی بدایونی : ۱۸۴
محمد اکبر شاہ نجیب آبادی : ۱۰۶
محمد امین : ۲۱۱
محمد دین فوق، مولوی : ۱۱
محمد دین، مولوی : ۱۴
محمد صدیق : ۲۱۱
محمد علی جوہر، مولانا : ۹۱، ۹۳، ۱۰۵
محمد علی، شہزادہ : ۲۱۷
محمود شبستری : ۱۲۵

محمود علی، پروفیسر: ۷۳
محمود غزنوی، سلطان: ۱۹۰
مسعود عالم ندوی: ۲۰۴، ۲۰۶
مسولینی: ۱۶۵، ۱۶۹، ۱۹۰، ۱۹۵
مسیح علیہ السلام حضرت: ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۶۲
مشیر حسین قدوائی: ۳۰
مظفرالدین، پروفیسر: ۲۳۶
معراج بی بی: ۱۳
ملٹن: ۱۴، ۱۹
ممتاز حسن، ڈاکٹر: ۱۲۶
ممنون حسن خان: ۲۳۹
منظر علی: ۱۱۳، ۱۱۵
منیرہ بانو: ۲۱۳، ۲۱۴
مہدی سوڈانی: ۱۶۳
مہدی یار جنگ، نواب: ۲۳۶
مہر علی شاہ: ۱۸۴
مہر، غلام رسول: ۳۲، ۱۵۹، ۱۶۵
میر حسن، سید: ۱۳
میک ٹیگرٹ: ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۱۷۴
میلکم ہیلی، سر: ۱۵۴
نابینا، حکیم: ۱۳۲، ۱۹۱
نادر خان، جنرل شاہ: ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۸۹
نادر شاہ: ۱۶۴
نذیر احمد، مولوی: ۱۷
نذیر نیازی، سید: ۱۵۸، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۸، ۲۰۲، ۲۳۸
نطشے: ۱۶، ۹۸، ۱۰۰
نظام الدین اولیا: ۲۳
نقشبند، خواجہ بہاء الدین: ۸۴
نکلسن، ڈاکٹر آر۔ اے: ۱۶، ۲۷، ۲۸، ۹۳، ۹۴، ۹۷، ۹۸، ۱۱۰، ۱۱۱
نمرود: ۸۱
نہرو، جواہر لال: ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۹، ۲۱۶، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۵، ۲۲۸
نیاز الدین خاں: ۷۴، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۳، ۸۴، ۸۷، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۴، ۱۰۶، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۳۲
نیاز علی، چوہدری: ۲۱۳
نیرنگ، غلام بھیک: ۱۴، ۲۳، ۱۰۸، ۱۳۲
واحد محمود: ۱۰۴
واکر: ۱۶
وائٹ برخٹ: ۱۷
وحید احمد: ۳۲، ۱۰۵
وحید الدین، فقیر سید: ۱۱، ۱۲۸
ورڈز ورتھ: ۴۹
وشوامتر: ۱۶۲
وقارالملک، نواب: ۶۲
وکٹوریہ، ملکہ: ۱۷
ولی اللہ، شاہ: ۷۹، ۹۶، ۱۱۴، ۱۹۵
ولیم روتھن سٹین، سر: ۱۸۲
ولیم کوپر: ۲۱
وینسنک، پروفیسر: ۱۴۴
ہٹلر، اوڈلف: ۱۹۰
ہمایوں، بادشاہ: ۲۳
ہوکنگ، پروفیسر: ۲۱۹
ہیلے، ڈاکٹر: ۸۶
ہیگل: ۲۹، ۴۹
یاٹ جیمز: ۴۳
یوسف علی: ۱۷۹

ماخذ

احمد الدین، مولوی	اقبال	کراچی ۱۹۷۹ء
افتخار احمد صدیقی، ڈاکٹر	شذرات فکر اقبال	لاہور ۱۹۷۳ء
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	علم الاقتصاد	کراچی ۱۹۶۱ء
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	کلیات فارسی	لاہور ۱۹۷۳ء
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	کلیات اردو	لاہور ۱۹۷۳ء
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	مکاتیب بنام نیاز الدین خاں	لاہور ۱۹۵۴، ۱۹۹۷
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	مکاتیب اقبال بنام شاد	لاہور ۱۹۸۶ء
اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد	مکاتیب اقبال بنام گرامی	کراچی ۱۹۶۴ء
بشیر احمد ڈار	انوار اقبال	کراچی ۱۹۶۷ء
جاوید اقبال، ڈاکٹر	زندہ رود	لاہور ۱۹۸۵ء
حسرت، چراغ حسن	اقبال نامہ	لاہور ۱۹۳۸ء
حمید احمد خاں، پروفیسر	اقبال، شخصیت اور شاعری	لاہور ۱۹۹۷ء
حنیف شاہد	اقبال اور انجمن حمایت اسلام	لاہور ۱۹۷۶ء
خالد نظیر صوفی	اقبال درون خانہ	لاہور ۱۹۸۳ء
رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر	خطوط اقبال	لاہور ۱۹۷۶ء
رفیق افضل، پروفیسر	گفتار اقبال	لاہور ۱۹۷۷ء
شاہین، رحیم بخش	اوراق گم گشتہ	لاہور ۱۹۷۵ء
طاہر فاروقی، پروفیسر	سیرت اقبال	لاہور ۱۹۶۶ء
ظفر علی خاں	ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر	لاہور ۱۹۹۴ء
عاشق حسین بٹالوی	اقبال کے آخری دو سال	کراچی ۱۹۷۱ء

عبدالسلام ندوی	اقبال کامل	اعظم گڑھ ۱۹۶۴ء
عبدالقادر، شیخ	نذر اقبال (مرتبہ حنیف شاہد)	لاہور ۱۹۷۲ء
عبدالقوی دسنوی	علامہ اقبال بھوپال میں	بھوپال ۱۹۶۷ء
عبدالمجید سالک	ذکر اقبال	لاہور ۱۹۵۵ء
عبدالواحد معینی، سید	مقالات اقبال	لاہور ۱۹۶۳ء
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر	روایات اقبال	لاہور ۱۹۷۷ء
عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر	اقبال کی صحبت میں	لاہور ۱۹۷۷ء
عبداللہ قریشی	حیات اقبال کی گم شدہ کڑیاں	لاہور ۱۹۸۲ء
عزیز احمد	اقبال، نئی تشکیل	لاہور ۱۹۶۸ء
عطا اللہ شیخ	اقبالنامہ (حصہ اول)	لاہور ۱۹۴۵ء
عطا اللہ شیخ	اقبالنامہ (حصہ دوم)	لاہور ۱۹۵۱ء
غلام دستگیر رشید	فکر اقبال	لاہور ۱۹۴۵ء
غلام دستگیر رشید	آثار اقبال	حیدر آباد (دکن) ۱۹۴۶ء
فرید الحق، محمد	اقبال۔ جہان دیگر	کراچی ۱۹۸۳ء
گوہر نوشاہی	مطالعہ اقبال (انتخاب اقبال)	لاہور ۱۹۷۱ء
محمود نظامی	ملفوظات اقبال	لاہور ۱۹۵۵ء
نذیر نیازی، سید	مکتوبات اقبال	کراچی ۱۹۵۷ء
نذیر نیازی، سید	اقبال کے حضور	کراچی ۱۹۷۱ء
وحید الدین، فقیر، سید	روز گار فقیر	کراچی ۱۹۶۳ء
یوسف حسین خاں	روح اقبال	لاہور

رسائل و مجلات: "اقبال" سہ ماہی (اردو، انگریزی) "اقبال ریویو" سہ ماہی (اردو، انگریزی) "معارف" ماہوار (متفرق شمارے)، مخزن، ماہوار (۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۰ء)، نیرنگ خیال (اقبال نمبر)، نقوش (اقبال نمبر) صحیفہ (اقبال نمبر)

صحائف: زمیندار (متفرق پرچے، ۱۹۱۱ء تا ۱۹۳۷ء) ستارہ صبح (متفرق پرچے ۱۹۱۶ء تا ۱۹۱۸ء) انقلاب (متفرق پرچے) احسان (متفرق پرچے) سول اینڈ ملٹری گزٹ (متفرق پرچے) پاکستان ٹائمز (متفرق پرچے)

Abdul Rahim, Kh. *Iqbal the Poet of Tomorrow,* Lahore, n.d.
Abdul Vahid, *Thoughts & Reflections of Iqbal*, Lahore, 1964.
Ahsan, A. Shakoor, Prof. Dr, *An appreciation of Iqbal's Thoughts & Art*, Lahore, 1985.
Atiya Begum, *Iqbal*, Lahore (reprint) 1969.
Bashir Ahmed Dar, *Letters & Writings of Iqbal*, Karachi, 1967.
Bashir Ahmed Dar, *Letters of Iqbal*, Lahore, 1978.
Bilgrami, H.H, Dr. *Glimpses of Iqbal's Mind & Thought*, Lahore, 1954.
Iqbal, Dr. Sh. Muhammad, *The Development of Metaphysics in Persia*, Lahore, 1964
- do - *The Muslim Community - A Sociological Study*, Lahore, 1994
- do - *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, Lahore, 1996.
Javid Iqbal, *Stray Reflections - A Note Book of Allama Iqbal*, Lahore, 1961.
Latif Ahmed Sherwani, *Speeches, Writings & Statements of Iqbal*, Lahore, 1977.
Muhammad Ashraf, Sh. *Letters of Iqbal to Jinnah*, Lahore, 1943.
Mumtaz Hasan, Dr. *Tribute to Iqbal*, Lahore, 1982.
Parveen Shaukat Ali, Dr. *The Political Philosophy of Iqbal*, Lahore, 1970
Riffat Hassan, Dr. *The Sword and the Sceptre,* Lahore, 1977.
Sayyidain, K.G, *Iqbal's Educational Philosophy*, Lahore, 1977.
Taseer, M.D, Dr. *Iqbal — The Universal Poet*, Lahore, 1992.
Wahid al-Din, Faqir, Sayyid. *Ruzgar-i-Faqir-I*, Lahore, 1964.
Waheed Qureshi, Dr. *Selections from the Iqbal Review*, Lahore 1983.
Zulfiqar Ali Khan, Sir. *A Voice from the East*, Lahore 1922.